سبدِ گل

(خاکے)

ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی

برادر زادہ حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی

اشاعتی تفصیلات

طبع اوّل : نومبر ۲۰۰۷

کمپوزنگ : عامر انصاری

تعداد : ۵۰۰

مطبع : پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی۔

ناشرز : رہبر پبلشرز



رہبر پبلشرز اُردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: ۲۶۲۸۴۸۴ – ۲۶۲۸۳۸۳، فیکس نمبر ۲۶۳۴۶۴۶

ترتیب

☆☆☆

سخنِ مختصر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصّلاۃ والسّلام علٰی سیّدالانبیاء والمرسلین وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔

عمر کا ایک حصّہ جب آدمی گزار لیتا ہے تو گذشتہ ایّام کی یادیں اسے گھیر لیتی ہیں، وہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے وہ تنہائی میں یادوں کے ہجوم میں کھو کر دنیا جہاں سے بیگانہ ہو جاتا ہے کبھی خود ہی ہنسنے لگتا ہے اور کبھی رونے لگتا ہے۔ ہم سِنوں کی پُرلطف صحبتوں کا خیال آ جاتا ہے تو اس کے پورے وجود میں لذت وسرور کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بزرگوں کا خیال جب اس کے ذہن کے پردے پر عکس فگن ہوتا ہے تو وہ یا تو اپنی نادانی اور ناسمجھی پر کفِ افسوس ملتا ہے کہ ان سے وہ کماحقہ فیض حاصل نہیں کر سکا یا پھر اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوتا ہے کہ اس کے دامن میں بھی کچھ قیمتی جواہر ہیں، حسنات کے ڈھیر میں سے کچھ ہی وہ چن سکا ہے۔ اب جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دوسروں تک منتقل کرنے کا عزم رکھتا ہے۔

میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ پاکیزہ فطرت، پاکیزہ طبیعت، اور پاکیزہ مزاج لوگوں کے درمیان رہا ہوں، ان کی صحبت مجھے میسّر آئی ہے۔ وہ مانند گل نودمیدہ رنگ ونور کا پیکر تھے، لطیف احساسات کا مجسّمہ تھے، خوشبو کے سوتے ان کی ذات سے پھوٹتے تھے، وہ طبیعت کی پاکیزگی ولطافت کو مہمیز کرنے والے تھے، فکروخیال کی تمام رعنائیوں اور حسن وجمال کی تمام دلکشیوں کو منظم ومرتّب کرنے والے تھے، چراغ علم کی لَو اُکسانے کا فن انھیں خوب آتا تھا، دنیا کے راہی اور آخرت کے مسافر کی رہنمائی کرنا خوب جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہی منصب نبوت ہے: كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ ۔ اسی کے لیے محنت کی ذمّے داری ان پر ڈالی گئی تھی جس کو انھوں نے اپنے علم وعمل اور کردار واخلاق سے پورا کیا۔

میں نے قدرت کی حسین تخلیق، خوش رنگ وخوش نما پھولوں کو گل دان میں سجا دیا ہے، قسم قسم کے پھول، جدا جدا رنگ، خوشبو الگ الگ، لیکن طبیعت میں لطافت و پاکیزگی کا عنصر سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ان کی خوشبو مشامِ جاں کو عطر آگیں احساس سے معطر رکھنے والی ہے۔ ان کا قرب طبیعت کے انقباض کو فرحت وانبساط میں تبدیل کر دیتا ہے ان کی صحبت میں قلب ایسا روشن و منور ہو جاتا ہے کہ ظلمت کے حصار میں آنے کا ہر خطرہ ٹل جاتا ہے۔ ذہن ایسے منظم و مربوط سانچے میں ڈھل جاتا ہے کہ زندگی کی طویل شاہراہ پر بعافیت گزرنا آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں کوشش کی کہ شخصیات کے صحیح خدوخال کو بیان کر دوں۔ سیدھے سادے لفظوں میں قلم برداشتہ منتشر خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ اس میں کوشش و کاوش یا محنت و مشقت کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ زیادہ تر شخصیات اِس دارِفانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ چند ایک ہیں جو بحمداللہ حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ مقصد یہ ہے کہ ان پاکیزہ شخصیات کے مطالعے سے کردار سازی میں مدد ملے گی۔ اُن پاکیزہ نفوس کا نقش میرے دل و دماغ پر بہت گہرا ہے کبھی ماند پڑھنے کا سوال ہی نہیں، دعا کرتا ہوں کہ قارئین کے قلب پر بھی ان کے حسنِ عمل اور کردار واخلاق کا ایسا اثر ہو کہ ان کی طبیعتوں میں انقلاب برپا ہو جائے اور وہ بھی انھیں خصوصیات کے حامل ہو جائیں:

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو!
تم نے فراقؔ سے باتیں کی ہیں، تم نے اس کو دیکھا ہے

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے موقع پر ان کے ہم جماعت مولانا محمد عبدالسمیع ندوی صاحب نے ان پر اپنے تأثرات لکھ کر ناچیز کو ارسال کر دیے تھے۔ میں نے یہ تحریر آخر میں شامل کر دی ہے۔

مؤرخہ: ۱۴؍اگست ۲۰۰۷ء

محمد عبدالمقیت شاکر علیمی

C/6، شعیب پلازا، بلاک نمبر: 1

گلشنِ اقبال، کراچی 75300

فون نمبر: 021-4960727

☆☆☆

حضرت شیخ حیدر حسن خان

(۱۹۴۲ء۔۱۸۶۴ء)

شیخ حیدر حسن خاں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پرنسپل اور شیخ الحدیث تھے۔ سترہ سال تک وہاں حدیث شریف کا درس دیتے رہے۔ یہ اتنا طویل عرصہ ہے کہ سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی ان کے شاگرد ہوئے ہیں ان میں بعض تو ایسے باصلاحیت بھی تھے جو افق علم پر اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ بڑے بڑے روشن و منوّر ستارے بھی ان کے آگے ماند پڑ گئے اور ان کی ضیا پاشیوں سے ایک عالم منور ہوا۔

میں نے شیخ صاحب کو نہیں دیکھا۔ شیخ صاحب میری ولادت سے ڈیڑھ سال پہلے ۳۱ رمئی ۱۹۴۲ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۶۱ھ کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے، مگر میں نے اپنے گھر میں اپنے بزرگوں سے اٹھتے بیٹھتے ان کا تذکرہ سنا ہے۔ ۳۴-۱۹۳۳ء میں محترم مولانا محمد عبد الرشید نعمانیؒ دو سال تک شیخ صاحب کی خدمت میں رہے اس کے بعد دو سال یا کچھ زیادہ عرصہ والد صاحب انھیں کے ساتھ رہے اس طرح دونوں حضرات نے شیخ صاحب کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ عبادت و ریاضت، درس و تدریس اور روزمرہ کے معمولات سب ہی سے یہ حضرات خوب واقف تھے۔ پھر شیخ صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا سعد حسن خاں اور ان کے گھرانے سے ہمارا خونی رشتے کا سا تعلق تھا۔ اس کے علاوہ میں لاڑکانے میں شیخ صاحب کے چھوٹے صاحب زادے قاری اسعد حسن خاں صاحب کے پاس رہا ہوں۔ قاری صاحب اور ان کی اہلیہ (جنھیں میں چچی بی کہتا ہوں) سے شیخ صاحب کے حالات و واقعات سنے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا میں بھی ان کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی اس چشمِ ظاہر بیں سے انھیں خوب دیکھا ہے۔ اسی حیثیت سے

یہاں ان کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

درمیانہ قد، سرخ وسپید رنگ، متناسب اعضا، بھری بھری سفید براق سی ڈاڑھی، بلمل کا کُرتا پہنے ایک بڑا رومال سر پر ڈالے ندوہ کے دارالحدیث میں بیٹھے درس میں مشغول ہیں۔ طلبہ اردگرد بیٹھے پڑھتے جاتے ہیں اور سوالات کرتے جاتے ہیں اور شیخ صاحب جواب پہ جواب دیے جاتے ہیں۔ پاس رکھی ہوئی موٹی موٹی کتابیں کھول کر تشفی کے لیے دکھاتے بھی جاتے ہیں۔ ان کا درس کیا ہوتا تھا ایک اچھا خاصا مناظرہ ہوتا تھا، کسی کو روک ٹوک نہیں تھی۔ جو چاہتا سوال کرتا تھا۔ ایک ایک حدیث پر بحث، رُوات پر جرح وتعدیل کا سلسلہ جاری رہتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو ایک صدی پہلے کا کوئی استاد پڑھا رہا ہے جس کا درس کیا ہوتا تھا بحث ومناظرے کا منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ شیخ صاحب نے مدرسہ نعمانیہ لاہور میں مولانا غلام احمد صاحب سے علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کیے تھے اور ان میں کامل دستگاہ پیدا کی تھی۔ مولانا غلام احمد، مفتی صدرالدّین آزردہ اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد تھے۔ شیخ صاحب کو بھی کچھ عرصہ مولانا لطف اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ ان کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ درس شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد سوال و جواب اور بحث ومناظرہ ہونے لگتا، استاد شاگرد گتھم گتھا نظر آنے لگتے۔ یہی طرز تدریس شیخ صاحب کو بھی پسند تھا۔ بلاشبہہ یہ طریقۂ تدریس ایسا ہے کہ اس سے طالبِ علم کا ذہن کھل جاتا ہے، ہر قسم کے شکوک وشبہات دُور ہو جاتے ہیں، تحقیق کا مذاق پیدا ہو جاتا ہے، ادب آداب کے دائرے میں رہ کر تنقید کا شعور اجاگر ہونے لگتا ہے۔ پھر استاد کی علمیت کا بھی پتا چل جاتا ہے، اس کے تحمل اور بردباری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ فی زمانہ یہ طریقہ بالکل ہی مفقود ہے۔ استاد بھی گھبراتا ہے اور شاگرد بھی، نہ استاد حاضر العلم اور نہ شاگرد ہی میں حصولِ علم کی تڑپ، دونوں اپنا اپنا بوجھ اتارنے میں مصروف ہیں، پھر شکوہ یہ کہ قحط الرجال ہے۔ ایں چہ بوالعجبی ست۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مصافحے والی حدیث کَفِّی بَیْنَ کَفَّیْہِ آئی۔ حضرت شیخ نے اپنے دونوں ہاتھ ایک طالبِ علم کے ہاتھ میں دے کر فرمایا، یہ مصافحے کی کیفیت ہے۔ ایک طالبِ علم کہنے لگا، میرا ایک ہاتھ

آپ کے دونوں ہاتھ، اس میں کوئی صیغہ ایسا نہیں جس سے، ہم سمجھ لیں کہ مصافحہ کرنے والے کے بھی دونوں ہاتھ ہوں۔ اب کیا تھا، رجال کی کتابیں کھل گئیں۔ سلف صالحین کا اس باب میں عمل دیکھا جارہا ہے، لیکن وہ طالبِ علم ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ شیخ صاحب کبیدہ خاطر گھر تشریف لے آئے، دوپہر کو قیلولے کے لیے لیٹ گئے، آنکھ لگ گئی، دیکھا کہ وہ گویا کوہِ صفا پر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں، قریب آئے تو شیخ نے مصافحہ کیا اس طرح کہ ان کے بھی دونوں ہاتھ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دونوں ہاتھ تھے۔ یہ تھی آپ کے درس کی کیفیت۔

شیخ صاحب کو وہی طالبِ علم زیادہ عزیز ہوتا تھا جو آزادانہ بحث کرتا اور مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ وہ کٹر حنفی المسلک تھے اور مذہبِ حنفی کے اثبات میں پے در پے احادیث بیان کرتے تھے اس میں انھیں بڑا کمال حاصل تھا۔ مشہور غیر مقلد حضرت مولانا نذیر حسین محدّث دہلوی کے درس میں وہ بیٹھے ہیں ان سے تلمذ بھی ہے، لیکن حنفی ہونے کے سبب وہاں ان کی طبیعت زیادہ نہیں لگی، بالآخر شیخ حسین ابن محسن انصاری خزرجی کی خدمت میں بھوپال پہنچے، کتبِ صحاح اور متداول کتبِ حدیث کی سند حاصل کی۔ وہ کٹر حنفی تھے، متعصب نہیں تھے۔ اسی لیے عامل بالحدیث بھی تھے۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ شیخ کو میں نے تہجد میں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا، بڑا تعجب ہوا۔ میں نے بعد میں پوچھا، آپ حنفی اور یہ رفع یدین؟ فرمایا، رفع یدین حدیث میں ہے اگر اللہ تعالیٰ روزِ قیامت مجھ سے سوال کریں تو پھر میرے پاس کیا جواب ہوگا۔ اس لیے گاہے گاہے اس سنّت پر بھی عمل کر لیتا ہوں۔ یہ احتیاط اور عمل بالحدیث کا یہ ذوق اب کہاں۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسّلام قدوائی ندوی، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی سب ہی نے شیخ صاحب کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ ان کی شخصیت کے معتبر ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ شاگردوں سے ان کا تعلّق، شفقت و محبت کا رویّہ اس دور میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ مولانا نعمانی اور والد صاحب سے جب بھی شیخ صاحب کا تذکرہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان

کے تذکرے پر تو والد صاحب کی آنکھیں نم ہو جاتیں، اٹھتے بیٹھے، چلتے پھرتے بس انھیں کا تذکرہ کرتے۔ ایک مرتبہ میں نظامی دواخانہ (ریگل صدر) حکیم نصیر ندوی صاحب کے پاس گیا وہاں شیخ صاحب کا تذکرہ بھی آ گیا بس ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلکنے لگے۔ میں نے کہا، تعجب ہے والد صاحب کو تو ان کے تذکرے پر چشم پرنم دیکھا ہے آپ بھی؟ فرمانے لگے، میاں وہ تھے ہی ایسے، باپ سے زیادہ شفیق و مہربان، ماں سے زیادہ محبت کرنے والے۔ جتنے لوگوں کو دیکھا، پڑھا اور سنا ان کی شفقت و محبت میں رطب اللسان ہی پایا۔ صائب:

ز فیضِ عشق دلہائے مخالف مہرباں گردد
ز آتش رشتہائے شمع باہم یک زباں گردد

اب کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں ایسے لوگ!

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھا ہے کہ وہ اور مولانا عبد السّلام قدوائی ندوی دار العلوم ندوہ میں اسٹرائیک کرانے کے سبب وہاں سے خارج کر دیے گئے تھے، ان کا بخاری کا دورہ باقی تھا۔ شیخ صاحب گرمیوں کی چھٹی میں اپنے وطن ٹونک نہیں گئے بلکہ لکھنؤ کی سخت ترین گرمی میں ہی رہ کر ان کو بخاری پڑھائی اور اپنے دستخط سے سند عطا کی۔ وہ شاگردوں سے بہت زیادہ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے اور ایسا تعلّق رکھتے تھے کہ ہر شاگرد یہی سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ شیخ صاحب کی توجہ اور کسی پر نہیں ہے۔

چچی بی کہتی تھیں کہ خالو میاں (شیخ صاحب) بڑے متواضع اور مہمان نواز تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم سے کہہ کر جاتے کہ دو تین آدمیوں کا کھانا زیادہ پکا لینا اور پانچ دس آدمی کھانے کے وقت ساتھ لے آتے۔ میں اکثر کہتی، خالو میاں! آپ بھی حد کرتے ہیں دو تین کا کہہ کر جاتے ہیں اور پانچ دس کو لے آتے ہیں۔ کھانا کم پڑے تو عورتوں کی بے عزّتی ہوتی ہے، آپ بتا کر جایا کریں۔ ہمیں پکانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس وقت تو وہ ہاں میں ہاں ملا لیتے پھر وہی حرکت کرتے، ہم ان کی اس حرکت سے بڑے تنگ تھے۔ مولانا محمد طلحہ حسنی اور محمد زبیر حسنی دونوں بھائی شیخ صاحب کے ابتدائی شاگردوں میں تھے۔ مولانا طلحہ، ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا، اورینٹل کالج لاہور میں عربی ادب کے پروفیسر تھے علم ان کا بڑا مستحضر

تھا۔ علّامہ اقبال اور دوسرے بہت سے لوگ ان سے اپنے اشکالات دور کرتے تھے۔ ایک روز شیخ صاحب نے چچی بی سے کہا، طلحہ اور زبیر آرہے ہیں، میں انھیں اسٹیشن لینے جارہا ہوں تم دو چار آدمیوں کا کھانا زیادہ پکالینا۔ چچی بی فرماتی تھیں کہ میں نے کہا، خالو میاں بتا کر جائیے۔ انھوں نے کہا، پانچ دس آدمیوں کا کھانا پکالینا۔ میں نے خالو میاں کی عادت کے پیش نظر پندرہ آدمیوں کا کھانا پکالیا جب وہ اسٹیشن سے طلحہ اور زبیر صاحب کو لے کر گھر آنے لگے تو راستے میں جو جاننے والا ملتا اس کو دعوت دیتے کہ آج کا کھانا ہمارے ہی ساتھ کھانا، اس طرح جب وہ گھر پہنچے تو پچاس ساٹھ آدمی تو ضرور ہی ہوں گے۔ میں نے خالو میاں کو بلایا اور خفگی کے انداز میں کہا، آپ نے پھر وہی کیا اب بتائیے اتنے لوگوں کا کھانا کس طرح پورا کروں گی۔ شیخ صاحب نے فرمایا، بیٹا گھبراؤ نہیں روٹی اور سالن یہاں پاس پاس رکھ دو۔ اس پر شیخ صاحب نے اپنا رومال ڈال دیا اور فرمایا، نکالتی جاؤ دیتی جاؤ اللہ چاہے گا تو سب پورا ہو جائے گا۔ چچی بی فرماتی تھیں، میں نے ایسا ہی کیا سب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور روٹی سالن پھر بھی بچ گیا۔

کرامت اپنی جگہ، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ استاد کا شاگردوں سے تعلق کیسا تھا، کیسی محبت تھی، اس انداز کو دیکھ کر فرطِ عقیدت سے آنسو کیوں نہ چھلک پڑیں۔ جلیل مانک پوری نے کیا خوب کہا ہے:

ساقیا! صحبتِ دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشمِ تر صورت پیمانہ چھلک جاتی ہے

آج کا دور بڑا ترقی یافتہ دور ہے، علوم وفنون میں نئے نئے شعبے اس کی نت نئی شاخیں دریافت ہوئی ہیں یہ تخصص (specialization) کا دور ہے کسی بھی علم یا فن کی کسی شاخ کا کوئی ماہر دوسرے علوم وفنون کا واجبی سا علم رکھتا ہے، لیکن پہلے دور میں علماء مختلف علوم فنون میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، شیخ صاحب بھی علومِ عقلیہ ونقلیہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے بڑی توجہ اور انہماک سے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، صرف ونحو کے ساتھ فلسفہ ومنطق، ہیئت وفلکیات اور علم ریاضی کی تحصیل کی تھی، اُصطرلاب اور کُرہ کا استعمال بھی انھوں نے

سیکھا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بیان ہے:

مولانا نے جب تمام علوم چھوڑ کر علم حدیث ہی کو اپنا وظیفہ اور موضوع بنالیا تھا اس وقت بھی علم ہیئت کے شائقین ان سے شرح چغمنی اور تصریح پڑھتے تھے اور اُصطرلاب و کُرہ کا استعمال سیکھتے تھے۔ مسائل نحو یہ کا استحضار آخر آخر تک رہا۔ شرحِ جامی اس وقت بھی مستحضر تھی۔

مولانا سعد حسن خاں صاحب کے پاس ایک اُصطرلاب تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ ابا کا ہے، ہم نے اس کا استعمال انھیں سے سیکھا ہے۔ اُصطرلاب ایک بڑی سی پیتل کی قُرص تھی جو ایک آرک (Ark) کے ساتھ اس طرح نصب تھی کہ بآسانی گھوم سکتی تھی۔ اس قُرص میں ایک دائرہ تھا جو صفر سے ۳۶۰ ڈگری تک منقسم تھا اور اس پر عربی رسم الخط میں مختلف حروف، خطوط اور ہندسے کندہ تھے، غالباً عرض البلد، طول البلد اور خط مستقیم پر مشتمل خطوط تھے، موسموں کی کیفیت، رات دن کے اوقات اور کرۂ ارض سے مختلف ستاروں، سیاروں تک فاصلے اس سے معلوم کیے جاتے تھے۔ مولانا میرے ذوق تجسس کو دیکھتے ہوئے اس کی تفصیلات بتانے لگے۔ بہرحال شیخ صاحب بھی پرانے علماء کی طرح تھے، جنھیں کئی کئی علوم میں یکساں مہارت حاصل ہوتی تھی۔

آج نقل و حمل کی اس قدرت آسانیاں ہیں کہ دنیا کے ہر خطے میں دِنوں میں نہیں گھنٹوں میں پہنچا جاسکتا ہے۔ طلبہ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کرتے ہیں، بڑے بڑے اہلِ کمال سے استفادہ کر کے علم وفن میں ممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ علم میں تو ممتاز ہو سکتے ہیں، مگر تقویٰ و پرہیز گاری ان میں نظر نہیں آتی۔ علم کی اساس تو تقویٰ ہے۔ تمام خیر، کُل حسنات اور ہر بھلائی تقوے کی روشنی سے ہی جلا پاتی ہے۔ محسوسات اور فکر وخیال کے سارے دھارے جب اس راستے سے گزرتے ہیں تو اپنے باطن میں روشنی اور نور کی کرنیں محسوس کرنے لگتے ہیں، پھر تمام خواہشاتِ نفسانی اور لذّت کے مؤیدات جاہ و حشمت، شہرت وعزّت، مال و دولت سب استغناء سے بدل جاتے ہیں اور روح کا رخ علو و رفعت کی جانب مائل پرواز ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نعمت سے ہمیں بھی سرفراز فرمائے۔

آج سے نصف صدی پہلے کے اہلِ کمال صاحب تقویٰ ہوا کرتے تھے۔ جس کسی کو دیکھو، جس کسی کے حالات کا مطالعہ کرو علم کے بہت بڑے منصب پر فائز ہونے کے ساتھ زہد و تقوی کے بھی حامل ہوتے تھے۔ کسی نہ کسی اہل اللہ سے نسبت و تعلق قائم کر لیتے تھے۔ اسی کے نتیجے میں عدل و انصاف، محبت و مؤدت، رحمت و رافت، ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور علم و عمل دونوں حیثیتوں میں وہ ممتاز ہوتا ہے۔ شیخ صاحب علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ اوّل تو وہ جن اساتذہ کی صحبت میں رہے وہ خود بڑے متقی و پرہیز گار بزرگ تھے اور 'صحبتِ صالح ترا صالح کند' کے مصداق ان کا رنگ چڑھتا گیا۔ پھر وہ جب حج بیت اللہ کی زیارت کے لیے مکۂ مکرمہ پہنچے تو وہاں شیخ وقت، سیّد الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں کامل ایک سال رہ کر سلوک کے مدارج طے کیے۔ حاجی صاحبؒ نے انھیں خلافت سے سرفراز فرمایا اور اپنے دستخط سے شجرہ بھی عنایت فرمایا (یہ شجرہ بحمداللہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے) اور نصیحت فرمائی کہ آپ درس و تدریس ہی سے شغف رکھنا۔ امراء و صاحبانِ منصب کی صحبت سے دور رہنا۔ اس نصیحت کا اثر تھا کہ وہ بیعت کرنے پر مائل نہیں ہوئے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، صرف چند شاگردوں ہی کو انھوں نے بیعت کیا ہے۔ رئیس احمد جعفری ندوی، عبدالسّلام قدوائی، عم محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، والدِ مکرّم مولانا محمد عبدالعلیم ندوی اور اپنے چھوٹے صاحب زادے قاری اسعد حسن خاں کو بیعت کیا۔ ان میں عمِ محترم، والد صاحب اور قاری صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

شیخ صاحب اپنے مرشد کی دوسری نصیحت پر بھی سختی سے کاربند رہے، کیسے ہی سخت حالات ہوئے اس پر عمل نہیں چھوڑا۔ ریاستوں میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں، نواب کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہوتا تھا، مگر وہ ریاست ٹونک میں رہتے ہوئے بھی کبھی نواب کے پاس نہیں گئے۔ ایک مرتبہ تو نواب، حضرت شیخ سے بدظن بھی ہو گئے تھے، مگر اس وقت بھی وہ اپنے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے اصرار پر بھی نواب سے ملنے نہیں گئے اور کئی سال ٹونک سے باہر رہنا گوارا کر لیا۔ اسی طرح وہ پیروں اور شیوخ سے بھی نہیں ملتے تھے۔

مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کے بانی مولانا عین القضاۃ صاحب المتوفیٰ ۱۹۲۵ء مولانا عبدالحئی

فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ بہت بڑے عالم تھے، لیکن تصوف کی طرف میلان زیادہ تھا۔ حاجی موسیٰ ترکیسری سے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت تھے جو ایک واسطے سے حضرت شاہ غلام علی مجددی کے خلیفہ تھے اور درس و تدریس سے زیادہ تزکیۂ باطن میں مشغول رہتے تھے۔ دور دور تک ان کی شہرت تھی۔ کہتے ہیں کہ انھیں دستِ غیب بھی حاصل تھا۔ تقریباً سات سَو آٹھ سو طلبہ کا دونوں وقت کا کھانا، کپڑے، جوتے اور دو روپے ماہوار جیب خرچ، مدرسین کی تنخواہیں، سال میں دو مرتبہ سارے شہر کی عام دعوت جس میں دو سَو دنبے ذبح کیے جاتے تھے اور زردہ پلاؤ ایسا ہوتا تھا کہ انگلیوں سے گھی ٹپکتا، اس کے علاوہ داد و دہش کا سلسلہ مسلسل رہتا، یہ کثیر مصارف عام آدمی کیا، بڑے بڑے اداروں اور نوابوں کے بس کے بھی نہیں تھے۔ میں نے اس سے متعلق ایک مرتبہ قاری اسعد حسن خاں صاحب سے سوال کیا۔ وہ مدرسہ فرقانیہ میں اپنے استاد قاری عبدالمالک صاحب کے ساتھ قرأۃ و تجوید کی مشق کرایا کرتے تھے۔ فرمانے لگے، ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ان کو دستِ غیب تھا البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ان تمام مصارف کے ساتھ مدرسین کو ہر ماہ کی تیس تاریخ کو تنخواہ ضرور مل جاتی تھی جب کہ مولانا چندہ وغیرہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت شیخ کے ایک شاگرد مولانا عین القضاۃ صاحب کے مرید تھے وہ اکثر کہتے کہ حضرت آپ ہمارے شیخ سے تو ملیں، مگر حضرت شیخ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال جاتے ہاں ملیں گے۔ اس کے بار بار کہنے پر ایک دن حضرت شیخ، مولانا عین القضاۃ صاحب سے ملنے گئے۔ انھوں نے دیکھا، مگر توجہ نہ کی۔ شیخ صاحب واپس آ گئے۔ اس شاگرد نے پھر کہا، آپ ہمارے شیخ سے نہیں ملے۔ حضرت شیخ نے فرمایا، بھائی ہم گئے تھے انھوں نے ہمیں دیکھا ہم نے ان کو دیکھا، انھوں نے کچھ توجہ نہ کی ہم واپس آ گئے۔ میاں میں اسی لیے پیروں سے نہیں ملتا کہ ان کی شان بان آن کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے۔ اس شاگرد نے یہ واقعہ مولانا سے بیان کیا انھوں نے فرمایا، ہاں ایسا ہوا تھا، پھر تاکید کی کہ انھیں ہم سے ضرور ملاؤ۔ چناں چہ شاگرد کے بے حد اصرار پر شیخ صاحب مجبور ہو گئے اور مولانا سے پھر ملنے گئے ان کے خلوص و محبت اور عجز و انکسار سے بہت متأثر ہوئے اور پھر موانست کا ایسا رشتہ قائم ہوا کہ مولانا کے انتقال تک برقرار رہا۔ حضرت شیخ حاجت مندوں کو مولانا کے پاس بھیج دیتے۔ ایک دن

حضرت شیخ، مولانا سے کہنے لگے، ہم آپ کو بہت تکلیف دیتے ہیں لوگوں کو آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں کیا کریں بڑے مجبور ہو جاتے ہیں۔ مولانا عین القضاۃ صاحب نے فرمایا، آپ تو ہم پر احسان کرتے ہیں ہم یہاں بیٹھے ہیں ہمیں کیا معلوم کون مستحق ہے۔

حضرت شیخ بڑے وضع دار آدمی تھے ایک دفعہ جس سے تعلق ہو جاتا ساری عمر اس کو نبھاتے تھے۔ جب تک وہ لکھنؤ میں رہے ہر جمعے کو بعد نماز عصر مولانا عبدالحئی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے پاس جاتے اور ان کے انتقال کے بعد جب ان کے بڑے صاحب زادے مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم ہو گئے تو بھی یہ روش برقرار رکھی۔ لکھنؤ کی سخت سردی میں بھی وہ ایک چادر اور روئی کی ایک بنڈی میں گزارا کر لیتے تھے۔ سردی کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اگر کوئی ٹوک دیتا تو انھیں بڑا ناگوار ہوتا اور کہتے کہ آج مجھے یہ نظر لگا کر چھوڑے گا۔ وہ پٹھان تھے۔ ان کے جدِ امجد بنیر سوات سے نقل مکانی کر کے ٹونک آ گئے تھے۔ انھیں اپنی پٹھانی پر بڑا فخر تھا اس لیے کیسا ہی سخت موسم ہو اس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی اپنے آپ کو جوانوں کی طرح باہمت اور حوصلہ مند ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور کسی حد تک ثابت بھی کر دیتے۔ یہ بات ان کے صاحب زادے قاری صاحب میں بہت زیادہ دیکھنے میں آئی۔

حضرت شیخ کی زندگی اتباعِ سنت میں ڈھلی ہوئی تھی ایک ایک عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطابق تھا۔ خشوع و خضوع سے لمبی قرأۃ اور طویل رکوع و سجود کے ساتھ نماز ادا کرتے، فجر کی نماز غلس یعنی اندھیرے میں شروع کرتے اور اسفار یعنی سپیدۂ سحر میں ختم کرتے اسی کو اقرب الی السنۃ بتاتے تھے۔ والد صاحب، مولانا سعد حسن صاحب اور قاری صاحب کو اسی طرح دیکھا ہے۔

وہ رہتے تو لکھنؤ میں تھے، لیکن اپنے وطن ٹونک کی یاد انھیں ہمہ وقت بے تاب رکھتی تھی۔ وہاں کے حالات، وہاں کی چیزیں وہاں کے موسموں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اس تذکرے میں ایسی مٹھاس تھی کہ سننے والا بھی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان کے سارے عزیز اور کنبے کے تمام لوگ وہیں تھے اور ان کے اخراجات کی تمام ذمے داریاں انھیں پر تھیں۔ وہ

اپنی آمدن وخرچ کا حساب خود نہیں رکھتے تھے بلکہ ساری تنخواہ اپنے عزیز ترین شاگرد کے حوالے کر دیتے تھے، جو اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ مولانا نعمانی جب ان کے ساتھ رہتے تھے تو یہ ذمے داری ان کے سپرد تھی، ان کے بعد والد صاحب سارا حساب کتاب کیا کرتے تھے۔ والد صاحب فرماتے تھے شیخ صاحب کو دارالعلوم سے اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی کیوں کہ وہ پرنسپل بھی تھے اور شیخ الحدیث بھی۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ والد صاحب نے کتنی تنخواہ بتلائی تھی۔ غالباً دوسو روپے ملتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ بہر حال، اپنی نصف تنخواہ تو دارالعلوم ہی میں دے دیتے اور نصف اپنے گھر کے اخراجات کے لیے مختص تھی۔ سب سے زیادہ پیسے قاری صاحب کو بھیجتے، وہ شکاری تھے، ان کے اخراجات بھی زیادہ تھے اور ان کے لیے متفکر بھی رہتے تھے ان کے رزق میں برکت کے لیے دعا بھی کرتے تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہوا کرتے تھے وہاں سے بھی اچھا خاصا مل جاتا تھا، مگر وہ اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ ایک پیسا بھی خرچ کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور لطف یہ کہ سب کچھ خرچ کر دیتے تھے ایک پیسا بھی بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ جب کبھی والد صاحب حساب پیش کرتے تو خفگی سے کہتے میاں! کیا مجھے تم پر اعتبار نہیں جو حساب لوں گا۔ ایک روز والد صاحب نے پوچھا، حضرت! آپ نے کبھی زکواۃ بھی دی۔ فرمانے لگے، میاں نہ رکھا، نہ زکوٰۃ دی۔ صاحبِ نصاب ہوتے تو زکوٰۃ دیتے۔ پھر فرمایا، یہ پیسا بڑی خراب چیز ہے، اس کو ہاتھ لگاؤ تو قلب پر زنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کیسے بے نفس لوگ تھے پیسے سے ذرا بھی محبت نہیں، ہم ہیں کہ پیسے کو دل سے چمٹا کے رکھتے ہیں، اس کے حصول کے لیے جائز و ناجائز ہر ذرائع استعمال کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، حریص ایسے کہ اہلِ ثروت و دولت کو للچائی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں اور کچھ نہیں تو خیالی پلاؤ ہی پکارتے رہتے ہیں کہ آسائش کی ہر چیز ہمیں حاصل ہو جائے۔ پیسا ہی ہمارا مقصود، پیسا ہی ہماری غائت ہے بھلا اس صورت میں انفرادیت کیسے مستحکم ہو سکتی ہے، اجتماعیت کیوں کر صحیح خطوط پر پروان چڑھ سکتی ہے اور قوم و ملک کیوں کر ترقّی کر سکتا ہے۔ قوموں کی ترقّی دولت و ثروت میں نہیں۔ جب فرد نورِ عقل وحس کو نورِ حق سے زینت بخشے گا تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا اور موجودات کے تمام

حجابات از خود رفع ہو جائیں گے، یہی انقلابِ فکر وعمل قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ آج یہی چیز مفقود ہے ہم بظاہر آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام ہیں۔ انا للہ...

یہ لوگ تھے جن کی زندگی خوف وخشیت اور انابت ورجوع الی اللہ سے عبارت تھی، ان کی دعاؤں میں سوز، ذکر میں حلاوت، مناجات میں لذت تھی۔ یہ برضا ورغبت ادائے فرضِ عبودیت میں مستی وسرور کی کیفیت سے معمور رہتے تھے، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفےٰ، ساقی کوثر، شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مجنونانہ سرشاری انھیں حاصل تھی، مقصود قربِ حق تھا، جان و مال، فرزند و زن ہر چیز اس کے آگے بے معنی تھی۔ سحابی استرآبادی۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و زیرِ پائے تو زیم
مقصودِ منِ خستہ ز کونین توئی
از بہرِ تو می زیم و برائے تو زیم

اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا فَاِذَافَعَلْتَ ذَالِکَ فَکُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا وَاھْدِنَا اِلٰی سَوَاءِ السَّبِیْلِ۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

☆☆☆

حضرت جی (حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی)

(۱۹۱۷ء-۱۹۶۵ء)

زباں پہ ، بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی (حضرت جی) مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے صاحب زادے کون نہیں جانتا این خانہ تمام افتاب است۔ یہاں ان کا تذکرہ حصول سعادت کے لیے ہے۔ والد صاحب شروع ہی سے تبلیغ سے وابستہ تھے۔ اس لیے تبلیغی حضرات سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا اور دل چاہتا نہ چاہتا کبھی کبھی ہمیں بھی تبلیغ میں جانا پڑتا تھا۔ خصوصاً سالانہ اجتماعی کے موقع پر ضرور ہی جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ہم طالبِ علم تھے اور وہ بھی سائنس کے، پھر باغیانہ طبیعت بھی پائی تھی، شعور بھی نہیں تھا اور علم بھی نہ ہونے کے برابر، شاعروں کے درمیان بیٹھ کی اپنے آپ کو بڑا دانش مند (intellectual) سمجھتے تھے۔ اس لیے دین دار طبقے سے کچھ زیادہ ہی بیزار تھے اور اللہ معاف فرمائے، جوش ملیح آبادی کا یہ شعر ذہن کے افق پر اکثر ابھر آتا تھا:

مومن بشیوہ ہائے تقشّف ہے سرفراز
ملحد بھی بر بنائے تجسّس لعیں نہیں

بس مجبوری کے درجے میں ان حضرات سے ملتے تھے۔ کوئی موقع ہو، کوئی تقریب ہو، تبلیغی جماعت کے افراد ضرور موجود ہوتے، پھر ان کا تقشّف اور بزعم خود پارسائی، ایک چلّہ نہیں تو ہفتے کے تین دن ہی تبلیغ میں لگانے کے لیے پیچھے پڑ جانا بھلا یہ قریب کرنے کی بجائے اور دور کرنے کا سامان نہیں تھا تو پھر کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ہم اس کو دوسرے

ہی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اللہ بخشے مرحوم بھائی لیاقت حسین صاحب کو، جن کو ہم چچا جان کہتے تھے، کسی نہ کسی طرح پکڑ ہی لیتے تھے اور پھر پیچھا چھڑائے نہیں چھوٹتا تھا، چناں چہ ہم ان کی صورت سے بھاگتے تھے۔

سب سے پہلے میں نے حضرت جی کو مکی مسجد کراچی کے اجتماع میں دیکھا۔ جسمانی طور پر بھاری، موٹے شیشوں کی عینک لگائے، منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی، اُگال دان پاس رکھا ہوا، شخصیت کچھ متاثر کن تو نہیں لگی البتہ جب حضرت نے تقریر شروع کی تو بے اختیار دل کھنچنے لگا، الفاظ و مضامین کی مسلسل آمد موسلا دھار بارش کی طرح تھی، جس میں بادل کے گرجنے، بجلی کے کڑکنے کا شور نہیں بلکہ لہوترنگ قلب سے دھیمے دھیمے سروں میں مسحور کن نغمے بکھر رہے تھے، مستیٔ کردار کی سرشاری میں ڈوبے ہوئے الفاظ قلوب میں ہلچل مچائے ہوئے تھے، نا سمجھی میں بھی فکر و نظر کے محدود و تنگ دائرے اپنا قطر وسیع کرتے جا رہے تھے۔ کیف و سرور کی غیر مرتب و غیر مہذب تابیں کسی ہوئی تھیں کہ حدِ ادب سے باہر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں حضرت کے پاؤں میں بیٹھا ہوا تھا، ہزاروں کا مجمع ایک سکوت طاری تھا، احساس ہوتا تھا کہ ملت کا یہ فرد اپنے اندر کیسا درد چھپائے ہوئے ہے، کیسی اس کو تڑپ ہے، کیسی اس کو لگن ہے، مسلمان کو حقیقی مسلمان بنانے کی، اس کی خواہش ہے کہ مسلمان حقیقی معنی میں پاکیزہ اعمال کا حامل ہو جائے، وہ تمام افعال اس کی زندگی سے صادر ہونے لگیں، جس کی تعلیم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور صحابہ کرامؓ نے اس کا عملی نمونہ بن کر بتلایا ہے۔ یہی ان کا مطمحِ نظر تھا اسی کے لیے ساری جدوجہد تھی۔

زندگی خود جہادِ اکبر ہی تو ہے۔ دشمنوں سے میدانِ کارزار میں جدال و قتال جہادِ اصغر ہے۔ جہاد میں تو اس اذعان و یقین سے شرکت کی جاتی ہے کہ حق ہمیشہ غالب رہے گا اور باطل کو بالیقین شکست ہوگی۔ یہ یقین کی ایسی بنیاد ہے جس کے تحت قوتِ عمل میں جوش پیدا ہو جاتا ہے، فکر میں پاکیزگی آ جاتی ہے اور تسخیرِ کائنات کے مراحل بآسانی طے ہونے لگتے ہیں، انسان خلیفۃ الارض بنا کر اسی لیے تو بھیجا گیا تھا۔ جو لوگ یقین کی اس منزل پر فائز ہوتے ہیں وہ ہر لمحۂ زندگی کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کارآمد بنا لیتے ہیں، ان کا یقین

ایک نا قابلِ مدافعت قوت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے متحرک رہتا ہے۔ اس کے آگے شک و تردد، فکر و اندیشہ، بلاء و ابتلاء کے تمام قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور صبر و استقامت اپنی پوری رعنائی کے ساتھ دل جوئی و دل دہی میں مصروف ہو جاتا ہے، پھر تمام نعمتیں اس کے استقبال کے لیے آموجود ہوتی ہیں، مگر بصیرت محمدی کے زیر سایہ وہ حدِ اعتدال سے نہیں بڑھتا اور لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُم کے سرور کن نغمے سے سرشار ہو کر جویائے رحمتِ حق ہو جاتا ہے۔

آناں کہ رضائے حق بجاں می جویند
در راہِ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید
حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اسی جہادِ اکبر کا تو وہ فریضہ انجام دے رہے تھے، صحابہ کرام کی زندگی کا مکمل نمونہ ان کی ذات میں سمٹ آیا تھا اور تمام مسلمانوں کو اس سے مملو دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر یہ مجمع مومن کی صفات کا حامل نہ بنا تو یقین ہے یہ شخص اسی غم میں اپنی جان ہلاک کر دے گا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی تقریر اس کے بعد گھنٹے آدھ گھنٹے کی طویل دعا، پورا مجمع آنسوؤں، سسکیوں اور ہچکیوں میں ڈھلا ہوا۔ ایسے میں بڑے سے بڑا باغی بھی متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ ہم عاصی و گنہگار کیسی غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں، وقت کا تیز دھارا خس و خاشاک کی طرح ہمیں بہا کر لے جائے گا اور ہماری زندگی بے مقصد تمام ہو جائے گی۔ زندگی کا تو ایک واضح مقصد ہے اور وہ مقصد شمع رسالت کے پروانوں کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے۔

دوسری مرتبہ نواب شاہ کے اجتماع میں حضرت کو دیکھنے اور ملنے کا اتفاق ہوا پھر وہی کیفیت، دل پر نقش گہرے سے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ والد صاحب کے تعلق سے حضرت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان کے پاؤں دبانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بعد میں تو حضرت جب پاکستان تشریف لاتے یہ سعادت حاصل ہوتی رہی۔ اب ہم حضرت کی خدمت میں جبر سے نہیں شوق سے جاتے تھے۔ شوق ہی تو ہے جو کشاں کشاں پا بہ زنجیر منزل

تک لے جاتا ہے، راستے کی گرم جھلسا دینے والی ریت لاکھ پاؤں میں آبلے ڈال دے شوق کا مارا تو بس رواں دواں نظر آئے گا، خاردار جھاڑیاں اسے کتنے ہی زخم دیں وہ ہر تکلیف سے بے نیاز بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اب ہم کوئی موقع ایسا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے حضرت کا قرب حاصل ہوتا ہو۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ تو حضرت جی سے ہندوستان ہی میں بیعت ہو گئے تھے۔ ایک جماعت میں جاتے وقت والد صاحب نے مجھے حضرت کی گود میں دے دیا تھا اور سارے سفر میں حضرت کے ساتھ ذکر کرتا رہا۔ شاید اسی صحبت کا اثر تھا کہ اب مجھے حضرت کا قریب نصیب ہوا۔ دل میں حضرت سے بیعت ہونے کا خیال بھی پیدا ہوا، آخری مرتبہ جب آپ پاکستان تشریف لائے میں بیعت ہونے کے ارادے سے حیدرآباد سے کراچی آیا، مگر قسمت میں نہیں تھا وہ لاہور روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر حضرت کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ۔ بقول جلیل مانک پوری۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ، وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ، وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

برمن منگر بکرم خویش نگر

☆☆☆

شاہ عبدالعزیز رائے پوری

(۱۹۹۲ء-۱۹۰۵ء)

علم کا اولیں مقصد حق تعالیٰ شانہٗ کا عرفان ہے۔ یعنی اللہ جل علیٰ جن اسمائے حسنیٰ اور افعال باہرہ سے موصوف و متصف ہیں وہ اس کائنات کے لامتناہی سلسلے میں اور نفس انسانی کے جملے احوال و آثار میں کس درجہ جاری و ساری ہیں یہ ادراک رکھنے والے ہی حقیقی معنی میں صاحب علم کہلانے کے مستحق ہیں۔ صاحبانِ علم جب تصفیۂ باطن، کمال تبتل اور دوامِ توجہ سے اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں ذات وصفات کے تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور توالیِ تجلیات سے ان پر ''حیرت نظارہ'' کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت، خوف وخشیت اور محبت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے تو وہ ہر لمحہ سرمستی و سرشاری کے عالم میں الوہیت و ربوبیت کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو صراطِ مستقیم کے جادہ پیما ہیں، انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں، ان کی پاکیزہ فطرت دریائے توحید میں غرق رہتی ہے، یہ اپنے نور بصیرت سے تہہ بہ تہہ حجابات میں مستور حقائق کا چشم ظاہر بیں سے مشاہدہ کرتے ہیں، فضلِ ربانی اور موہبتِ رحمانی کے سبب دنیا جہاں کی نعمتیں ان کے آگے دست بستہ رہتی ہیں۔ کامیابی و کامرانی ان کی ہم رکاب رہتی ہیں، دعائے مسموع انھیں حاصل ہوتی ہے، مستجاب الدعوات کے لقب سے یہ ملقب ہو جاتے ہیں اور خلقِ خدا ان سے فیض یاب ہو کر اپنی دنیا وآخرت کے راستوں کو روشن و منور کر لیتی ہے:

عارف دل و جانِ تو معیّن سازد
خارے کہ کند بجاش گلشن سازد
کامل ہمہ را ز نقص بروں آرد
یک شمع ہزار شمع روشن سازد

ایسے ہی روشن ضمیر نفوسِ قدسیہ پر مشتمل طبقہ ہر دور میں مخلوقِ خدا کی رہبری و دستگیری کے لیے سرگرم عمل رہا ہے۔ ہندوستان میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے لے کر خانوادہ شاہ ولی اللہ تک کے مشائخ کرام نے تسلسل سے سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام کی بہتری کے لیے ہر ممکن سعی فرمائی۔ ان ہی بزرگان دین نے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر رشد و ہدایت کا ایک مؤثر نظام قائم کیا، انقلاب انگیز اور عہد آفریں تحریکوں کی سرپرستی فرمائی اور آج بھی ان کے خلفاء منتسبین اس مادہ پرست دور میں احیائے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں تحریک و ترغیب اور تحریص و تشویق کے ذریعے رشد و ہدایت میں مصروف ہیں۔ خانوادۂ شاہ ولی اللہ اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا جو فیض جاری ہوا اس میں دو چیزیں سب سے نمایاں تھیں، ایک جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر باطل قوتوں سے نبرد آزما ہونا، دوسرا ذکر و فکر سے اندرونی قویٰ کو اس درجے مضبوط و مستحکم کر لینا کہ اس سے ہر طرح کے خطرات کا سدباب کیا جا سکے۔ چناں چہ اس ضمن میں دونوں کے جامع حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی کوشش اور کاوشیں اظہر من الشمس ہیں۔

قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری میں بہت سی نسبتیں جمع تھیں، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ مجددیہ سلاسلِ عالیہ سے ان کو نسبت تھی۔ انھیں ایک طرف سلسلہ نقش بندیہ مجددیہ میں حضرت میاں جیو عبدالرحیم سہارن پوری سے خلافت و اجازت حاصل تھی تو دوسری طرف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ سے چشتیہ قادریہ سلسلے میں۔ یہ نسبت تھی جس کے تحت انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی تربیت کی تھی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ خود بھی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کے ساتھ جہادی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ ریشمی رومال تحریک کی ہند میں سرپرستی فرماتے رہے تھے اور اپنے مریدِ خاص حضرت

شاہ عبدالقادر رائے پوری کو بھی معاونت میں ساتھ رکھا اور ہدایت فرمائی کہ میرے بعد حضرت شیخ الہند کا ساتھ دیتے رہنا۔ سیاسی وملّی تحریکات میں برابر شریک رہنا۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے، سوانح حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری میں اس کو بہت واضح طور پر بیان کیا ہے۔

ہمارے شیخ حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس سرہٗ، حضرت قطب عالم شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے حقیقی نواسے ہیں۔ انھیں کی آغوش میں رہ کر بڑے ہوئے۔ ان ہی کی قلبی توجہات انھیں حاصل ہوئیں، سلوک کے منازل بھی انھیں نے طے کرائے۔ ان کے والد خود حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ ان کا نام 'عبدالعزیز' بھی حضرت گنگوہیؒ کا تجویز کردہ تھا۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت اقدس خلیل احمد سہارن پوری کی نوازشات قلبیہ سے سیرابی کا بھی موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے نصف صدی یعنی کامل پینتالیس سال حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی خدمت اقدس میں رہ کر فیض باطنی حاصل کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اخلاق وکردار، عادات واطوار کے ساتھ ساتھ صورت وشکل میں بھی حضرت اقدس رائے پوری کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ ایک ہی خاندان کے افراد میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں، رنگ روپ، رفتار وگفتار سب میں مماثلت ہوتی ہے، باپ دادا کے اثرات یکساں منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ اب تو جنیٹک سائنس (Genetic Science) نے اس کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ عجیب دور آیا ہے جس کو دیکھو سیّد بنا ہوا ہے۔ خاندان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کے کچھ اثرات ان میں نظر نہیں آتے اور لوگ ہیں کہ بزعم خود سیّد بنے ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری راجپوت النسل تھے۔ دور دور تک شاہ عبدالقادر صاحب سے کوئی خاندانی نسبت نہیں تھی۔ والد صاحبؒ نے بتایا، انتقال سے چند روز پہلے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک روز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے فرمایا، آؤ، حافظ صاحب! گلے ملیں۔ اس طرح تین مرتبہ دیر دیر تک گلے لگے رہے لوگوں نے دیکھا کہ نسبت منتقل ہو رہی ہے۔ جب حضرت اقدس کا انتقال ہو گیا تو کچھ ہی دنوں بعد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری شکل وصورت، رفتار وگفتار

سب میں حضرت اقدسؒ کے مشابہ ہو گئے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹونکیؒ بخاری پڑھاتے وقت فرمایا کرتے تھے "القائے نسبت" سے ظاہری شکل وصورت میں تغیر وتبدل کی زندہ مثال ہم نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری کی صورت میں دیکھ لی۔

مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری سے ہماری ملاقات والد صاحب کے ساتھ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ہوئی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس بڑی بارعب شخصیت معلوم ہوئے۔ چہرہ نورانی تھا اور ایک خاص قسم کی کشش کا حامل کہ دیکھتے ہی دل خود بخود ان کی طرف کھنچنے لگتا تھا۔ والد صاحب نے ملایا، تعارف کرایا، مصافحے کے لیے جب ان کے نرم و ملائم ہاتھوں میں ہاتھ دیا تو ایک خاص قسم کی حرارت قلب وجگر میں اترتی چلی گئی۔ حضرت بہت ہی شفقت ومحبت سے ملے۔ حال دریافت کیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ میں خاموش حضرت کے پاس بیٹھا رہا اور وہ حاضرین کو تلقین کرتے رہے، کھانا بھی ساتھ ہی کھایا۔ حضرت کا دستور تھا کہ ایک پلیٹ میں دو آدمی مل کر کھائیں، تنہا کھانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ پوری محفل پر ان کی نظر تھی۔ اس پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر معلوم ہوئی۔

ایک مرتبہ مولانا خورشید احمد صاحب گھر تشریف لائے غالباً حضرت مدنیؒ کے خلیفہ تھے۔ بڑے مسکین، عبادت گزار آدمی تھے، مغرب کے بعد ذکر بالجہر میں مشغول ہو گئے پورے ایک دن ایک رات گھر پر رہے۔ جب وہ چلے گئے تو والد صاحب نے ہم سے پوچھا، آپ کو مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری اور ان میں کون سی شخصیت پسند آئی، ہم نے بے ساختہ کہا، حضرت رائے پوری کی۔ پھر پوچھا، اس کی کوئی خاص وجہ ہے، ہم نے عرض کیا حضرت رائے پوری کی شخصیت میں رعب و دبدبہ ہے اور مولانا خورشید صاحب کے ہاں مسکینیت غالب ہے مسلمانوں میں اتنی بھی مسکینیت نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ انھیں کم زور اور بودا سمجھیں۔ یہ رائے ہماری کچھ کم سنی کچھ لاعلمی کے سبب سے تھی، ورنہ: ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت کا خصوصی تعلق تھا۔ ایک مرتبہ حیدرآباد میں بطور خاص ہمارے گھر تشریف لائے۔ بہت سے لوگ حضرت کے ساتھ تھے یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ ذکر وشغل اپنی جگہ، مگر اتباعِ سنت کا ہر لمحہ خیال رکھتے تھے۔ عام طور پر بزرگوں کو

دیکھا ہے کہ وہ شفایابی کے لیے پانی پر دم کر کے دیتے ہیں، مگر حضرت کی خدمت میں جب بھی پانی دم کرنے کے لیے پیش کرتے تو وہ پہلے ایک گھونٹ پانی پیتے اس کے بعد دم کر کے دیتے۔ اس طرح سُؤرِ الْمُؤمِنِ شِفَاءٌ والی حدیث پر عمل بھی ہو جاتا۔ حضرت کی طبیعت میں مزاح بھی تھا آموں کا زمانہ تھا والدہ صاحبہ نے آموں کی قاشیں بنا کر دو ٹرے میں سجادیں میں نے ایک ٹرے حاضرین کے آگے رکھ دی اور ایک حضرت کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کی کہ حضرت اسے تبرک کر دیں۔ فوراً ہی حضرت نے فرمایا، میاں آم تبرک نہیں کیا جاتا، آم تو کھایا جاتا ہے اور حضرت نے وہ بھی حاضرین کے آگے بڑھا دیں البتہ چند قاشیں چھوڑ دیں۔ قلوب پر ان کا رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بلاشبہ مومن تو اللہ ربّ العزّت کی زبان مُنہ میں رکھ کر بولتا ہے پھر کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ مقابل کوئی بول سکے۔

رابطۂ عالمِ اسلامی کی کانفرنس کے سلسلے میں ہندوستان سے بہت نے علماء کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھیں دنوں حضرت بھی نیوٹاؤن میں مقیم تھے۔ میں نے خود دیکھا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے علماء سے حضرت ناراضی کے لہجے میں گویا تھے کہ تم لوگوں نے میرے شیخ کے ساتھ اچھا نہیں کیا، اور ہر ایک نظریں نیچی کیے یہی کہہ رہا تھا کہ حضرت غلطی ہوگئی، لیکن جب مولانا اسعد مدنی ملنے آئے تو حضرت نہایت نرم لہجے میں نہایت شفقت و محبت سے ملے۔ ان کی یہی ادائیں ہمیں اچھی لگتیں، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخصیت ہے جس کے سامنے بڑے بڑوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری کی یوں تو ہر ادا پسندیدہ تھی، مگر میں نے خصوصیت سے یہ بات نوٹ کی کہ وہ نوجوانوں پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتے تھے، ان کے ہر ہر عمل پر پوری نظر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ یہی ایک طبقہ ہے جو دین کا محافظ اور اس کا رکھوالا ہوسکتا ہے اسی لیے نوجوانوں کو اپنے قریب لاتے تھے۔ میں اس زمانے میں ڈاڑھی نہیں رکھتا تھا اس بنیاد پر انھوں نے نہ مجھ پر فاسق و فاجر کا حکم لگایا نہ دھتکارا اور نہ ہی مجھ سے کنارہ کش رہے بلکہ اس کے برعکس

بہت محبت سے ملے اس انداز میں نصیحتیں کیں کہ روز بروز مؤثر ہوتی چلی گئیں۔ بعض ہمارے بزرگ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر بزرگوں کا یہی طریقہ رہا تو یقین ہے کہ یہ نوجوان نسل مستقبل قریب میں ان سے روز بروز دور ہوتی چلی جائے گی اور کفر و الحاد کا رنگ ان پر چڑھتا ہی جائے گا۔ اس کے نتائج معلوم ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ بزرگانِ دین اپنے حسنِ خلق اور توجہ خاص سے اس طبقے کو اپنے قریب لائیں ان کی تربیت کریں کہ یہی دین کا ہراول دستہ ثابت ہوگا۔

وقت گزرتا گیا، والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اب مجھے بہت قلق تھا کہ میں والد صاحب سے بیعت نہیں ہوا۔ مجھے معلوم بھی تھا کہ والد صاحب کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ و مجاز حضرت شیخ حیدر حسن خان صاحب سے اجازت تھی۔ اس کے علاوہ میرے سامنے مولانا فضل اللہ الصمد خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے اجازت دی تھی۔ ان کے بعد تو دور دور تک کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جن کی طرف طبیعت رجوع کرتی۔ کراچی میں صرف حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تھے ان ہی پر نظریں جاتی تھیں۔ وہاں ایک دو مرتبہ ہم گئے بھی، مگر بہت ہجوم دیکھا یہی خیال دامن گیر رہا کہ یہاں ہم پر توجہ نہیں ہوگی بس قسمت میں نہیں تھا۔ اسی دوران میں نے خواب دیکھا کہ والد صاحب میرے گھر آئے ہوئے ہیں وضو فرما رہے ہیں اور ایک کمرے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری نیت باندھے کھڑے ہیں۔ میں اپنے دل میں کہہ رہا ہوں کہ مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے یہ مجھے بیعت کرنے آئے ہیں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی، میں نے یہ خواب مولانا نعمانی سے بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا، حضرت رائے پوری زندہ ہیں یہ اشارہ ہے تم ان سے بیعت ہو جاؤ۔ اس وقت حضرت صاحبِ فراش تھے۔ اہلیہ کے پی ایچ ڈی کے سلسلے میں لاہور جانا ہی تھا چناں چہ میں اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ سرگودھا پہنچا حضرت شاہ سعید احمد صاحب نے خصوصی توجہ دی اور میری درخواست پر ہم سب کو حضرت سے بیعت کرایا۔ اس طرح میرا حضرت سے قلبی تعلق قائم ہوگیا۔

حضرت کے جانشیں اور خلفِ اکبر حضرت شاہ سعید احمد صاحب رائے پوری مدظلّہ العالی

سے تعلقِ خاطر ہے۔ جب بھی حضرت کراچی تشریف لاتے ہیں ناچیز کو بطورِ خاص یاد فرماتے ہیں۔ نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں، والد صاحب کے تعلق سے خصوصی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے تناظر میں جس طرح وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو باوجود مخالفت کے ساتھ لے کر چل رہے ہیں یقیناً یہ بہت عظیم کام ہے اور وقت کا تقاضا بھی ہے۔ خانقاہی نظام سے جس طرح سلف صالحین نے انقلاب برپا کیا تھا امید ہے کہ اسی طرح خانقاہ رائے پوری سے مستقبل قریب میں انقلاب برپا ہوگا، دنیا کا نظام دین کے تابع ہو کر چلے گا۔ آں جناب کی ساری جدوجہد اسی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے اور حضرت کو ہمت و استقامت دے کہ وہ یہ کام اسی مستعدی سے کرتے رہیں۔ آمین۔

سبحان اللہ والحمد للہ اکبر

کتبہ ابن العلا آنندوی ۱۴۰۱ھ

☆☆☆

ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں

(۱۹۱۲ء۔۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب کے والد محترم مولانا محمد عبدالعلیم ندویؒ سے تعلقات تھے۔ جب کبھی ڈاکٹر صاحب لطیف آباد آتے ہمارے گھر ضرور تشریف لاتے۔ والد صاحب قبلہ کی وجہ سے اکثر علمائے کرام اور بزرگانِ دین کو دیکھنے، ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، لیکن وہ ہمارا ایسا لاعلمی اور ناسمجھی کا دور تھا کہ نہ تو اس وقت ہم ان حضرات کے علمی مرتبے سے آشنا تھے اور نہ یہ احساس تھا کہ ان بزرگوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا جائے، مگر اس کے باوجود حضرت ڈاکٹر صاحب قبلہ کو دیکھ کر ایک عجیب سی اپنائیت اور محبت کا احساس دل میں پیدا ہوتا تھا۔ بس ڈاکٹر صاحب کو والد صاحب سے علمی موضوعات پر گفتگو کرتے دیکھتے رہتے اور اَن جانے احساس کے ساتھ دل میں ان کی شخصیت کو جذب کرتے رہتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ، قَالَ : قِيلَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ، أَيُّ جُلَسَائِنَا خَيْرٌ؟ قَالَ : مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللَّهَ رُؤْيَتُهُ ، وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ، وَذَكَّرَكُمْ بِالآخِرَةِ عَمَلُهُ

حضرت ابنِ عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ دریافت کیا گیا، یا رسول اللہ! ہمارے کون سے ہم نشیں بہتر ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس کی زیارت تمھیں اللہ کی یاد دلا دے اور اُس کی گفتگو تمھارے علم میں زیادتی پیدا کرے اور اُس کا عمل تمھیں آخرت کی یاد دلائے۔

یہی کیفیت ڈاکٹر صاحب کی بھی تھی۔ میں تو سائنس کا طالب علم تھا۔ بی ایس سی میں پڑھتا تھا ایک سائنس کے طالبِ علم کو ادب سے واجبی سا تعلق ہوتا ہے سو مجھے بھی تھا۔ والد صاحب کی کتابوں میں سے اردو کی کتابیں نکال کر کچھ نہ کچھ وقتاً فوقتاً پڑھتے رہتے تھے۔ یہ دور وہ تھا کہ ہمارے محلّے میں چند بزرگ شعراء موجود تھے اور مشاعرے ہوتے تھے چناں چہ ہم بھی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اور گاہے گاہے شعر بھی کہنے لگے، ہمارے محلّے کے ہی بزرگ حکیم عبداللہ خاں جوشؔ اور نظام الدّین فتح پوری سے اصلاح بھی لینے لگے۔ مشاعروں میں شرکت اور ان بزرگوں کی صحبت سے شعر و ادب سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ میں اس زمانے میں اسکول میں ٹیچر تھا جو وقت اسکول کا تھا وہی کالج کا بھی تھا دونوں کو ساتھ چلانا مشکل ہوگیا۔ حالات کے سبب ملازمت چھوڑ نہیں سکتے تھے مجبوراً سال دوم میں آکر کالج چھوڑ دیا اب ساری توجہ شعر و ادب پر مرکوز ہوگئی، اسی زمانے میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور دورانِ تعلیم اسکول میں جو فارسی پڑھی تھی، اسی کے زور پر فارسی شروع کر دی، والد صاحب سے گلستان و بوستاں، کریما، چشمۂ شیریں، چہار مقالہ، انشائے ابوالفضل، اخلاقِ محسنی، اخلاق جلالی، حافظ کی غزلیں اور عمر خیام کی رباعیات پڑھیں اور تیاری کر کے کراچی بورڈ سے منشی فاضل (فارسی) کا امتحان دے دیا۔ اس دوران بی اے میں داخلہ لے لیا، لیکن ابھی تک ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس شہر کی ایک معروف علمی شخصیت سے بھی کچھ استفادہ کرنا چاہیے۔

ہمارے استاد حضرت نظام فتح پوری صاحب کو علم عروض میں بڑا درک تھا جب بھی ان سے اصلاح لینے جاتے وہ شعر کی تقطیع کرتے، بحر بتلاتے اور اس بحر میں جو زحافات آتے ان کو نہایت سہل انداز میں سمجھاتے، اس طرح علم عروض سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ نظام صاحب سے جو کچھ سیکھا سو سیکھا والد صاحب سے محیط الدائرہ کی تلخیص پڑھی، یہ تلخیص مولانا طاحہ صاحب پروفیسر عربی اورینٹل کالج نے کی تھی۔ اسی دوران ''قواعد العروض'' نامی ایک ضخیم کتاب ہاتھ لگی جو غالب کے ایک شاگرد قدر بلگرامی کی تصنیف تھی اس کو بالاستعیاب پڑھا، بڑا مزا آیا، چناں چہ اس پر مضمون لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ دورانِ مطالعہ اس کتاب میں دو

شخصیتوں کے نام آئے، بہرامی سرخسی اور بزرجمہر قسیمی ہم نے ان کے تراجم کی چھان بین کی، اکثر مآخذ دیکھ لیے تھے، مگر ان کے اتنے مختصر حالات ملے کہ دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر نبی بخش قاضی صاحب شعبۂ فارسی کے سربراہ تھے، ان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے بھی ان تمام مآخذ کی نشاندہی کی، جو ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ خوش قسمتی کہ وہاں ڈاکٹر صاحب قبلہ تشریف لے آئے، جانتے تو ہمیں پہلے ہی سے تھے، دیکھتے ہی پوچھا، آپ یہاں کیسے؟ قبل اس کے ہم بتاتے، ڈاکٹر قاضی صاحب نے ہماری وہاں موجودگی کی وجہ بتائی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا، آپ نے اس سلسلے میں کون کون سے کتابیں دیکھیں۔ ہم نے مآخذ بتلادیے اور عرض کیا، حضرت یہ حالات بہت ناکافی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، آپ نے "فرہنگِ سخنوراں" دیکھی؟ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے قاضی صاحب سے وہ کتاب نکلوا کر میری طرف بڑھادی۔ فرمایا، اس میں دیکھیے، شاید آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ بلاشبہ اس میں ان کے سب سے زیادہ حالات تھے۔ اب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔

۱۹۶۷ء میں ہم نے بی اے کا امتحان پاس کرلیا، منشی فاضل کی بنیاد پر ایم اے فارسی میں داخلہ لیا پھر کچھ احباب کے مشورے پر شعبۂ اردو میں منتقل ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ درخواست لکھی ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی شفقت و محبت کا اظہار کیا، کوئی دعا پڑھی اور دستخط کر دیے۔ لیجیے، ہم اردو میں منتقل ہو کر آ گئے۔

والد صاحب اور مولانا نعمانی سے اس دور کے اساتذہ کے بہت سے واقعات، طلبہ سے ان کی محبتوں اور شفقتوں کے تذکرے، ان کے درس کی خصوصیات اکثر سنی تھیں، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ وہ باتیں مجھے حقیقت سے زیادہ مبالغہ معلوم ہوتی تھیں، لیکن جب ڈاکٹر صاحب کے درس میں بیٹھا ان کا پڑھانے کا انداز، ان کی گفتگو، ان کی علمی معلومات کا اندازہ کر کے تعجب ہوتا اور قدیم اساتذہ کے واقعات افسانہ نہیں حقیقت پر مبنی معلوم ہونے لگتے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کا ذہن کیسا رسا اور مربوط تھا، کوئی سوال ہو تشفی بخش جواب حاضر، کتابیں ایسی مستحضر کہ شک و مغالطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیسا ہی ادق موضوع ہو حوالہ در

حوالے لکھاتے جاتے، نت نئے موضوعات نوک زبان رہتے، موضوع سے متعلق ابواب اور ذیلی عنوانات فوراً ہی قائم فرما دیتے اس طرح کہ نفس مضمون کا پورا پورا حق ادا ہو جاتا اور کسی کو بھی اس میں کتر بیونت کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مجھے خوب یاد ہے، ڈاکٹر صاحب ولی دکنی پڑھایا کرتے تھے۔ ولی کا یہ شعر انھیں بہت پسند تھا:

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اللہ اللہ! اُس وقت تو شعور ہی نہیں تھا، مگر اب اس شعر کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے حسن ذوق کا اندازہ کر کے ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ علم تو تقویٰ کا نام ہے یہ بات اکثر والد صاحب فرماتے تھے۔ بلاشبہہ ہر چیز کی اساس تقویٰ ہی ہے اور تقویٰ تو پاکیزگی وطہارت سے مشروط ہے، جب فکر وفن اور علم وعمل تقوے کی شعاعوں سے مستنیر ہو تو پھر نفس انسانی کی ہر کیفیت لذت وسرور سے ہم آہنگ ہو کر سود مند نتائج کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہ احساس ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر پختہ ہوتا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے، انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ہمارے مرحوم دوست پروفیسر عزیز الدّین صاحب سناتے تھے کہ ہم نے ۱۹۵۴ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ پھر ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ ہمارے ساتھ محمد فاروق (ڈیڈی) سجاد باقر رضوی بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہماری کلاس خالی تھی۔ پروفیسر صاحب تشریف نہیں لائے تھے (غالباً جمیل واسطی تھے) ہم لوگ یوں ہی کلاس کے باہر کھڑے تھے کہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نظر آ گئے۔ ہم نے خیال کیا آج ڈاکٹر صاحب سے کچھ دین کی باتیں ہی سنیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ ہماری کلاس خالی ہے اگر آپ فارغ ہوں تو ہماری کلاس لے لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کلاس میں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ آپ حضرات کیا پڑھ رہے تھے۔ ہم نے یک زبان کہا، کارلائل۔ چندلڑکے بڑے استہزائیہ انداز میں مسکرائے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت رکھتا تھا، مجھے بہت ناگوار ہوا۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ حضرت ہمیں کچھ دین کی باتیں بتائیں کہ ڈاکٹر نے نہایت شستہ انگریزی میں کارلائل

پر لیکچر دینا شروع کیا۔ جوں جوں لیکچر آگے بڑھتا جاتا تھا، ہر ایک لڑکا حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا جارہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب پڑھاتے تو ایک ایک لفظ کی تحقیق فرماتے اور یہ بھی بتاتے کہ شاعر نے فلاں لفظ ہی کیوں استعمال کیا ہے اس کا ہم معنی اور کوئی لفظ کیوں نہیں لایا۔ پھر معنی و بیان کی روشنی میں اس کے محاسن بیان فرماتے۔ شعر تو اس زمانے میں ہم کہتے ہی تھے۔ کئی مرتبہ ہم نے ایسا کیا کہ شعر میں ہم معنی، ہم وزن یا مترادف لفظ بدل کر غور کیا تو شعر کو بے لطف پایا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے پڑھانے کا انداز تھا۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی تھے، ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ تحقیق کا ذوق اپنے طلبہ میں منتقل کردیں۔ مختلف جامعات کا ایم اے اردو کا نصاب اٹھا کر دیکھ لیجیے معلوم ہو جائے گا کہ جامعہ سندھ کے نصاب میں بطورِ خاص تحقیق کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی اور الفاروق کا مقدمہ، مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوینِ حدیث وغیرہ کتابیں کسی بھی جامعہ کے نصاب میں شامل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو نصاب میں شامل کررکھا تھا۔ بلاشبہ محدثین کی کاوشوں کے مطالعے سے تحقیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ حدیث، اصولِ حدیث، اسماء الرّجال، معاجم اور طبقات و سیر علوم کے ایسے شعبے ہیں جن میں تحقیق کا بہت ہی اعلیٰ معیار ہے اور جدید تحقیق کے جو اصول منضبط کیے گئے ہیں وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ناچیز نے شعبۂ اردو کو شعبۂ اسلامیات بنا دیا ہے، بھلا بتایئے تو اردو کا ایک طالبِ علم کلمۂ طیبہ صحیح نہ لکھ سکے، 'صلی اللہ علیہ وسلّم' یا 'السّلام علیکم' وغیرہ الفاظ درست نہ لکھ سکے۔ اگر ہم صحیح لکھنا سکھائیں یا پڑھائیں تو معترض ہوتے ہیں۔ متنِ حدیث کی تحقیق کے جو اصول مدون ہوئے ہیں ان سے نابلد رہ کر کس طرح تحقیق کے نتائج صحیح اور درست ہو سکتے ہیں اور پھر مسلمان ان سے دور کیوں کر رہ سکتا ہے۔ یہ فرما کر ڈاکٹر صاحب اکثر مسکرادیا کرتے تھے۔ یہاں بطورِ خاص اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ناچیز کے لیے بھی بعض حضرات نے یہی جملے کہے میں نے سن کر اللہ کا شکر ادا کیا، الحمدللہ، میں اپنے استادِ محترم کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں۔

فی زمانہ ہمارے ادیب، شاعر اور اساتذہ لفظوں سے زیادہ معنی و مفہوم پر توجہ دیتے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب قبلہ الفاظ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہم شاگردوں کو لفظوں کے برتنے کا سلیقہ آ جائے، وہ شعور پیدا ہو جائے کہ لفظوں کو ان کی مخصوص کیفیت کے ساتھ استعمال کرنے لگیں، لفظ کی اصل اور اس کے مشتقات پر پوری نظر ہو، صحیح املا سے لکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے ڈاکٹر صاحب نے محمد سلیم کی ''وضعِ اصطلاحات''، دین محمد کی ''سرگذشتِ الفاظ'' اور املا سے متعلق مضامین نصاب میں شامل کر رکھے تھے اور ڈاکٹر صاحب خود ہی یہ مضمون پڑھاتے تھے۔ ایک روز کلاس میں تشریف لائے آتے ہی فرمانے لگے، محمد حسین آزاد نے ''نیرنگِ خیال'' میں یہ جملہ لکھا ہے:

ابتدائے سنِ صبا سے اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن ہماری آپ کے ساتھ موانست و مجالست رہی ہے۔

پھر ناچیز کی طرف چاک بڑھائی اور فرمایا، آپ لکھیے، ہم نے ڈرتے ڈرتے بورڈ پر جملہ لکھا۔ فرمایا، اس میں غلطی رہ گئی، ہر چند غور کیا، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا غلطی ہوئی ہے۔ فرمایا، الیٰ کے کیا معنی ہیں، ہم نے فوراً ''الالآن'' مٹا کر الف مقصورہ سے الیٰ لکھ دیا۔ فرمایا، اب صحیح ہے۔ الفاظ و معنی تو باہم مربوط ہوتے ہیں، الفاظ صحیح املا کے ساتھ لکھے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ مفہوم سمجھنے میں غلطی ہو۔ املا ہی اگر درست نہ ہو تو غلطی کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب صحت لفظی پر بڑا زور دیتے تھے۔ ایک بار میں نے کلاس میں ایک شعر پڑھا:

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود
مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تُو نے

میں نے اِس میں ''مَقابل'' میم بالفتح پڑھا فوراً ہی ڈاکٹر صاحب نے ''مُقابل'' کو ضمّے سے دہرا کر فرمایا، ''ہاں، پھر پڑھیے، مُقابل بنا دیا۔'' میں نے فوراً ہی تصحیح کر کے پھر پڑھا۔ اس طرح میری اصلاح بھی ہوگئی اور کسی کو احساس تک نہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک عادت تھی کہ جو بات بارِ خاطر ہوتی۔ چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہونے لگتے اور ہم سب ہی کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، گویا

ایک کائنات ہم سے روٹھ گئی ہے۔ اس لیے ہماری کوشش ہوتی کہ کوئی بات ہم سے ایسی سرزد نہ ہو جائے جس سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت مکدر ہو جائے اور اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگتے اور یہ احساس اصلاح کی طرف مائل کر دیتا۔

اس ضمن میں ایک واقعہ یہ قابل ذکر ہے کہ شروع شروع میں جب ہم یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو ایک روز پروفیسر ڈاکٹر خان رشید صاحب مرحوم کلاس لے رہے تھے سودا کا لامیہ قصیدہ انھوں نے شروع کیا جب اس شعر پر پہنچے:

آب جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

تو ڈاکٹر صاحب نے خطِ گلزار کی تشریح میں فرمایا، سات خط ہوتے ہیں اس میں خط گلزار بھی شامل ہے۔ طالب علمی کا دور بھی کیسا عجیب وغریب ہوتا ہے۔ ذرا سی بھی معلومات ہوں تو وہ اپنے آپ کو علامۃ الدہر سمجھنے لگتا ہے اور مقابل کو نہایت حقیر بلکہ حشرات الارض سے بھی کم تر۔ کہاں ہم اور کہاں ڈاکٹر خاں رشید صاحب (استغفر اللہ) ہم فن خوش نویسی سے واقف تھے، تھوڑی بہت مشق بھی کی تھی۔ فوراً ہی کھڑے ہو گئے اور کہا، مولانا جامی علیہ الرحمۃ کا قطعہ ہمیں یاد ہے اس میں سات خطوں میں خط گلزار کا ذکر نہیں ہے۔ ہم نے قطعہ سنایا:

کاتباں را ہفت خط باشد بطرز مختلف
ثلث و ریحان و محقق، نسخ و توقیع و رقاع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہلِ عجم
از خط توقیع استنباط کردن اختراع

ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کردی۔ ہمارے اساتذہ بھی کیسے اچھے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھرے۔ ڈاکٹر صاحب نے قطعاً برا نہیں مانا اور بڑی شفقت و محبت سے بعد میں بہت ہی مفید نصیحتیں کیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب کے علم میں بھی آ گئی اور مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر خان رشید صاحب نے خود ہی بتلائی ہوگی۔ ایک روز دونوں حضرات تشریف فرما تھے، میں بھی پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ

نے نہایت شفقت سے فرمایا، ہمیں اللہ پاک نے علم دیا ہے، ہمیں ضرور اس کا اظہار کرنا چاہیے، لیکن اس طرح کہ نہ تو اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹنا مقصود ہو اور نہ کبر و غرور کا اس میں شائبہ ہو اور ڈاکٹر خان رشید صاحب خاموش مسکراتے رہے۔ اللہ اکبر۔ بالکل یہی نصیحت بعد میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب نے کی تھی جب وہ رابطۂ عالمِ اسلام کی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آئے۔ انھوں نے ناچیز سے فرمایا، میاں! آپ کو تحقیق کے دوران بزرگوں کی تحریر میں کوئی تسامح نظر آئے تو اس کا ضرور بالضرور اظہار کرو، لیکن ادب و شائستگی کے ساتھ بہت منتخب اور چنیدہ الفاظ میں کہ اسلوب میں عجز و نیاز کی جھلک ہو۔ گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی۔

ایم اے فائنل میں ایک مقالہ لکھا جاتا تھا۔ ہماری کلاس میں ڈھائی سو کے قریب طلبہ تھے۔ ان سب کے لیے عنوانات تجویز فرماتے، مآخذات کی نشاندہی فرماتے یہاں تک کہ ذیلی عنوانات بھی قائم کر دیا کرتے تھے اور ایسی ہمت بڑھاتے کہ ہنستے کھیلتے مقالہ مکمل ہو جاتا۔ میرے لیے ''اردو کی نعتیہ شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات'' کا عنوان تجویز فرمایا۔ میں نے ہر چند عرض کیا کہ موضوع میرے لیے مشکل ہی نہیں بہت ہی مشکل ہوگا۔ فرمانے لگے، حضرت (ناچیز کے والد) فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو جو عزت ملی ہے وہ قرآن و حدیث کی وجہ سے ملی ہے آپ کیوں اس سے محروم رہتے ہیں۔ آپ کو بس اسی عنوان کے تحت کام کرنا ہے۔ یہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کا ایسا کرم ہوا کہ میں نے والد صاحب قبلہ سے حدیث پڑھنی شروع کی۔ اکثر علمائے کرام حدیث کا مطالعہ استنباط مسائل کے لیے کرتے ہیں، لیکن مجھے قرآن و حدیث کا مطالعہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے کرنے کا موقع ملا۔ آج جب میں کبھی سوچتا ہوں کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب کے طفیل مجھے یہ نعمتِ عظمیٰ نصیب ہوئی تو دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔ جَزَاءُ کُمُ اللہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء۔

ڈاکٹر صاحب کی توجہ اپنے تمام طلبہ پر یکساں ہوتی تھی اور ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ مجھ پر بطورِ خاص آپ کی توجہ ہے۔ یہی احساس ہمارا بھی تھا۔ سالِ اوّل میں ناچیز کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ فائنل میں بھی اسی قدر نمبر لانے ہیں۔ ڈاکٹر

صاحب اکثر فرماتے، آپ توجہ دیں، محنت کریں، لیکن ہم اتنے ناسمجھ کہ اس کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ برادرم ڈاکٹر فضل حق خورشید صاحب جو ہم سے ایک سال سینئر تھے، ان کی ایم اے میں پہلی پوزیشن تھی۔ وہ تازہ تازہ لیکچرر ہو کر گورنمنٹ کالج لاڑکانہ گئے تھے۔ انھوں نے وہاں سے ایک محبت بھرا خط لکھا اور اس جملے سے اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ ''کیا تم مردوں کی ناک بچانے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' اس وقت ڈاکٹر صاحب قبلہ کی شفقت بھری تنبیہ کا مطلب سمجھ میں آیا۔ امتحان نمایاں کامیابی سے پاس کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ہی خوش ہوئے۔ والد صاحب کو مبارک باد دی اور فرمایا کہ اب انھیں چاہیے کہ پی ایچ ڈی کرلیں، مجھے ان سے بڑی توقعات ہیں، لیکن زیادہ محنت نہیں کرتے۔ والد صاحب نے فرمایا، ہم نے تو آپ کے سپرد کردیا، آپ ہی ان سے کام لیں۔ اس زمانے میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے کو بابائے اردو گولڈ میڈل دیا جاتا تھا۔ جب وہ میڈل ہمیں ملا تو پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اب آپ پی ایچ ڈی کر ہی ڈالیں۔ ابھی تک اچھی ملازمت نہیں ملی تھی اس لیے اس طرف طبیعت بالکل مائل نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے فرمایا، ڈاکٹر صاحب تمھیں یاد کر رہے ہیں، تم ان سے بالضرور مل لو۔ ناچیز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا، آپ پی ایچ ڈی کرلیں۔ تھوڑے فرق سے عنوان بھی وہی ہوگا یعنی ''اردو شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات'' یہ میری خواہش ہے آپ ہی کو کرنا ہے۔ یہ سن کر میرا تو دم ہی نکل گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی جان چھڑاؤں۔ میں نے بہانے بنانے شروع کیے مآخذات کی فہرست تیار کرنا، ابواب قائم کر کے ذیلی عنوانات قائم کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو جلد ہی دکھلاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے فرمایا، عنوانات اور مآخذات کے چکر میں نہ پڑیے، ضروری قانونی تقاضے پورے کرلیجیے اور کام شروع کردیجیے راستے خود بخود نکل آتے ہیں، ہم نے دیکھا ہے جو ان چکروں میں رہتے ہیں کام نہیں کر پاتے۔ اب نام یاد نہیں رہا، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی یا مولانا احسن مارہروی کا نام لے کر فرمایا، وہ یہی کہا کرتے تھے اور اب تو بلاشبہہ ہمارا تجربہ بھی یہ کہتا ہے۔ غرض اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا۔

چچا میاں مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب اس زمانے میں لیاقت نیشنل لائبریری میں تھے، علامہ جلال الدین سیوطی کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' کو مرتب بھی کیا تھا، ان سے تذکرہ کیا عنوان بہت ہی پسند کیا، کچھ مآخذ کی انھوں نے نشاندہی بھی کی۔ غرض جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ جو تھوڑا بہت کام کر کے ڈاکٹر صاحب کو دکھانے لے گیا تو آپ نے نہایت شفقت سے دیکھا اور فرمایا، حضرت (والد صاحب) کو بھی دکھا لیجیے۔ میں نے شکایۃً کہا کہ وہ بہت سخت ہیں۔ فرمایا، آپ کام کے آدمی بن جائیں گے ان کی سختی آپ کے لیے تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ صوفیائے کرام، صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کو بھی عموماً حدیث کے نام سے بیان کر دیتے ہیں۔ والد صاحب کو دکھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کرو یہ بھی بتاؤ کہ احادیث کی کس کتاب میں اس کو روایت کیا ہے اور راوی کون ہے وغیرہ۔ میں اکثر کہتا کہ صاحب میں ادب پڑھ رہا ہوں، حدیث نہیں، مگر وہ نہیں مانتے اور جب تک صحیح حدیث کی صحت کی طرف تشفی نہیں ہو جاتی، آگے نہیں بڑھنے دیتے؛ اس لیے میں ان کو دکھانے سے کتراتا تھا۔ غرض کام کرتا رہا، راستے نکلتے رہے، اس زمانے میں لیڈن سے حدیث کا ایک انڈکس ''معجم المفهرس لالفاظ الحدیث'' شائع ہوا تھا۔ سندھ یونیورسٹی نے اس کو خرید لیا تھا، اس سے استفادہ کرنے کے لیے جامشورو جاتا۔ غرض کام کرتا رہا، قرآن و حدیث کی تلمیحات، محاورات، صنائع بدائع، اصطلاحات اور قرآن و حدیث کے مضامین خاصا کچھ نکال لیا۔ اب ڈاکٹر صاحب کا تقاضا تھا کہ جلدی سے مقالہ مکمل کر کے جمع کراؤ، لیکن ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ اچھی ملازمت ملے تو پھر پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کرائیں۔ ایک روز والد صاحب آتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ نالائق ہے، اس کی وجہ سے شرمندگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ مقالہ مکمل ہے، جمع کیوں نہیں کراتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو فوٹو اسٹیٹ ہوتا تھا اور نہ ہی اردو کا اچھا ٹائپ رائٹر ملتا تھا پھر جو لکھنے والے ملتے وہ بھی عربی سے ناواقف، کام مکمل ہو تو کیسے ہو۔ بمشکل تمام اسکول کے ایک ماسٹر صاحب تیار ہو گئے۔ انھوں نے بڑی محنت سے کاربن رکھ کر چار کاپیاں تیار

گیں۔ بس والد صاحب تو بقول شخصے ڈنڈا لے کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کی قبر کو کشادہ کرے اور ڈاکٹر صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، ان کو ہر طرح صحت وعافیت میں رکھے اور ہمیں ان سے بھرپور استفادے کا موقع مرحمت فرمائے۔ آمین۔ (میں نے جب یہ لکھا تھا، ڈاکٹر صاحب حیات تھے۔)

قرآنِ مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورۃ التوبہ میں ارشاد ہوا ہے:

حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر صاحب بھی اپنے شاگردوں کی علمی ودینی ترقی میں حریص (شدید آرزومند) ہیں۔ میرا دو سال میں کام مکمل ہو گیا چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے خاص اجازت نامہ حاصل کر کے مقالہ جمع کرایا اور ۱۹۷۴ء میں ڈگری مل گئی۔

استادِ محترم کو دین سے والہانہ شغف تھا۔ وہ زبان و ادب کے پروفیسر تھے، افسانہ، ڈرامہ، شاعری غرض مختلف النوع مضامین اس کے دائرے میں آتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے خود بھی قرآن وحدیث اور ادب کے حوالے سے بڑا وقیع کام کیا، اسی حوالے سے طلبہ سے بھی کام کرایا، مثلاً ''اردو میں قرآنی تراجم وتفاسیر''، ''اردو میں احادیثِ نبویہ کے ترجمے اور تعلیقات''، ''اردو میں قرآنی محاورات''، ''اردو میں قرآنی تلمیحات''، ''اردو داستان پر قرآنی اثرات'' وغیرہ؛ یہ موضوعات دین ودنیا دونوں ہی لحاظ سے مفید ہیں، صدقہ جاریہ میں آتے ہیں۔ یقیناً اس کا اجر ڈاکٹر صاحب کو ملتا رہے گا، یہی اصل کامیابی وکامرانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ڈاکٹر صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سے بھی ایسا کام لے لے جو صدقۂ جاریہ میں آتا ہو۔ آمین ثم آمین۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ کی زندگی کھلی کتاب ہے، سنت کے مطابق ڈھلی ہوئی۔ ان کے روزمرہ کے معمولات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں گزرتے تھے۔ ہر لمحہ یہ خیال دامن گیر رہتا کہ کوئی عمل خلاف سنت نہ ہو۔ میرے سامنے کی بات ہے ایک صاحب نے تیل پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، میں تیل استعمال نہیں کرتا۔ پھر پوچھنے لگے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیل استعمال کرتے تھے۔ حاضرین میں سے ایک دو نے اثبات میں سر

بتا دیا تو پھر ڈاکٹر صاحب نے وہ تیل رکھ لیا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے، ہم سب کلاس کے باہر ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہے ہوتے۔ سامنے ہی میدان عبور کر کے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا دروازہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب شیروانی میں ملبوس، ترکی ٹوپی پہنے تشریف لاتے۔ نظریں نیچی، قدم جما جما کر نہایت احتیاط سے راستہ طے کرتے اس وقت قرآنِ کریم کی یہ آیت یاد آ جاتی:
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔ (رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں۔) حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت احتیاط سے اس طرح قدم جما کر چلتے جیسے کوئی نشیب میں اترتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک سطر میں جتنی مرتبہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آتا تو پورا "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھتے۔ اگر کوئی طالبِ علم محمد مصطفےٰ ''ص'' یا صلعم لکھ دیتا تو سخت ناراض ہوتے، فرماتے، ساری کنجوسی اسی میں رہ گئی۔

ڈاکٹر صاحب جوانی سے ہی بڑے عبادت گزار تھے، طالبِ علمی کے زمانے میں بھی تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ تقلیلِ طعام و منام کا معمول ہمیشہ رہا۔ بزرگانِ دین سے غیر معمولی لگاؤ رکھتے تھے۔ نقش بندیہ سلسلے سے وابستہ، حضرت شاہ زوار حسین شاہ صاحب کے خلیفہ ہیں۔ لوگ ان سے بیعت ہوتے تھے، مگر ہم سے کبھی نہیں کہا۔ بس تلقین کی تو یہی کہ سنت کے مطابق زندگی گزاریں۔ جب میں نے ڈاڑھی رکھ لی تو ڈاکٹر صاحب اتنے خوش ہوئے جس کی کوئی حد نہیں مجھے دیکھ کر ساری محبت، سارا پیار ان کی نظروں میں سمٹ آیا اور مجھے اس طرح چومنے لگے جیسے گائے اپنے بچے کو اس وقت چومتی ہے جب وہ دیر کا بچھڑا ہوا اس سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں سے جیسی محبت کرتے تھے اس کو دیکھتے ہوئے یقین ہے کہ وہ اپنے تمام شاگردوں کے لیے دعا کرتے ہوں گے اور ان دعاؤں کے طفیل ہم بہت سی آفتوں اور پریشانیوں سے محفوظ ہیں۔ میں نے تو اب آخر میں ڈاکٹر صاحب سے تجدید بیعت بھی کر لی تھی۔

تاریخ پر نظر ڈالیے، اہلِ کمال کے حالات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ صاحب کمال کے رابطے بھی صاحب کمال سے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دور کی معتبر شخصیتوں سے استفادے کے لیے

بے تاب رہتے ہیں۔ یہی حال ڈاکٹر صاحب کا بھی تھا اپنے دور کی اکثر متقدر شخصیتوں سے آپ کے روابط رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، پروفیسر ضیاء الدین احمد بدایونی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، حافظ محمود خان شیرانی، پروفیسر سر محمد شفیع اور مولوی عبدالحق وغیرہ سے علمی وادبی مسائل کے استنباط میں ڈاکٹر صاحب پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علم قرأت وتجوید میں قرأۃ عشرہ کی اپنے زمانے کے نامور قاری ضیاء الدین احمد سے سند حاصل کی جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے شاگرد تھے، اسی طرح قاری عبدالخالق صاحب سے استفادہ کیا، غرض جہاں سے موقع ملا علم حاصل کیا اور پھر خود بھی اہلِ کمال میں ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند فرمائے۔ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اُن کا ۲۰۰۵ء میں انتقال ہو گیا، لیکن ہمارے باطن میں وہ سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اُن کا فیض اب تک جاری ہے۔ امید ہے کہ جب کبھی ہمیں اصلاح یا ہدایت کی ضرورت ہوگی، اُن کا فیض ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ أَصْلِحْ لِی دِینی الَّذی هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِی، وَأَصْلِحْ لِی دُنْیَایَ الَّتِی فِیهَا مَعَاشِی، وأَصْلِحْ لِی آخِرَتِی الَّتی فِیهَا مَعادِیْ، وَاجْعَلِ الْحَیاةَ زِیَادَةً لِّی فِی کُلِّ خَیْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لی مِنْ کُلِّ شَرٍّ۔

پیش کش: زمن حمع خانہ بخ

☆☆☆

محمد عبدالرحیم خاطرؔ

(المتوفی: ۱۹۵۴ء)

میں نے اپنے دادا محمد عبدالرحیم خاطرؔ خوش رقم کو بڑھاپے کی آخری منزل میں دیکھا ہے۔ کشیدہ قامت سرخ وسپید رنگ، موٹی موٹی اور لمبی لمبی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، کھڑی ناک، بڑے ہی خوب صورت آدمی تھے، اُس وقت غالباً اسّی کے پیٹے میں ہوں گے۔ موٹے موٹے شیشوں کی عینک، مٹھ والا لٹھ ہاتھ میں۔ بیڑی پیا کرتے تھے۔ مجھے بیڑی دیتے اور ساتھ ہی چشمہ بھی اتار کر دے دیتے تھے کہ اس سے دھوپ میں بیڑی سلگا لاؤ۔ میں اس جستجو میں اکثر اپنے ہاتھ جلا لیا کرتا تھا کہ convexlence کا دائرہ توجہ ہٹنے سے ہاتھ پر آجاتا تھا۔ لمبا کرتا پہنتے تھے، اتباعِ سنّت میں گریبان کھلا رکھتے تھے، غالباً بٹن ہی نہیں لگواتے تھے۔ بڑے متقی پرہیز گار آدمی تھے۔

۱۹۴۸ء میں جے پور سے پاکستان آئے۔ کراچی رام سوامی کے ایک فلیٹ میں قیام کیا۔ چچا تایا سب ساتھ ہی تھے البتہ میرے والد صاحب نہیں آئے تھے۔ دو سال بعد ہم بھی آگئے اور اسی فلیٹ میں قیام کیا۔ کیا زمانہ تھا اور کسمپرسی کا عالم تھا دو کمروں کا فلیٹ ہم سب اسی میں رہتے تھے، پندرہ نفر تو تھے ہی اور لطف یہ کہ بہت بڑا کتب خانہ بھی ساتھ تھا، دس پندرہ ہزار کتابیں تو ہوں گی۔ بعد میں میرے والد، دادا اور چچا، پی این ٹی کالونی میں منتقل ہو گئے اور دادا کا کتب خانہ بھی ساتھ تھا۔ صرف مولانا نعمانی وہاں رہے اور ان کا کتب خانہ۔ مجھے یاد ہے لوہے کے بکسوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اونٹ گاڑی پر لدوا کر پی این ٹی کالونی منتقل ہوئے تھے۔ میں بھی کتابوں کے ساتھ اونٹ گاڑی پر بیٹھا تھا۔

سب انھیں ابا میاں کہتے تھے۔ ابا میاں سے میں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی

ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، وہ نظموں کو تو زبانی یاد کرایا کرتے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ اسباق کو بھی اتنی مرتبہ پڑھاتے کہ وہ تقریباً زبانی یاد کے برابر ہو جاتا تھا اور جب سنتے تو قرآن کی طرح زیر زبر پیش کی بھی غلطی نہ ہو اور اگر غلطی آجاتی تو چٹکی سے کھال کو پکڑ کر گھما دیتے بس جان ہی تو نکل جاتی۔ یہ تو خیر ہمارے دادا تھے کس کی مجال تھی کہ کوئی کچھ بول سکے۔ ورنہ اس دور کے عام اساتذہ کا یہی حال تھا۔ والدین بچّے کو استاد کے سپرد کرتے اور کہہ دیتے کہ گوشت گوشت آپ کا، ہڈّی ہڈّی ہماری۔ اللہ تعالیٰ ان اساتذہ کو جزائے خیر دے، وہ اس پر پورا پورا عمل کرتے تھے۔ فارسی عربی گرامر بصورتِ نظم زبانی یاد کرادیتے تھے۔ پہاڑے، یعنی tables آدھے پونے سے لے کر بیس تک، اور ریاضی کے فارمولے زبانی یاد کراتے تھے۔ جادو چند چکرورتی کی ریاضی کی کتاب، جو خاصی موٹی تھی، پوری کی پوری ذہن میں اتار دیا کرتے تھے۔ سمجھانے کا کوئی سوال نہیں، بس طوطے کی طرح رٹایا کرتے تھے۔ جس میں غلطی کسی قیمت پر روا نہ تھی۔

آج علم کے مختلف شعبوں میں بہت ترقّی ہوگئی ہے۔ نفسیات نے بہت سی گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ نت نئے تعلیمی نظریات کے تحت عملی نمونے قائم کیے گئے ہیں۔ ان کے مطابق بچّوں کو طوطے کی طرح رٹانے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور ایسے اقدامات کی ہدایت کی گئی ہے کہ بچّوں کو رٹانے کی بجائے ان کے ذہین میں اصول بٹھائے جائیں۔ آج مجھے بیالیس سال پڑھاتے ہوئے ہوگئے، میں نے پرائمری کے بچّوں کو بھی پڑھایا ہے۔ میں بڑی ذمّے داری سے کہتا ہوں کہ حصولِ علم کا جتنا مؤثر طریقہ پرانا تھا، آج کا نہیں ہے۔ زبانی یاد کیا ہوا نقش کالحجر ہو جاتا ہے۔ کبھی جاتا ہی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نعمانی سے قدیم تعلیم کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے، میاں پرانے اساتذہ کو کتابیں زبانی یاد ہوا کرتی تھیں۔ ابا میاں کو گلستاں بوستاں زبانی یاد تھی، انھیں کتاب کھولنے کی حاجت نہیں ہوتی تھی یہی وہ اپنے طالبِ علم سے چاہتے تھے۔

ابا میاں بیٹوں کی طرح خود بہت بڑے محدّث یا عالم تو نہ تھے۔ ہاں، پڑھے لکھے آدمی ضرور تھے۔ عربی و فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ صاحبِ ذوق تھے، بہت اچھا

کتب خانہ فراہم کیا تھا۔ جس میں تفسیر، حدیث وفقہ اور ادب وانشا سب قسم کی کتابیں تھیں۔ مجھے یاد ہے، ''طلسم ہوش ربا'' کی ضخیم جلدیں بھی موجود تھیں۔ فارسی تو وہ پڑھاتے بھی تھے۔ فارسی میں گلستاں و بوستاں تو بہت آسان ہیں، مگر اور دوسری کتابیں ''چشمۂ شیریں''، ''انشائے مادھورام''، ''انشائے ابوالفضل''، ''اخلاقِ جلالی''، ''قصائدِ عرفی، خاقانی، قاآنی اور ''نل دمن'' وغیرہ تو جان لے لیتی ہیں۔ اچھی خاصی استعداد والا ہی انھیں پڑھا سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کو پڑھانے والے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے، الا ماشاء اللہ۔

ابا میاں شاعر بھی تھے اور اعلیٰ درجے کے خوش نویس بھی۔ خطاطی میں منشی ہیرالال مونس کے شاگرد تھے۔ جن کا سلسلہ دہلی کے مشہور خطاط محمد امیر رضوی پنجہ کش دہلوی سے ملتا ہے۔ ابا میاں کا خط نہایت پاکیزہ تھا، خفی وجلی یکساں لکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے دوائر و مدات، کرسی و نشستِ الفاظ دیدنی ہے۔ وہ وصلیوں میں مختلف صنعتیں بھی پیدا کرتے تھے۔ ان کی وصلیاں دیکھنے کے بعد قدیم خطاط کی یاد تازہ ہو جاتی ہے بقولِ حضرت شاہ نفیس الحسینی: ''منشی عبدالرحیم آقائے دیلمی کی روش خط کے مقلد ہیں۔''

عام طور پر نستعلیق لکھنے والے نسخ وغیرہ میں کمزور ہوتے ہیں، مگر ابا میاں نسخ و نستعلیق اور شکستہ وغیرہ یکساں لکھ لیتے تھے۔ ابا میاں جے پور کے گراں ترین خطاط تھے۔ مطبع رحیمی کے نام سے ایک پریس بھی قائم کیا تھا۔ جس میں متعدد کتابیں طبع ہوئیں۔ ان میں ایک کتاب ''مرآۃ الانساب'' بھی تھی۔ جے پور کے ایک رئیس واجد علی خاں نے مولوی ضیاء الدین احمد امروہوی سے زر کثیر خرچ کر کے لکھوائی۔ پھر اس کی کتابت ابا میاں سے کرائی۔ جناب خسروی صاحب نے ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک کے اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے میں اس پر ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کتاب کی تکمیل تحریر کے بعد اس کی کتابت کے لیے جے پور کے بہترین وگراں ترین خوش نویس خطاط محمد عبدالرحیم کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں کے مطبع رحیمی واقعہ ترپولیہ بازار جے پور میں ایک سو اٹھاسی صفحات میں جہازی سائز، دبیز حنائی اور گلابی کاغذ پر طبع کرائی۔

خسروی صاحب کا بیان ہے کہ مولوی عبدالرحیم خطاط اور اللہ بخش نقاش نے اس پر اپنا پورا فن صرف کر دیا تھا۔ ابا میاں نہ صرف بہترین لکھتے تھے، بلکہ اس فن میں بصیرتِ کامل بھی رکھتے تھے۔ مولانا نعمانی مرحوم نے ''نادر مخطوطات'' کے عنوان سے ماہنامہ ''فاران'' کراچی جنوری ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ اس میں رقم طراز ہیں:

> والد مرحوم خوش نویس ہونے کے ساتھ صاحب نظر بھی تھے، ان کی نقد و بصیرت کا یہ عالم تھا کہ وصلی دیکھتے ہی یہ بتا دیتے تھے کہ یہ کس دور کے خطاط کا قلم ہے۔ قدماء و متوسطین و متاخرین غرض ہر دور کے خطاطوں کی روشِ قلم اور شیوۂ خط کو پہچانتے تھے اور ان کی خصوصیات کو اچھی طرح واضح کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں وصلیاں خلط ملط ہو گئیں اور وصلی پر کاتب کا نام درج نہ تھا، مگر انھوں نے اپنے ذوقِ فن اور بصیرتِ خط کی بنا پر پھر سب کو علاحدہ علاحدہ کیا اور ان کے باہمی فرق پر روشنی ڈالی۔

ابا میاں بڑے صاحب ذوق تھے۔ قدیم اساتذہ کی وصلیاں انھوں نے جمع کی تھیں اور اچھا خاصا ذخیرہ انھوں نے فراہم کر لیا تھا۔ ان وصلیوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی انھیں فروخت نہیں کیا۔ اب وہ ذخیرہ سب غتر بود ہو گیا۔ بس اس پر مولانا نعمانی کا مذکورہ مضمون یادگار رہ گیا ہے۔ میرے پاس رف کاغذ پر ابا میاں کی کچھ مشقیں ہیں جن پر منشی ہیرالال نے اصلاحیں دی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابا میاں نے اس فن کے حصول کے لیے کیسی محنت کی تھی۔ والد صاحب رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ ابا میاں نے سالوں ہیرالال جی کے پاس مشق کی ہے۔ بلا شبہہ محنت کے ثمرات ہوتے ہیں کہ آدمی کندن بن جاتا ہے اور کاملوں میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے۔ موقع ملا تو ان شاء اللہ ان مشقوں کو اسی طرح طبع کرائیں گے کہ معلوم ہو سکے کہ پرانے لوگ جلی خط میں بھی قلم برداشتہ لکھ لیا کرتے تھے۔ آج کے دور کی طرح وہ مستر وغیرہ کے محتاج نہیں تھے اور نہ ہی وہ جیومیٹری کے آلات سے ناپ تول کر حروف کو شکل دیتے تھے۔

ابا میاں کے ہاتھ کی جلی قلم سے لکھی ہوئی شیخ سعدی کی کریما چھوٹے چچا محمد عبد العظیم مظفر لطیف صاحب نے شائع کر دی ہے اس کی کتابت ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کی ہے۔

والد صاحب نے اور مولانا نعمانی دونوں نے ابا میاں سے اس فن میں اصلاح لی اور والد صاحب نے تو بطورِ خاص اس فن پر خاصی محنت کی۔ ابا میاں کے ساتھ ساتھ اپنے تایا حافظ محمد عبد الکریم صاحب سے بھی اصلاح لی۔ یہ بھی اس فن میں بڑے کامل تھے۔

ابا میاں خطّاط کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ خاطر تخلص فرماتے تھے، ان کی شاعری زیادہ تر حمد ونعت پر مشتمل ہے۔ سادہ وصاف زبان استعمال کرتے ہیں، مضمون میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اور نہ ہی استعارات وتشبیہات اور دوازکار تراکیب کی بھرمار ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات واحساسات کو لفظوں میں بے تکلف سمیٹ لیتے ہیں ان کا اکثر کلام حمد ونعت پر مشتمل ہے۔ جس میں عقیدت ومحبت کی جھلک نمایاں ہے اور کیوں نہ ہو کہ ان کی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے سرشار رہی ہے۔ حمد کے اشعار دیکھیے:

عمر گزری ہے گنہ کرتے مجھے
میں ہوں عاصی اور تُو غفار ہے
ہوگی طے کس طرح راہِ پلِ صراط
سر پہ عصیاں کا بہت سا بار ہے
کچھ نہ کی نیکی اے خاطر جز بدی
اس کی رحمت پر ہی بیڑا پار ہے

نعت کے کچھ اشعار یہ ہیں:

سلامُ اللہ و صلی اللہ اے فیضانِ ربانی
تری صورت سے ظاہر ہے مکرم رحم و رحمانی
ترے دربارِ اقدس میں ہر ایک کو باریابی تھی
نہ پہرہ تھا، نہ چوکی تھی، نہ حاجب تھا نہ دربانی
تری وہ شان ارفع ہے کہ جبریل امیں جیسے
کیا کرتے تھے آ آ کر خوشامد سے مگس رانی

ذرا توفیق دے تم کو تو اے خاطرؔ کبھی تم بھی
شریکِ بزمِ اقدس ہو کے کرلو قلب نورانی

فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس نعت میں روانی و برجستگی اور عقیدت و محبت دیدنی ہے:

اے شہنشاہ جمال و اے کمال دلبری
وہ شہِ خوبانِ عالم، سرورِ پیغبری
ہر دو عالم جاں نثارِ نرگس شہلائے تو
نرگسِ بیمار کے آرد بچشمت ہم سری
خادمِ درگاہِ والائے تو جبریلِ امیں
عاشقِ شیدائے تو جنّ و بشر حور و پری
جلوۂ معراجِ تو اندر مکان و لامکاں
از ملک ہم بہتری از انبیا شد برتری
حضرتِ موسیٰ کلیم اللہ شد بر کوہِ طور
تو کلیم اللہ شدی بر عرشِ خاصِ داوری
قم باذنی و انا الحق خود ازیں جا گفتہ اند
در دلِ منصور و شمسی کردہ ای جلوہ گری
ایں تمنّا دار خاطرؔ از خدائے لایزال
بہرِ خلاّقِ جہاں بر سُوئے عاصی بنگری

ابا میاں بڑے متقی و پرہیز گار انسان تھے۔ ہر لمحہ اتباعِ سنّت کا خیال دامن گیر رہتا تھا۔ جوانی سے ہی عبادت وریاضت میں مشغول رہے۔ کہتے ہیں، اوّل رات سو جاتے تھے، مگر جب آنکھ کھلتی، رات ایک بجا ہو، دو بجے ہوں، مسجد روانہ۔

یہ لوگ بھی عجب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا

وہ اسلام سے بے انتہا محبت اور شدید قسم کی وابستگی رکھتے تھے۔ جدید تعلیم کے زیر اثر

ہندوستان میں پہنچنے والی مغربی تہذیب سے سخت متنفر تھے، اس کے اثرات کا انھیں بخوبی ادراک تھا جو نسلاً بعد نسل مرتب ہونے والے تھے اور جن کو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جدید تعلیم کے مقابلے میں اپنی اولاد کے لیے قدیم علوم کو ہی ترجیح دی اور انھیں قرآن و حدیث کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ یہ انھیں کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ ان کی اولاد نہ صرف ان علوم میں نمایاں ہوئی بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی نمایاں ہوئی۔

ابا میاں تصوّف سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ مولانا رومیؒ سے بیعت تھے جن کا سلسلہ حضرت شاہ نیاز بریلویؒ سے ملتا ہے۔ انھیں خلافت بھی عطا ہوئی تھی، مگر کسی کو بیعت نہیں کیا۔

ابا میاں آخیر عمر تک چاق و چوبند رہے والدۂ محترمہ نے ان کی بڑی خدمت کی، ان کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتیں، ہر وقت ان کے کام کے لیے مستعد رہتیں۔ وہ بھی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ اپنی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ پی این ٹی کالونی میں جب ہم تھے روزانہ عصر کے بعد مجھے اور میری بہن کو لے کر کلفٹن کے ساحل تک جاتے۔ انھیں الحمدللہ کوئی عارضہ نہیں تھا۔ ایک روز میری بڑی پھوپھی عائشہ اہلیہ پروفیسر محمد عبدالمغنی صاحب کے ہاں بہار کالونی گئے دوسرے دن واپس آئے تو طبیعت خراب ہوئی، متلی وغیرہ ہونے لگی، دل میں درد بتانے لگے۔ اس زمانے میں دورۂ قلب وغیرہ سننے ہی میں نہیں آتا تھا۔ معمول کی بیماری سمجھ کر زیادہ توجہ نہیں دی، دوسرے روز اتوار تھا، والد صاحب نے ڈاکٹر کو دکھایا اور دوا لے آئے عجب اتفاق دیکھیے، چھٹی کا دن ہوتے ہوئے والد صاحب اور چچا اپنے مختلف کاموں کے لیے چلے گئے۔ گھر میں والدہ اور ہم چھوٹے بچے تنہا تھے۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ابا میاں لیٹے ہوئے تھے، عصر کا وقت قریب تھا یا اذان ہو چکی تھی، مجھ سے مٹی کا ڈیلا منگوایا۔ تیمم کیا، لیٹے لیٹے ہی کانوں تک ہاتھ اٹھا کر نیت باندھ لی اور بس رخصت ہو گئے۔ میں اور میری والدہ پاس ہی تھے۔ چھوٹے چچا مظفر لطیف صاحب آئے اور فوراً ہی حوائج ضروری کے لیے چلے گئے، شاید تقاضا شدید تھا۔ جب ابا میاں کو ساکت و صامت دیکھا تو والدہ نے انھیں جھنجھوڑا اور گھبرا کر چچا میاں کو آواز دی۔ اب کیا تھا، روح

قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ہاتھ بدستور ناف پر بندھے ہوئے تھے۔ اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَاِنَّـا اِلَيْهِ رَاجِعُون۔

مولانا نعمانی کراچی سے باہر تھے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ ان کے انتظار میں میت کو رات بھر رو کے رکھا، مگر اللہ کو منظور نہ تھا انھیں اطلاع نہ ہو سکی اور دوسرے روز اس وقت پہنچے جب ہم دفنا کر واپس آ رہے تھے۔ عجیب اتفاق دیکھیے وہاں قبرستان پہاڑی پر واقع تھا شاید اب بھی ہو۔ پتھریلی زمین کھودنا انتہائی مشکل تھا، مگر قبر نہایت آسانی سے کھود لی گئی۔ گورکن کہتا تھا، کون اللہ کا نیک بندہ ہے کہ مجھے قبر کھودنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ اللہ کے نیک بندے اپنی حیات میں بھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے اور موت کے بعد بھی ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَسْأَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّکَ، وَالعَمَلَ الَّذِی يُبَلِّغُنِی حُبَّکَ؛ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ أَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِی وَأَهْلِی وَمِنَ المَاءِ البَارِدِ۔

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ

۲ محرم ۱۳۵۹ھ

☆☆☆

مولانا سیّد محمد طلحہ حسنی

(۱۸۹۰ء۔۱۹۷۰ء)

دورِ غلامی کے ہندوستان میں عربی ادب سے متعلق تین شخصیات کو بڑی شہرت ملی۔ ایک مولانا عبدالعزیز میمنی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ تھے۔ دوسرے مولانا محمد سورتی صاحب جو جامعہ ملیہ سے تعلق رکھتے تھے اور تیسرے ہمارے مولانا سیّد طلحہ حسنی یہ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ عربی سے کم وبیش چالیس سال متعلق رہے ہیں۔ عربی زبان وادب کا کون سا ایسا طالبِ علم ہوگا جو اِن نابغۂ روزگار شخصیتوں کو دیکھنے اور ملنے کا آرزومند نہ ہوگا۔ ان تینوں میں ابھی تک مولانا میمنی کو دیکھا تھا۔ والد صاحب، مولانا طلحہ صاحب کے شاگرد تھے۔ وہ جب ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے تو مولوی فاضل کا امتحان دینے کے لیے لاہور پہنچے، اس زمانے میں علوم شرقیہ میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کی بڑی شہرت واہمیت تھی اور ذی استعداد طالبِ علم دور دراز کا سفر کر کے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل یا منشی فاضل کا امتحاں پاس کرتے۔ ۱۹۳۹ء میں والد صاحب نے مولانا طلحہ صاحب سے مولوی فاضل کا نصاب پڑھا چناں چہ اکثر وبیش تر مولانا کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر جب علم عروض سے مجھے دلچسپی ہوئی تو ''محیط الدائرہ'' پڑھنے کا اتفاق ہوا، ''محیط الدائرہ'' تو ہم کیا خاک سمجھتے، البتہ مولانا طلحہ صاحب نے اس کی تلخیص کی تھی، اس کی مدد سے پڑھا۔

مولانا طلحہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی شاگردوں میں سے تھے جب مولانا سیّد محمد علی مونگیریؒ ناظم، مولانا حکیم سیّد عبدالحئی صاحب نائب ناظم، مولانا شبلی نعمانی معتمد اور ان کے استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی صدر مدرس تھے، سیّد سلیمان ندوی وغیرہ طالبِ علم تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ٹونک میں مولانا سیف الرحمٰن مہاجر کابلی اور حضرت شیخ حیدر حسن خاں

صاحب سے تعلیم کی تکمیل کی۔ وہ عربی زبان وادب کے بڑے فاضل تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں انھیں عربی اشعار یاد تھے، حماسہ تو تقریباً از بر تھی اور فارسی و اردو شعراء کا کلام بھی نوک زبان تھا۔ خداداد حافظہ پایا تھا۔ انگریزی میں بھی متعدد کلاسیکی شعراء و ادباء کے فقرے کے فقرے بے تکلف سنا دیا کرتے تھے۔ صرف ونحو، معنی و بیان اور اعجاز القرآن وغیرہ علوم پر ان کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور ناقدانہ نظر بھی رکھتے تھے۔

مولانا بڑے خوش مزاج آدمی تھے، بذلہ سنج اور لطیفہ گو واقع ہوئے تھے اور طلبہ کے درمیان بھی اس صفت کا بے تکلف اظہار فرمایا کرتے تھے۔ والد صاحب فرماتے تھے ایک مرتبہ کسی صاحب کے آنے کی خبر آئی ہم اس وقت مولانا سے بیضاوی پڑھ رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا، دیکھو، میں تم سے کہوں گا کہ ضیافت کے لیے فلاں فلاں چیز لے آؤ، مگر تم اس پر زیادہ توجہ نہ دینا، سنی اَن سنی کر جانا۔ وہ صاحب تشریف لائے، مولانا بہت محبت سے ملے، مولانا نے ہم سے کہا، بھئی ان کے لیے فلاں فلاں چیزیں لاؤ۔ وہ فرمانے لگے، آپ سے ملاقات مقصود تھی، اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ غرض وہ چلے گئے اور مولانا بہت دیر مسکراتے رہے۔ جب میں فارغ ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد پھر لاہور جانا ہوا، مولانا کی خدمت میں پہنچا تو مولانا نے طلبہ سے کہا، ارے بھئی، دیکھتے نہیں ہو آغا میاں آئے ہیں ان کے لیے لسّی لاؤ، فلاں فلاں چیز لاؤ، اتنی دور سے آئے ہیں۔ مجھے طالب علمی والی بات یاد آ گئی، میں نے کہا، حضرت ان کو کیوں تکلیف دیتے ہیں میں خود ہی اپنے لیے اپنی من پسند چیز لے آؤں گا، چناں چہ وہ مسکرا دیے اور فرمایا، تجھے اب تک یاد ہے، پھر بہت ہی محبت سے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔

غرض گھر میں اس قدر مولانا کا تذکرہ تھا کہ ہم ان کے علم وفضل، ذہانت وذکاوت اور زہد و ورع کے قائل ہوتے چلے گئے اور ان جانے میں ان کی شخصیت کو ایسا جذب کیا کہ ان پر بے تکان اس طرح گفتگو کر سکتے تھے جیسے کہ ہم برسوں ان کی شاگردی میں رہے ہوں، لیکن دیکھنے یا ملاقات کا اب تک اتفاق نہیں ہوا تھا۔

۱۹۷۰ء کی بات ہے عم محترم مولانا نعمانی کے بڑے صاحبزادے محمد عبدالمعید کے انتقال کے موقع پر والد صاحب کراچی تشریف لائے میں پہلے ہی سے کراچی آیا ہوا تھا۔ ایک

دن والد صاحب نے چھوٹے چچا مظفر لطیف صاحب سے کہا کہ چلو، مولانا طلحہ صاحب سے مل آئیں۔ میں نے کہا، میں بھی چلوں گا، مجھے بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ غرض ہم والد صاحب کے ساتھ دار التصنیف گئے۔ یہ ایک ادارہ تھا جو ماری پور روڈ پر واقع تھا اور مولانا طفیل احمد صاحب کی سرپرستی میں چلتا تھا جب ادارے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا مولانا قہوہ خانے میں تشریف فرما ہیں۔ وہاں پہنچے وہ قہوہ خانہ کیا تھا ادارے کی مسجد سے متصل ایک دکان تھی جس میں دو بینچیں پڑی تھیں اور کسی نے یہاں کے لوگوں کے لیے چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں دیکھا ایک بہت ہی بوڑھے بزرگ میلی سی ڈاڑھی نحیف و نزار سے بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک پیالے میں چائے ہے اور وہ اس میں ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھا رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر قطعی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی بڑا عالم یا فاضل روزگار شخص ہے۔ بس پرانی وضع کا ایک ان پڑھ بوڑھا آدمی محنت و مزدوری کر کے بیٹھ رہا ہے۔ والد صاحب نے سلام کیا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے، ''آؤ آغا میاں'' پرانے بزرگ والد صاحب کو یہی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے مولانا کی آواز بھرآ گئی، والد صاحب پر کیا گزری اس کا میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ والد صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے، ''میاں اتنے بڑے بال تو تمھارے دادا نے بھی نہیں رکھے۔ والد صاحب ان سے باتیں کرتے رہے اور میں حیرت و استعجاب میں مستغرق یہی سوچتا رہا کہ یہ ہیں مولانا طلحہ صاحب جن کا ہم نے ذکر سنا تھا اور پڑھا تھا، یہ ہیں مولانا طلحہ صاحب جو ابوالحسن ندوی کے پھوپھا اور استاد ہیں، یہ ہیں مولانا طلحہ صاحب جو اپنے وقت کے نامور اہلِ علم و کمال سے روابط و تعلّقات رکھتے تھے، ان میں مولانا عبدالعزیز میمنی، علاّمہ سر محمد اقبال، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا داؤد غزنوی، حافظ محمود خاں شیرانی، خوجہ دل محمد، علاّمہ تاجور نجیب آبادی، عبداللہ چغتائی، گاما پہلوان وغیرہ شامل تھے۔ جیسا ان کی شخصیت کا تأثر دل و دماغ پر قائم تھا وہ سب یک لخت مسمار ہو گیا۔ خیال ہوا کہ یہ ایک بڑے ادارے وابستہ تھے اس لیے شہرت مل گئی اور کچھ نہیں۔ یہ ہماری کیسی نادانی و ناسمجھی تھی کہ آدھے گھنٹے کی ملاقات میں نگاہ کا زاویہ بدل گیا اور محترم و معتبر شخصیت لمحوں میں اپنے خدوخال سمیت نامعتبر ہو گئی۔ غرض اس ملاقات سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اب

ہمارا سارا جوش، سارا اشتیاق ختم ہوگیا تھا، ان کی گفتگو پر گیا توجہ دیتے بیزاری سی ہونے لگی تھی۔ جب والد صاحب نے چلنے کا ارادہ کیا تو مولانا نے فرمایا، عبدالرشید کے ساتھ ایسا سانحہ پیش آیا ہے، میں بھی تعزیت کرنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ تم مجھے واپس یہاں پہنچا کر جاؤ۔ والد صاحب نے فرمایا، حضرت کیوں نہیں۔ اس طرح ہم مولانا کے ساتھ مولانا نعمانی کے گھر رام سوامی پہنچے۔

مولانا نعمانی کے ہاں اس وقت بہت سے علماء موجود تھے۔ مولانا محمد یوسف بنوری اور حکیم مختار حسن صاحب کو تو ہم پہچانتے ہی تھے، ان کے علاوہ اور بھی لوگ وہاں موجود تھے۔ مولانا طلحہ صاحب کے پہنچتے ہی تمام حضرات دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ تھوڑی دیر میں علمی گفتگو شروع ہوگئی، وہاں موجود ہر شخص اتنے انہماک اور توجہ سے اس گفتگو کو سن رہا تھا کہ کوئی لفظ سماعت کے دائرے سے نہ نکل جائے۔ وہاں ملتان سے آئے ہوئے ایک انگریزی کے پروفیسر صاحب نے پکھتال کے ترجمے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس پر مولانا نے جو گفتگو کی اس کا ایک ایک لفظ معلومات کا گنجینہ تھا، اس سے ان کے گہرے مطالعے، وسعت معلومات اور بالغ نظری کا پتا چلتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اُمہات الکتب سے لے کر عصر حاضر کی سیکڑوں کتابیں انھیں مستحضر تھیں۔ ان کی گفتگو عربی زبان وادب کے اسرار و رموز پر گہری نظر اور جچی تلی رائے کو ظاہر کرتی تھی، وہ استدلال کے طور پر عربی اشعار اور انگریزی ادب کے ٹکڑے پیش کرتے جاتے تھے، یہ نقشہ اور یہ صورتِ حال دیکھ کر بس سکتے کی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ اب معلوم ہوا کہ اہلِ علم و اہلِ کمال کے درمیان شہرت ایسے ہی نہیں ہو جاتی بلکہ کچھ گرہ میں علم کے جواہر پارے ہوتے ہیں تو لوگ اس کی علمی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک قدر و منزلت کا معیار صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ شخصیت ظاہر طور پر کر و فر سے اپنے عالم و فاضل ہونے کا یقین دلائے، لیکن آج سے نصف صدی پیش تر تقویٰ و پرہیزگاری کا ایک خاص معیار قائم تھا جو جتنا بڑا صاحب علم ہوتا تھا اتنا ہی تقویٰ و پرہیزگاری میں کامل تھا، سادگی کا دور دورہ تھا اپنے دامن میں علم وفن کے گہرے آب دار رکھنے کے باوجود اپنے

آپ کو چھپاتے تھے، اپنے فضل و کمال پر پردہ ڈالے رکھتے تھے۔ لیکن طالبانِ علم پر تمام گوہر نچھاور کرنے میں بے دریغ ہو جاتے تھے اور سلف صالحین کی زندگی کا عملی نمونہ بن کر دکھاتے تھے۔ اس لیے ان کو دیکھ کر ہم مادہ پرست ان کی خوبیوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ان کو سمجھنے کے لیے چشم باطن وا ہونی چاہیے۔ صائب نے کیا خوب کہا ہے:

بنورِ شمع حاجت نیست چوں خورشید طالع شد

دلِ بینا چو داری، دیدۂ بینا چہ می خواہی

☆☆☆

مولانا شاہ فضل اللہ الصّمد

(۱۹۱۳ء-۱۹۷۹ء)

ایک روز کسی صاحب نے حیدرآباد میں دروازے پر دستک دی۔ میں ہی باہر نکلا، دیکھا کہ ایک صاحب دراز ریش، میانہ قد، گھٹنوں سے نیچے دو لمبے کرتے پہنے ہوئے، گریبان کھلا ہوا، عمامہ سر پر، ہاتھ میں بید لیے کھڑے ہیں، سیدھے سادے، پرہیزگار نیک بزرگ۔ دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ میرے دادا کے دوستوں میں سے ہوں گے۔ فرمانے لگے، مولانا محمد عبدالعلیم ندوی آغا صاحب یہاں رہتے ہیں۔ کیا اس وقت تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فرمانے لگے، ان سے کہیے کہ فضل اللہ الصّمد آئے ہیں۔ والد صاحب اس وقت صحن میں چارپائی پر بیٹھے تھے جب میں نے نام بتایا تو وہ ننگے پیر دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور انھیں لاکر نشست کے کمرے میں بٹھایا، خیر و عافیت دریافت کی، والد صاحب نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبۂ اسلامیات میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے رفیق کار رہے اور ان کے بعد شعبے کی تمام تر ذمّے داریاں انھوں نے سنبھالیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ بانی ندوۃ العلماء کے پوتے ہیں۔ میں انھیں حیرت و استعجاب میں دیکھتا رہا، سوچتا رہا کہ ظاہری طور پر سیدھے سادے عام سے آدمی نظر آنے والے اپنے جلو میں علم و عمل کے بیش بہا جواہر لیے ہوئے ہیں۔

میں نے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کو پڑھا ہے۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی کے ہندی آمیز اردو میں بڑے ہی خوب صورت تراجم کیے ہیں۔ میں ان سے متأثر تھا۔ پھر وہ حدیث میں بھی اور تصوّف میں بھی قلیل الوسائط تھے اس نسبت سے ان کے اجل

خلیفہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کی عظمت بھی دل میں پیوست تھی۔ چناں چہ چشم و گوش و ہوش کو فرشِ راہ کیے شاہ صاحب کی خدمت میں بیٹھا رہا، ان کی سادہ، مگر جاذبِ نظر شخصیت کو اپنے اندر اتارتا رہا۔ ادب و تاریخ کا طالبِ علم جانتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سب سے پہلے کانپور میں مولانا محمد علی مونگیریؒ نے قائم کیا تھا۔ جہاں شبلی نعمانی، ان کے استاد فاروق چڑیا کوٹی، مولانا حکیم عبدالحیؒ اور مولانا عبدالحق حقانی صاحب تفسیر حقانی وغیرہ اس ادارے کے رکن رکین تھے اور اس ادارے کے اغراض و مقاصد کو اکابرین نے پسند کیا، اپنی تحریروں کے ذریعے اس کا خیر مقدم بھی کیا، لیکن بہت جلد سیاسی سازشوں کی زد میں آکر باہم اختلاف رونما ہوئے، ادارہ نیم جاں ہوگیا اور لکھنؤ منتقل ہوگیا۔ ارکانِ ندوہ اور شبلی نعمانی کے درمیان جو کچھ اختلاف ہوا وہ سب سامنے ہے پھر بھی میں نے شاہ صاحب سے سوال کرلیا کہ حضرت مونگیریؒ اور مولانا شبلی نعمانی میں کیا اختلاف تھا۔ درونِ خانہ کوئی ایسی بات تو نہیں جو اب تک سامنے نہ آئی ہو۔ شاہ صاحب نے فرمایا، میاں! وہ سب لوگ دنیا سے رخصت ہوگئے اب کیسا اختلاف، ہر دور میں حکومت، اہلِ علم و دانش اور صاحب ورع و تقویٰ کے پیچھے پڑی رہتی ہے اگر ان کے درمیان ایک بھی دنیا دار ہو تو پھر اختلافات رونما ہوتے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اختلاف میں بھی اخلاص تھا، باعث رحمت تھا یہ اختلاف اور یہ ان کے خلوص کے ثمرات ہی تو ہیں جو آج تک اس ادارے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔

شاہ فضل اللہ صاحب نے مجھ ناچیز پر خصوصی توجہ دی۔ ساری گفتگو میں مجھے شریک رکھا، میری دلچسپی کے پیشِ نظر گفتگو کا محور حضرت مولانا مونگیریؒ ہی رہے۔ ان کے منہ سے تو عقیدت و محبت کے پھول جھڑ رہے تھے ایک ایک لفظ گواہ تھا کہ وہ اپنے جدِّ امجد سے محبت نہیں عشق کرتے ہیں اور کیوں نہیں انھیں کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے تھے۔ انھیں سے علم و فضل اور ورع و تقویٰ ورثے میں پایا تھا۔ انھیں کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے تھے۔ انھیں سے خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے تھے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ سارا علم سمٹ کر ان کی ذات میں جمع ہوگیا ہے۔ ان کا مطالعہ کیسا وسیع تھا اور علم کیسا حاضر تھا اس کا اندازہ اس مختصر سی نشست میں کماحقہ کہاں لگایا جاسکتا ہے، مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا

ہے کہ شاہ صاحب علم و فضل، زہد و تقویٰ، سیرت و کردار اور شرافت و سادگی میں سلف کی یادگار تھے۔ خوش قسمت ہیں ہم کہ ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھ لیا۔

شاہ صاحب نے گھر پر ہی ظہر کی نماز پڑھی ہم بھی ان کی اقتدا میں شریک تھے۔ جس خشوع و خضوع سے وہ نماز ادا کر رہے تھے اس کے اثرات ہم جیسے نالائق و ناسمجھ بھی محسوس کر رہے تھے۔ اس کے برسوں بعد یہی کیفیت مولانا عبدالکریم صاحب بیر والے خلیفہ حضرت حماد اللہ ہالیجوی کی اقتدا میں ہوئی۔ نماز سے فراغت کے بعد میں نے دسترخوان لگا دیا، کھانا تناول فرمایا اور اپنے ہاتھوں سے میرے مُنہ میں لقمے دیے جیسے چھوٹے بچّے کو کھلاتے ہیں۔ بزرگانہ محبت و شفقت کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ اس کے بعد والد صاحب سے فرمایا، میں ایک امانت آپ کو دینے آیا ہوں۔ شاہ صاحب علی گڑھ میں قیام پذیر تھے اور ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ خصوصی طور پر تن تنہا پتا معلوم کر کے حیدرآباد تشریف لائے تھے ایک امانت سپرد کرنے۔ ہم سمجھے ابھی جیب سے کوئی چیز نکال کر سپرد کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس یہ دیکھا کہ والد صاحب نے دونوں ہاتھ بڑھا دیے اور شاہ صاحب نے اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا، میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ قادریہ، مجدّدیہ نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کریں اور میرے دادا شاہ محمد علیؒ کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔ یہ تھی وہ امانت جس کو وہ اس پیرانہ سالی میں تن تنہا اتنا طویل سفر طے کر کے دینے آئے تھے۔ یہ بھی حضرت مونگیریؒ یا اس سلسلے کے بزرگوں کی ہدایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ کتابوں میں صدہا ایسے واقعات نظر سے گزرے ہیں۔ بہرحال میں نے کاغذ و قلم بڑھا دیا کہ حضرت لکھ دیں آپ کی تحریر یادگار رہے گی۔ شاہ صاحب نے لکھا:

> الحمدللہ آج کی مختصر صحبت میں محب ندیم مولانا محمد عبدالعلیم صاحب عرف آغا میاں صاحب جے پوری ثم الباکستانی کو میں نے اپنے سلسلہ قادریہ، مجدّدیہ اور نقشبندیہ میں ان کی ذاتی اہلیت کی بنا پر اجازت دی کہ میرے دادا حضرت مولانا السیّد شاہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں بیعت لیں اور داخل سلسلہ کریں اور طریق سنّتِ سنّیہ پر قائم رہ

کر دعوت جاری رکھیں۔ اللہ برکت دے اور اپنی رحمتوں سے
نوازے۔ ۱۵؍شوال المکرم ۱۳۹۲ھ۔

اس کے بعد والد صاحب نے ایک عمامہ ان کی نذر کیا۔ شاہ صاحب کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا دیں، پھر کُرتے اتارے۔ شاید ایک کُرتا دینا چاہتے تھے، مگر والد صاحب نے بنڈی کی طرف اشارہ کیا جو وہ کُرتوں کے نیچے پہنے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے وہ بنڈی اتار کر دے دی۔ وہ بنڈی اب تک والدہ کے پاس محفوظ ہے۔

پہلے زمانے میں بہت سے اہلِ علم اور اہلِ تصوّف گھرانوں میں یہ رواج تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو بزرگوں کی اترن سے کپڑے سی کر بچّے کو پہناتے تھے پھر جس بزرگ سے عقیدت کا رشتہ قائم ہوتا اس کی گود میں دے دیا جاتا، وہ بچّے کے کان میں اذان و اقامت کہتا اور تحنیک کرتا۔ کھجور کو خوب چبا کر یا کوئی میٹھی چیز بچّے کو چٹانے کو تحنیک کہتے ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ جب حضرت ام سلیمؓ کے بچہ پیدا ہوا تو اوّل آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بھیجا، آپ نے کھجور چبا کر بچّے کو چٹائی۔ چناں چہ یہ عمل سنّت بن گیا اور مستحب یہ ہے کہ تحنیک کرنے والا نیک و صالح شخص ہو۔ ماہرین نفسیات اس کو کیا نام دیں گے اور کس طرح اس کے اثرات کو بیان کریں گے۔ ڈاکٹر صاحبان اس کو جب اپنے علم کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس کے منفی اثرات کو بڑے شدّ و مد سے بیان کرتے ہیں اور اس کو مختلف النوع بیماریوں کا پیش خیمہ بتلاتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم فدائے امّی و ابی سے کوئی عمل ایسا صادر نہیں ہوسکتا جس سے نقصان کا اندیشہ ہو، قرآن نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحَىٰ۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہر عمل وحی کے ذریعے سے ہے۔ بہر حال، ہمارے یہاں تو یہی رواج ہے، میں گوالیار میں پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا بھی اس وقت وہیں تھے، انھوں نے ہی میرے کانوں میں اذان و اقامت کہی اور تحنیک کی۔ میں نے بھی اپنے بچّوں کے جسم پر پہلی مرتبہ جو کپڑا ڈالا وہ حضرت شیخ حیدر حسن خاں کے کرتے سے بنایا گیا تھا۔ زمانہ مانے نہ مانے ہمیں تو یقین ہے کہ اس کے بہتر اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ نے قانونِ تجاذب کے ذریعے کائنات کے ذرّے ذرّے کو پابند کیا ہے۔ چناں چہ عشق مصدرِ وجود ہونے کے سبب جب انسانی اعمال میں فطرتِ الٰہی کو جذب کر دیتا ہے تو پھر کائنات کے تمام اجسام و اجرام میں باہمی کشش اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ کلیہ کافی ہے۔

شاہ صاحب بڑے صاحبِ علم تھے۔ حدیث اور فقہ میں بڑا درک رکھتے تھے۔ امام بخاری کی کتاب ادب المفرد کی شرح عربی میں فضل اللہ الصمد کے نام سے لکھی جو دیارِ عرب میں بھی چھپی ہے اس کے علاوہ ''عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ'' بھی ان سے یادگار ہے۔ ان کی ساری زندگی تعلیم و تعلّم میں گزری اور تصوّف کی راہ سے انھوں نے جو اصلاح و تزکیۂ نفس کا بیڑا اٹھا رکھا تھا اس میں بہت زیادہ انہماک تھا، ایک تڑپ تھی، ایک لگن تھی کہ اس دورِ انحطاط میں مسلمان صحیح معنی میں مسلمان ہو جائے۔ انھوں نے زندگی کا بیش تر حصّہ جامعہ عثمانیہ میں گزارا وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور پر علی گڑھ منتقل ہو گئے، وہاں ان کی دو صاحب زادیاں مسلم یونیورسٹی میں تدریس سے وابستہ تھیں اس لیے شاہ صاحب کا ہمیشہ جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلّق رہا، ان کے گرد دورِ جدید کے طالبِ علم ہی تھے جن کو وہ سلف کی یادگار بنانا چاہتے تھے اور بلاشبہ ان کے طرزِ عمل میں ایسی بات ضرور تھی کہ یہ قدیم روایات سے متنفر یا باغی طبقہ بھی ان سے ارادت و عقیدت کا تعلّق رکھتا تھا۔

شاہ صاحب عصر تک ہمارے یہاں رہے عصر کی نماز بھی ہم نے ان کی اقتدا میں ادا کی۔ اس کے بعد خاصی دیر تک میرا ہاتھ پکڑے کھڑے رہے، دعائیں دیتے رہے، تلقین کرتے رہے دل یہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہمارے پاس رہیں اور ہم ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہیں، لیکن انھیں کراچی آنا تھا چناں چہ میں نے بس پر بیٹھا کر رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی کئی روز تک میں ان کے ہاتھوں کا لمس، ان کی گفتگو کی حلاوت محسوس کرتا رہا۔ خیال تھا کہ پھر شاہ صاحب سے ملاقات ہوگی، مگر چند ہی سال بعد یعنی ۲۳ رمئی ۱۹۷۹ء کو علی گڑھ میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـا اِلَیْہِ رَاجِعون۔

☆☆☆

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

(۱۹۱۵ء۔۔۱۹۹۹ء)

عم محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی خاندان کے سب سے روشن و منور ستارے، افق علم پر اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ سیکڑوں کی چمک دمک ان کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔ علمائے وقت کے درمیان بڑی عزت و وقعت انھیں حاصل تھی۔ ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ فعال شخصیت میرے دادا کے بڑے بھائی حافظ محمد عبدالکریم کی تھی۔ وہ بڑے زیرک، ہوش مند، معاملہ فہم اور سنجیدہ مزاج تھے۔ خاندان کے اکثر معاملات وہی طے کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی بھی معاملے میں بھی کوئی از خود فیصلہ کرے۔ اس میں شک نہیں کہ جو فیصلے وہ کرتے تھے بالکل صحیح ہوتے تھے، اس کے بہتر نتائج نکلتے تھے۔ وہ بے اولاد تھے، ان کی اہلیہ اور میری دادی دونوں حقیقی بہنیں تھیں، پھر ایک ہی جگہ ساتھ رہتے تھے، چناں چہ مولانا نعمانی کو ان کی خالہ نے اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا۔ انھیں کے ساتھ رہتے، انھیں کے ساتھ کھاتے پیتے۔

میرے دادا محمد عبدالرحیم خاطرؔ خوش رقم، بڑے دین دار، متقی، پرہیزگار، عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے دین سے بے پناہ لگاؤ اور محبت تھی۔ یہ وہ دور تھا جب پورے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تھا۔ سرسیّد احمد خاں احیاء العلوم کی تحریک شروع کر چکے تھے اور مقصد براری کے لیے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھ دی تھی جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تبدیل ہو گیا تھا اور صدہا گھرانوں کے لڑکے جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر وہاں سے نکلے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ پھر تو "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" کے مصداق جدید تعلیم کے حصول کی دوڑ شروع ہو گئی، ایسی صورت میں آبروئے شیوۂ اہل نظر کہاں رہ سکتی تھی پھر بھی ہمارے دادا نے

اپنی اولاد کے لیے دینی علوم کی تعلیم ہی کو ترجیح دی اور مولانا نعمانی کو دینی علوم کے حصول کی طرف لگادیا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بچپن ہی سے مولانا نعمانی ذہین و ذکی واقع ہوئے تھے۔ بچے فطری طور پر کھیل کود میں دلچسپی لیتے ہیں، لیکن پڑھنے کے علاوہ ان کی اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بغدادی قاعدے سے لے کر قرآنِ مجید اور فارسی میں گلستان بوستاں تک گھر ہی پر پڑھا، خطّاطی کی مشق بھی گھر ہی پر کی۔ اس کے بعد بہت مختصر سے عرصے میں حضرت مولانا قدیر بخش صاحب بدایونی سے صرف ونحو، معنی و بیان، حدیث وفقہ، اصولِ حدیث و فقہ، منطق وفلسفہ، ادب وتاریخ، تفسیر وفرائض، علم کلام اور اسرار شریعت وغیرہ علوم متداولہ کی تحصیل کر کے سندِ فراغت حاصل کر لی اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا، مگر جویائے علم بھلا کہیں سیراب ہوئے ہیں۔ وہ تو ہر لمحہ علم کی منزلوں میں صعود وترقّی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی تشنہ لبی کبھی ختم ہی نہیں ہوتی، ان کی تو ساری کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ جواہرات علم جہاں سے بھی سمیٹ سکتے ہوں سمیٹ لیں۔ وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ جواہرات ہر جگہ نہیں ملتے۔ یہ تو صاحب نظر جوہری کے پاس ہی ملیں گے اور جوہری کی جناب میں اسی کو باریابی نصیب ہوگی جو سلیم الطبع، پاکیزہ ذہن اور صالح اعمال کا حامل ہو۔

زندگی کو ایک تخم فرض کرلیا جائے اور باغباں کی نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس بیج میں بے شمار حسین وخوشگوار چیزیں مستور ہیں، بس اس کو وہ خاص ماحول اور فضا درکار ہوتی ہے جو اس کی قوت نمو کو بیدار کر کے اسے تن آور درخت بناتی ہے پھر ہر کوئی اس کے گل وثمر سے فیض یاب ہوتا ہے۔ نرم وزرخیز زمین میں تخم گل لالہ اور ریحان پھل پھول کر اپنے شباب کی منزل میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اپنی نزاکت اور دل کشی رنگ وبو سے سرور قلبی اور نور بصری کا باعث بنتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمیں میدان فکر ونظر میسّر ہے جس کی وسعت ارض وسما سے بھی آگے ہے یہ میدان اگرچہ زرخیز ہے، مگر خس وخاشاک سے پٹا پڑا ہے جب میدانِ فکر اُن سے پاک وصاف کرلیا جائے گا تو آدمی اعمال صالحہ کی شاہراہ پر گام

زن ہو جائے گا۔ بلا شبہہ کاملین کے فیض سے ہی حیات کو مادّی و روحانی ہر دو طرح سربلندی عطا ہوتی ہے۔ جامی:

فیضے کہ بہ دل می رسد از سدرہ و طوبیٰ
در سایۂ سروِ قدِ دل جوئے تو یابم

مولانا نعمانی بھی ایسے ہی صاحب نظر کی تلاش میں تھے جو علم کی پیاس بجھا سکے اور ساتھ ہی ساتھ سیرت و کردار پر بھی گہرا اثر ڈال سکے۔ قسمت نے یاوری کی، ایک مرد کامل پاک باز و پاک باطن از غیب متوجہ ہوا اور اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔ یہ حضرت شیخ حیدر حسن خاں ٹونکی، شیخ الحدیث و پرنسپل ندوۃ العلماء لکھنؤ تھے۔ شیخ صاحب سے مولانا کی ملاقات کا واقعہ بھی خوب ہے۔ میرے استفسار پر مولانا نے فرمایا، ہم جے پور میں درس نظامی کی تکمیل کر چکے تھے، ۱۹۳۴ء میں مولوی فاضل و منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا تھا، اب عربی ادب و انشاء کی طرف طبیعت مائل ہوئی تھی۔ اس وقت عربی ادب کے بڑے فاضل شیخ تقی الدّین الہلالی المراکشی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھاتے تھے، ان کی پورے ہندوستان میں شہرت تھی۔ اسی کے پیش نظر ہم عربی ادب پڑھنے کی نیت سے ان کی خدمت میں لکھنؤ پہنچے۔ ایک لوہے کا ٹرنک ساتھ تھا، ندوہ کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی، ایک درویش صفت، بزرگ صورت شخص نے نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اجنبی صورت دیکھ کر پوچھا، میاں کیسے آنا ہوا۔ ہم نے کہا، شیخ تقی الدّین الہلالی سے عربی ادب پڑھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ تو اپنے وطن چلے گئے۔ پھر پوچھا، کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے جواب دیا جے پور سے۔ انھوں نے برجستہ فرمایا، پھر تو عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو گے۔ پھر انھوں نے تعلیم کی تفصیل پوچھی اور فرمایا، میاں عربی ادب ہی کیوں، حدیث پڑھو کہ یہ اشرف العلم ہے۔ بس طبیعت ان کی طرف راغب ہوئی۔ دل نے کہا، یہی مرد کامل ہے۔ اشارۂ غیبی یہی ہے کہ اسی کا دامن تھام لیا جائے۔ شیخ صاحب خود ٹرنک اٹھا کر اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے اور بس درس حدیث شروع ہو گیا۔

مولانا نعمانی نے کامل ایک ڈیڑھ سال حضرت شیخ کی خدمت میں رہ کر پورے ضبط و

ایقان سے حدیث پڑھی۔ ان کے علم سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی شخصیت کو اپنی ذات میں ایسا سمویا کہ خود شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ انھیں حدیث، اصول حدیث اور فن اسماء الرجال میں بڑا درک تھا۔ اس دور میں وہ علم حدیث کا سرچشمہ تھے اور مجتہدانہ شان رکھتے تھے بعض مسائل میں تو ائمۂ حدیث کے برخلاف اپنی منفرد رائے رکھتے تھے۔ ساری زندگی علم حدیث کی ترویج واشاعت میں صرف کردی۔ ان کی سندِ حدیث قلیل الوسائط تھی۔ حضرت شیخ حیدر حسن خاں کے علاوہ ان کے برادرِ معظم مولانا محمود حسن خاں ٹونکی سے حدیث کی اجازت تھی، انھیں قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے اور ان کو شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے اجازت تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا یٰسین بریلوی کے واسطے سے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے اور ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے اجازت تھی۔ اس لیے بھی شائقین حدیث کا ان کی طرف بہت زیادہ رجوع تھا۔ مصر، شام، عراق، ترکی، سعودی عرب، افریقہ اور یورپی ممالک سے طالبانِ حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنی علمی پیاس بجھاتے اور سند حدیث حاصل کرتے۔

مولانا نعمانی علم کے جس مرتبے پر فائز تھے اس کا تو ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ ندوۃ المصنفین دہلی میں جب لغات القرآن کی تالیف میں مصروف تھے اس وقت بھی اور بعد میں جب ٹنڈو الہ یار کے مدرسے میں تھے اس وقت بھی اپنے دور کے نام ور علماء کے درمیان رہے۔ ان کا علم بڑا حاضر، کتابیں بڑی مستحضر تھیں۔ نقد وجرح کا انھیں خاص سلیقہ تھا۔ ذہانت و ذکاوت کا وافر حصہ قدرت نے انھیں ودیعت کیا تھا۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی بات ہو فوراً ہی ذہن اصل مآخذ کی طرف منتقل ہو جاتا اور وہ مع حوالہ جات کے نہایت تفصیل سے اس پر سیر حاصل گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کی اس صلاحیت کا ہر کوئی معترف تھا۔

ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ جب وہ اہلِ علم کے درمیان ہوتے وہاں ان کے جوہر کھلتے۔ جو بھی گفتگو کا موضوع ہوتا اس سے متعلق بے پناہ معلومات کا ان کے پاس ذخیرہ ہوتا اور وہ بڑے اعتماد وتیقّن سے اس کا اظہار کرتے۔ ورنہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے مواقع پر اچھے خاصے لوگ بھی کترا کر نکل جانے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ ان

کی گفتگو کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ نفس مضمون کو ایسے منتخب الفاظ میں بیان کرتے اور ایسی دلیلیں فراہم کرتے کہ سننے والا پورے یقین سے اسے قبول کر لیتا، گویا وہ اپنے علم اور اسلوب سے بڑی بڑی شخصیت کو اپنے علم کے دائرے میں محصور کر لیتے، پھر وہ چاہے بھی تو ان کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ خداداد بات ہے، کسی کسی کو میسّر ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ان کی تحریروں کی ہے۔ مستند حوالوں سے مزین کر کے اپنی تحریروں کو پیش کرنے کا فن وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ حوالے اسی قدر دیتے ہیں جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ حوالوں کی زیادتی سے اپنی تحریر کو بوجھل نہیں کرتے اور نہ ہی اس ذریعے سے قاری پر اپنی علمیت کا رعب ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔ جس قدر حوالے ہوتے ہیں وہ اپنی بات کی دلیل میں ہوتے ہیں۔ بغیر ٹھوس علمی دلائل کے تو انھیں کوئی بات سننا یا بیان کرنا گوارا نہیں تھی۔ میرے سامنے کی بات ہے ایک صاحب مسلکاً اہلِ حدیث تھے مولانا سے گفتگو نہیں بلکہ مباحثہ کرنا مقصود تھا۔ مولانا نے فرمایا، آپ ہمیں پہلے حدیث کی تعریف حدیث ہی سے بتائیے۔ تب آپ سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اگر نہیں معلوم تو اپنے اکابر سے پوچھ کر تشریف لائیے۔

مولانا کی تصانیف میں رطب و یابس نہیں، نہ وہ ایک ہی بات کو بار بار بیان کرنے کے عادی ہیں، ان کے ہاں سمندر کی سی گہرائی اور دریا کی سی روانی ہے۔ اسلوب ایسا کہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ''لغات القرآن'' اردو کی پہلی قرآنی لغت ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا کے قلم سے اس کی چار جلدیں مکمل ہوئیں تقسیم کے بعد مولانا ہجرت کر کے پاکستان آ گئے بعد میں مسوّدے کو دو جلدوں میں مولانا عبدالدائم الجلالی نے مرتب کیا۔ یہ بڑی معرکے کی لغت ہے۔ عام عربی لغات کے برعکس اس کی ترتیب مادّے پر نہیں بلکہ حروفِ معجم پر رکھی گئی ہے تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ الفاظ کی تشریح و تحقیق میں مولانا نے پورا زور صرف کر دیا ہے۔ مقصد قرآنِ مجید کی محض لغت تیار کرنا نہیں ہے بلکہ صاحبِ وحی فدائے امّی و ابی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حقیقی معنی و مطالب تک پہنچنا مقصود ہے۔ اس مقصد کے لیے تفسیر، حدیث، فقہ اور لغت کی مستند و متداول کتابوں سے بھی پورا استفادہ کیا گیا ہے، البتہ جہاں مفسرین، فقہا اور اہلِ لغت میں اختلاف

پایا وہاں خوب دادِ تحقیق دی ہے اور قول فیصل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی جامع اور مستند قرآنِ مجید کی لغت ابھی تک اردو میں کوئی دوسری نہیں آئی ہے۔ ''امام ابن ماجہ اور علم حدیث'' یہ عہدِ رسالت سے ابن ماجہؒ کے زمانے تک کی تاریخ تدوین حدیث پر مشتمل دستاویز ہے۔ گویا علم حدیث کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے۔ انھوں نے عربی میں ماتمس الیه الحاجه، لـمـن یـطالع ابن ماجه، مکانة امام ابی حنیفه فی الحدیث کے علاوہ سندھ کے نامور علماء کی عربی تصانیف کو مرتب کیا، ان پر مبسوط مقدمات لکھے اور نہایت قیمتی حواشی وتعلیقات سے انھیں مزیّن کیا، جو سندھ ادبی بورڈ سے شائع ہوئی ہیں۔ ان سے جہاں ان کی تحقیق اور دقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کی عربی زبان پر قدرت کا بھی پتا چلتا ہے۔ وہ اردو کی طرح عربی بھی بڑی سلیس اور رواں لکھتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ وہ اگر عربی ادب وانشاء کی طرف مائل ہوتے تو یقیناً اس ضمن میں بڑے کارنامے سرانجام دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو انھیں حدیث کے لیے مختص کرلیا تھا۔

میں نے انھیں پڑھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جامعۂ بہاول پور میں بھی اور یہاں نیوٹاؤن میں بھی۔ بس ان کا لیکچر سنتے رہے اور دل میں اتارتے رہے۔ طلبہ پیچیدہ سے پیچیدہ سوال کرتے اور وہ ہر سوال کا جواب دینے میں مستعد رہتے۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے یا اپنے منصب کا اثر ڈال کر طلبہ کو مطمئن نہیں کرتے بلکہ ٹھوس علمی دلائل سے مسئلے کی تفہیم کراتے اور اکثر اوقات سوالات کا بار الٹا طالبِ علم پر ڈال دیتے تاکہ علم وتحقیق میں خود اسے کاوش ومحنت کرنی پڑے۔ پھر جستہ جستہ مزاح کا عنصر بھی پیدا کرتے جاتے جس سے طالبِ علم کی دلچسپی برقرار رہتی۔ یہ مزاح عموماً تحریفِ لفظی سے پیدا کرتے۔ اس طرح طالبِ علم شاداں وفرحاں ان کے درس سے فارغ ہوتا۔

مولانا کو ہم بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ گھر کے بڑے تھے، اس کا انھیں احساس بھی تھا اسی لیے وہ اس منصب کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ہر ممکن اس کا تحفظ کرتے، جس طرح بھی بن پڑتا اپنی بات کو اونچا ہی رکھتے تھے۔ میرے والد صاحب عمر میں ان سے صرف چار سال ہی چھوٹے تھے۔ عمر کا یہ فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس فرق کے

حامل بھائی تو آپس میں دوست ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے رازداں ہوتے ہیں، دلچسپیاں بھی ایک دوسرے کی یکساں ہوتی ہیں، مگر ہم نے دونوں کے درمیان ایک فاصلہ ہی دیکھا ہے۔ والد صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ان کی کسی بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ میاں بھائی میاں بھائی کی رٹ لگائے رہتے تھے، مگر دونوں کے درمیان کوئی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے یہ فاصلہ تھا۔ معاصرین میں چشمک تو ہوتی ہے ہوسکتا ہے یہی بات ہو۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ دونوں ہی استاد کے بہت قریب تھے، دونوں ہی پر پوری طرح استاد کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی کمزوریوں، خوبیوں اور خامیوں سے یقیناً واقف رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ والدہ صاحبہ بتاتی ہیں ایک مرتبہ جب میں بہت چھوٹا تھا بچّوں کی کوئی بات تھی اس پر مولانا بھڑک اٹھے اور والد صاحب کو مارنے لگے۔ میں اس وقت والد صاحب کی گود میں تھا، والد صاحب پٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ میاں بھائی اور، اور مولانا تھے کہ اور زیادہ جوش سے مارنے لگے، تا آں کہ خود ہی تھک کر خاموش ہو گئے، والد صاحب نے اف تک نہیں کیا اور نہ ہم سے کبھی اس کا تذکرہ کیا۔

اللہ معاف کرے، میں ٹھہرا باغی قسم کا۔ اشترا کی ذہن تو نہیں تھا، مگر اشترا کی شعراء وادباء کے ساتھ بیٹھنے کا کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے، اس لیے مولویوں سے کچھ زیادہ ہی بدکا ہوا تھا، ان کی کوئی بھی بات مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور مولانا نعمانی تو بیسویں صدی میں ہوتے ہوئے بھی قرونِ وسطیٰ کے دور میں رہتے تھے۔ وہ انگریزی معاشرت وتہذیب اور انگریزی تعلیم کو کیوں کر پسند کرتے۔ ہم بھائی تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے، انگریزی لباس پہنتے تھے، انگریزی بال رکھتے تھے، شیو بھی بنایا کرتے تھے۔ یہ باتیں انھیں کیوں کر پسند آسکتی تھیں۔ ہم تو ان کے مطابق نالائق وناخلف تھے۔ خاندان سے باہر تو وہ ان سب چیزوں کو دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہوں گے، مگر ہمیں انگریزی طرز معاشرت میں گھرا ہوا دیکھ کے وہ کیوں کر خاموش رہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے، تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کا تو یہ حلیہ کبھی نہیں رہا۔ میں تو خاموش ہو گیا۔ والد صاحب پر برس پڑے۔

والد صاحب نے پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ بعد میں مَیں نے والد صاحب سے کہا کہ اتنی بھی تنگ نظری اچھی نہیں۔ یورپ کے مسلمان بھی تو یہ لباس پہنتے ہیں۔ ویسے بھی ہم اس دور میں رہتے ہیں اس دور سے ہم آہنگ ہو کر ہی ہم ملک وقوم کی کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ دین اس میں کہاں مانع ہے اگر ہم دین کی کسی بھی بات سے انحراف کریں تو بے شک مجرم ہیں، واجب القتل ہیں۔ ہمارے علماء ذرا تو قلب وسیع رکھیں۔ والد صاحب مجھے سمجھاتے اور فرماتے، ایک دن آئے گا جب تم ان باتوں کو سمجھو گے۔

مولانا تصویر کے بھی سخت مخالف تھے۔ وہ کسی صورت تصویر کشی کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور احادیث سے استدلال کرتے تھے۔ میرے نکاح میں میرے چچا سسر تصویریں لے رہے تھے۔ تصویریں تو ہر ایک شوق سے کھنچواتا ہے کہ یہ یادگار لمحوں کو قید کر لیتی ہے۔ اس سے عمر رفتہ کے حسین مناظر پھر دوبارہ سامنے آجاتے ہیں۔ آدمی وقتی طور پر مخلّی بالطبع ہو کر ماضی سے حال کا موازنہ کرتا ہے اور سراپا عبرت بن جاتا ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کی بیٹی کے ہونے والے سسرال میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جو تصویر کھنچوانے کو حرام و ناجائز سمجھتے ہیں۔ شروع میں تو مولانا خاموش رہے بالآخر ان کے صبر وضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے والد صاحب سے فرمانے لگے، جب ہمیں بلایا جاتا ہے تو ہمارا اکرام بھی کیا جائے۔ والد صاحب نے بمشکل تمام انھیں منایا۔ میرے بعض دوست جن کے سامنے بعض مقتدر علماء کی تصاویر تھیں، بحث ومباحثے پر آمادہ تھے، مگر میں نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر انھیں خاموش کیا۔ جب تقریب ختم ہوگئی تو میرے خسر سے فرمانے لگے، یہ میرا چھوٹا بھائی ہے باپ اس کا تہجد گزار تھا، خود بھی بچپن سے تہجد گزار ہے، لیکن اب اولاد نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے اب ان کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔ والد صاحب سر جھکائے خاموشی سے سنتے رہے۔

اسی طرح جامعہ کراچی میں شعبۂ عربی کے تحت بین الاقوامی کانفرنس تھی اس وقت ڈاکٹر حبیب الحق ندوی صاحب شعبے کے سربراہ تھے۔ وہ والد صاحب کے ندوہ کے ساتھی تھے۔ میں نے ان سے میٹرک میں انگریزی پڑھی تھی، میں بھی کانفرنس میں مدعو تھا۔ لاڑکانے سے آیا تھا، پہلا ہی سیشن تھا۔ مولانا نعمانی مقالہ پڑھنے کھڑے ہوئے۔ میں،

؛ اکٹر امین اللہ وثیر اور ڈاکٹر شرف الدّین اصلاحی ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جوں ہی ٹی وی والوں نے کیمرے کا رخ مولانا کی طرف کیا، فوراً ہی مولانا نے پورا مقالہ اپنے چہرے کے آگے پھیلا لیا۔ ٹی وی والے کہنے لگے، یہ مولوی تو کچھ زیادہ ہر خرانٹ ہے۔ ڈاکٹر شرف الدّین صاحب نے مجھے ٹھونکا دیا۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

مولانا سلیم الفطرت تھے، قدرت نے انھیں قلبِ سلیم عطا کیا تھا۔ قلب بظاہر گوشت کا لوتھڑا، خون کو گردش میں رکھنے والا، جسم کا سارا نظام اس کے تابع، مگر حقیقت کے اعتبار سے یہی روح انسانی ہے۔ عرفان الٰہی کا محل، معرفت خداوندی کا مرکز، احکام و اوامر الٰہی کی آماج گاہ، حکمت و سعادت کا سرچشمہ۔ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ انّی اَسْأَلُکَ قَلْباً سَلِیماً۔ یہی قلب سلیم ہی تو ہے جو فاسد اور تباہ کن خیالات کو جھٹک کر قوت و حیات بخش تصوّرات کے تحت راہ مستقیم پر گام زن رکھتا ہے۔ اس کی موجودگی میں انسان اخلاق حمیدہ سے آراستہ ہو کر رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ نعمت ودیعت ہوتی ہے وہ گرد و پیش کے جاہلانہ اطوار کو ہرگز قبول نہیں کرتے اور راہ حق کی ایک کرن ہی ان کے باطن کو روشن و منوّر کر دیتی ہے۔ دیکھیے عرب کے جاہلانہ و کافرانہ ماحول میں پرورش پانے والے ابوبکر بن قحافہؓ ہر برائی سے دور رہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں نور حق جلوہ افروز ہوا تو بغیر کسی تذبذب کے آمنا و صدقنا اسے قبول کر لیا۔ یہ انجذابی قوت کی کرشمہ سازی ہے کہ باہم مماثل و یکساں خصوصیات کی حامل چیزوں کو متحد و یکجا کر دیتی ہے۔ مولانا، حضرت شیخ حیدر حسن خاں کے پاس رہے، ان سے پڑھا۔ ان کے علم کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت کو بھی اپنی ذات کا حصّہ بنا لیا۔ شب و روز کے تمام معمولات کو انھیں کے مطابق ڈھال لیا۔ شیخ صاحب سنّت نبوی کے پیرو کار تھے، انھوں نے زندگی کے ایک ایک لمحے کو سیات طیبہ سے مستعار لے کر اپنے اندر راسخ کیا تھا اور ہونہار شاگرد نے ان سب کو اپنی زندگی کا لازمہ بنا لیا۔

مولانا کو ہر لمحہ اتباع سنّت نبوی کا خیال دامن گیر رہتا۔ ان کا کوئی عمل ایسا دکھائی نہیں دیتا جس میں وہ سنّت کی پیروی نہ کرتے ہوں۔ ان کا چلنا، ان کا پھرنا، ان کا اٹھنا، ان کا

بیٹھنا، ان کا سونا، ان کا جاگنا، ان کا کھانا، ان کا پینا سب سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تھا۔ وہ سنت کے خلاف کسی بھی عمل میں شریک نہیں ہوتے تھے اور کسی بھی قسم کی مصلحت کو اس باب میں روا نہیں رکھتے تھے۔ عام طور پر خوشی و غم کے موقع پر ہم حد اعتدال سے گزر جاتے ہیں اور ان باتوں کو بھی کر گزرتے ہیں جن کو رواج عام حاصل ہوتا ہے اگر چہ ان کا شریعت مطہرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن مولانا سنت سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ مولانا کے بڑے صاحب زادے محمد عبدالمعید صاحب مجھ سے دو یا تین سال بڑے تھے۔ جب میں بہاول پور گیا تو وہ نشتر میڈیکل کالج میں داخل تھے، مولانا مجھے لے کر ملتان گئے اور عبدالمعید صاحب سے ہسپتال میں ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے تیسرے روز ان کا انتقال ہو گیا۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ انھوں نے نہایت صبر و ضبط سے برداشت کیا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے سنت کی پیروی کو ملحوظ خاطر رکھا۔ وہ بہت بڑے محدث تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق ان کے سامنے تھا، انھیں اس پر کامل یقین تھا۔ عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین، اگر کسی کے یقین کا پتا لگانا ہو تو اس کے عمل کو دیکھنا چاہیے۔ محض قول سے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مولانا کی زندگی عین الیقین کے درجے میں تھی۔ والد صاحب بھی سنت کی شدت سے پیروی کرتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ صدق بیاں سے نکلے ہوئے الفاظ نوک زبان تھے دونوں بھائیوں میں یہ بات مشترک تھی۔ آج کل کا مہذب، تعلیم یافتہ معاشرہ کتنا ہی برا کیوں نہ سمجھے، وہ اکڑوں بیٹھ کر ہی کھانا کھاتے تھے۔ ہمیں بھی ساتھ بٹھاتے تھے۔ اکڑوں بیٹھنے میں میری کمر جھک جاتی تھی تو والد صاحب پیٹ پر ایک گھونسا مارتے، میں الف کی طرح سیدھا ہو جاتا۔ ہڈی سے گوشت کو دانتوں سے نوچتے اسی کو سنت بتاتے تھے، سوتے تو ہمیشہ دائیں کروٹ ایک ہاتھ رخسار کے نیچے، پھر صبح سے رات سوتے وقت ہر عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی دعائیں ورد زبان ہوتیں۔ برادر محترم پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی صاحب نے ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ایک دن'' کے عنوان سے مولانا نعمانی کے دن بھر کے واقعات تحریر کیے۔ اس کے

مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ مولانا کس قدر متبع سنت تھے ۔ وہ کوئی موقع ایسا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جس میں سنت کی پیروی ہوتی ہو پیرانہ سالی میں بھی وہ دور دراز کا سفر کر کے افغانستان پہنچے اور وہاں محاذ جنگ پر روسی کفار پر گولیاں برسائیں۔

مولانا نعمانی، حضرت شیخ حیدر حسن خاں صاحب سے بیعت بھی تھے حضرت شیخ، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے۔ مولانا کو بھی اور والد صاحب کو بھی انھوں نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔ یہ بہت بڑی نسبت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بھی اجازت تھی۔ چند ایک لوگ مولانا سے بیعت بھی ہوئے ۔ایک روز میں نے مولانا سے کہا، آپ کی اتنی بڑی نسبت ہے آپ لوگوں کو بیعت کیوں نہیں کرتے ۔فرمانے لگے، میاں ہم حدیث کی خدمت کرلیں یہی کافی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد ہی خدمت حدیث تھا۔

مولانا نعمانی بڑے متواضع، نفاست پسند اور پاکیزہ مزاج تھے۔ باہر سے علماء ان کی خدمت میں آتے وہ مقدور بھر ان کی تواضع کرتے۔ خود بھی بہترین، مگر سادہ کھانا کھاتے تھے دُوپَرتی روٹی (نانِ دو پوست) پسند کرتے تھے کہ یہ جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ میٹھے کے بھی شوقین تھے ان کی اہلیہ جن کو میں والد صاحب اور چچاؤں کی طرح بھابھی جان ہی کہتا تھا بہت عمدہ کھانا پکاتی تھیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے مجھ سے تو وہ بہت محبت کرتی تھیں۔ رام سوامی میں جب ہم ساتھ رہتے تھے میں کبھی ضد کرتا سب بچّوں کے خلاف وہ مجھے آٹا گوندھ کر کٹوری میں گھی رکھ کر دیتیں کہ جا تنور سے اپنے لیے پراٹھا پکوالا۔ بڑی نیک خاتون تھیں۔ نماز روزے کی پابندی کے ساتھ ذکر واذکار میں بھی مشغول رہتی تھیں۔ میں بہاول پور گیا، علی الصباح بعد نماز فجر ان کے گھر پہنچا، دیکھا کہ وہ وظائف میں مشغول ہیں۔ مولانا ہمیشہ سفید لباس ہی پہنتے تھے۔ کرتا شلوار، مگر ٹخنے کھلے ہوئے۔ یہ لباس ان کی شخصیت کا حصّہ تھا۔ بید ہاتھ میں، مگر گرمیوں میں بید کی جگہ چھتری ہوتی۔ دھوپ تیز ہوتی تو چھتری استعمال کرتے۔ شیروانی پہنتے تھے ان پر شیروانی بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ خاص طور سے اس وقت جب وہ منبر پر خطبہ دے رہے ہوں۔

مولانا بہاول پور میں جب تھے تو ان کی ادارت میں جامعہ سے ایک مجلّہ نکلتا تھا۔ مجھے خاص طور پر بھیجتے۔ ان دنوں میں بھی حیدرآباد سے ایک رسالہ ''کاوش'' نکالا کرتا تھا۔ مولانا کو بھی بھیجا۔ مولانا نے اپنے مذاق کے برخلاف پورے رسالے کا مطالعہ کیا اور ایک خط میں اس پر بھرپور تبصرہ کیا۔ افسانے کے متعلّق لکھا کہ افسانے میں محبت بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ مولانا میری تحریروں کو بڑی توجہ سے پڑھتے اور بے لاگ تبصرہ کرتے۔ میں نے ایک مقالے میں یہ لکھ دیا کہ محمود غزنوی کے ہندوستان آنے کا مقصد یہاں کی دولت بٹورنا تھا۔ مولانا نے اس پر سخت تنقید کی، فرمایا، محمود غزنوی کے آنے کا یہ مقصد تو آپ کو نظر آ گیا، مگر وہ اپنے ساتھ اسلام کی کرنیں لے کر آیا اس پر آپ کی نظر نہیں گئی۔ وہ اپنے ساتھ پورا اسلامی معاشرہ لے کر آیا تھا اور ہندوستان میں کچھ نہ کچھ اس کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اس کو آپ نظر انداز کر گئے۔ یہ مستشرقین کا طرزِ عمل ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے اور ابھی تو یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا وہ ہندوستان دولت سمیٹنے کے لیے آیا تھا۔

مولانا بہانے بہانے سے میرا امتحان لیتے تھے، مجھے تو ان کے انداز گفتگو میں نہ معلوم کیوں طنز کی کاٹ محسوس ہوتی تھی۔ ایک موقع پر جب بہت سے لوگ مولانا کے پاس موجود تھے میں بھی پہنچ گیا۔ وہاں کسی صاحب کے پاس ایک کتاب تھی۔ کتاب کیا تھی، یہ نہیں معلوم۔ مولانا اس کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ ایک دم میری طرف متوجہ ہوئے فرمایا، ہاں میاں! آپ تو شاعری کرتے ہیں ذرا اس شعر کے متعلّق فرمائیے، اور یہ شعر پڑھا:

کہاں ایماں، کہاں کفر و اشراک
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

میں نے کہا، یہ شعر وزن سے ساقط ہے۔ فرمانے لگے، میاں! اہلِ علم کے درمیان ہو، علمی انداز میں جواب دو گے تو قابل قبول ہوگا۔ یہ بات تو وہ بھی کہہ سکتا ہے جو ذرا سی بھی طبع موزوں رکھتا ہو۔ میں نے غور کر کے کہا کہ اس میں ایک سبب کم ہے، فرمانے لگے، سبب کون سا، میں نے جواب دیا، سبب خفیف کم ہے، پھر بھی مولانا خاموش نہیں ہوئے، فرمایا، اب اس کی اصلاح فرمائیے۔ میں نے اصلاح کر کے شعر پڑھا:

کہاں ایماں، کہاں یہ کفر و اشراک
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

تب کہیں مولانا خاموش ہوئے۔ وہ اکثر اسی طرح کرتے تھے پے در پے سوالات پشاور یونیورسٹی میں مولانا رومی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں مَیں نے ''مولانا رومی اور انسان کامل'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔ مولانا نے اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر سوالات کیے کہ میں حیران رہ گیا اور آج تک سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے ان کا مقصد کیا تھا، کیا تربیت کا یہ انداز بھی ہوسکتا ہے۔ ایک نشست میں مولانا نے یہ شعر پڑھا۔ فرمایا، اسے لکھ کر دکھاؤ اور مطلب بھی بتاؤ۔ شعر یہ تھا:

دَیا قوزہ نشیمن لا اُبالی حرز مستئمن
مری جاں ہر رگِ خارا میں چشمِ دوراں ہے

شعر تو ہم نے لکھ دیا، مگر مطلب خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ شعر تو بے معنی مہمل معلوم ہو رہا تھا۔ پھر خود ہی فرمانے لگے، کہ پرانے شعراء تفریح طبع کے لیے کبھی کبھی ایسے شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے، مہمل ہے۔

میں نے مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے رسالہ ''اویسیہ'' کا ترجمہ کر لیا تو مولانا کو سنایا۔ انھوں نے سن کر اطمینان کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ فرمایا کہ ترجمہ اور ترجمانی میں فرق ہے۔ ترجمہ کر رہے ہو تو پھر ترجمہ ہی کرو، وہاں ترجمانی نہیں ہونی چاہیے۔ میں جب ایم اے میں تھا، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر خوشی کے اظہار کے لیے ایک چھوٹی موٹی تقریب منعقد ہوئی میں نے اس موقع کی مناسبت سے دو قطعات کہے تھے۔ بعد میں والد صاحب سے خوش خط لکھوا کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ اب وہ قطعات بالکل ہی یاد نہیں ہیں اور نہ ہی کہیں تحریر میں۔ تین مصرعے یاد رہ گئے ہیں پہلا مصرع پورا کر کے یہاں لکھ رہا ہوں:

خوشا اے جذبِ پنہاں، رحمتِ حق خندہ بار آمد
صبا بر دوش اے شاکر شمیمِ زلفِ یار آمد

نہ چوں زیرِ قدم ایں چشم و دل را فرشِ رہ سازم
غلام مصطفٰے دیدم کہ از کوئے نگار آمد

مولانا کو میں نے سنایا تو انھوں نے تیسرے مصرع میں اصلاح کی۔ میں نے کہا تھا، ''فرش می سازم۔'' مولانا نے ''فرشِ رہ سازم'' کر دیا۔ اس سے شعر زیادہ فصیح ہو گیا۔ اساتذہ اسی طرح اصلاح دیا کرتے تھے۔ مولانا میں خداداد یہ صلاحیت تھی۔ انھوں نے حیاتِ ابن کثیر میں حافظ ابن کثیر کے اشعار پر بھی اسی طرح اصلاح کی ہے کہ شعر بہت بلیغ ہو گیا ہے۔ دیکھیے، تفسیر ابن کثیر، طبع نور محمد کارخانۂ تجارتِ کتب، کراچی۔

مولانا نعمانی خوش نویس بھی تھے۔ دادا سے اصلاح لی تھی۔ حیدر آباد دکن کے قیام کے زمانے میں نواب دکن کے استاد سے بھی اصلاح لی تھی۔ والد صاحب نے بھی دادا سے اور اپنے تایا حافظ محمد عبدالکریم صاحب سے اصلاح لی تھی۔ دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔ ایک روز دونوں نے ایک قطعہ لکھا۔ ابا میاں کا فیصلہ نعمانی صاحب کے حق میں تھا۔ حافظ قبلہ نے فرمایا، عبدالرحیم خدا کے خوف سے ڈر۔ آغا نے زیادہ اچھا لکھا ہے۔ بہرحال دونوں بھائی بہت عمدہ لکھتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ مولانا سے عرض کیا کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کوئی پرانی وصلی مجھے عنایت کر دیں۔ فرمایا، کراچی جاتے ہوئے حیدر آباد ٹھہروں گا تم قلم اور سیاہی فراہم کر کے رکھنا اِن شاءاللہ وہیں آ کر لکھ دوں گا۔ چناں چہ دو وصلیاں انھوں نے لکھیں جب کہ ان کی بالکل مشق نہیں رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، نوک پلک، کرسی و نشست الفاظ سے درست یہ دونوں وصلیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔ وہ بڑے صاحب نظر بھی تھے، روش خط کو خوب پہچانتے تھے قدماء و متوسطین و متاخرین، ہر دور کے خط کی خصوصیات پر خوب نظر تھی، اگر وصلی پر کاتب کا نام نہ ہو پھر بھی پہچان لیا کرتے تھے۔ ایک وصلی کا عکس پیشِ خدمت ہے۔

مولانا قناعت پسند واقع ہوئے تھے، انھوں نے کبھی حصول دولت کے لیے تگ و دو نہیں کی۔ اللہ تعالٰی خود ہی ازغیب ان کے مسائل حل کر دیتا تھا۔ فرماتے تھے جو رزق مقسوم میں ہے وہ تو ہر حال میں ملے گا۔ دیکھو ہمارے مقسوم میں قرآن و حدیث کے واسطے سے

رزق لکھا تھا، وہ ہمیں ملتا ہے اور الحمدللہ بہت سوں سے ہم بہت اچھے ہیں۔ انھیں اپنے خدا پر بڑا بھروسا تھا، پوری زندگی بحسن وخوبی اسی کے سہارے گزاردی کیسے بھی حالات ہوئے شکوہ زبان پر نہیں آیا، ہمیشہ شکر گزاری میں رطب اللسان رہے۔ دراصل انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے جسم ایک کثیف وظلمانی مخلوق ہے اور فانی و ناپائیدار ہے۔ روح ایک لطیف و نورانی شے ہے، باقی ولازوال، مال وزر تو جسمانی ضروریات کا سامان ہے اور علم وحکمت روحانی کمالات کا سرمایہ، فانی کا سامان بھی فانی و ناپائیدار اور باقی کا سرمایہ بھی ایک لازوال دولت۔ سلیم الفطرت لوگ علم کو حصول دولت کا ہتھیار نہیں بناتے بلکہ ضرورت کے درجے میں اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش تحسین اخلاق، تہذیب خصائل اور اصلاح نفس پر ہوتی ہے بلاشبہہ یہی مولانا کا مطمحِ نظر تھا۔ پھر بھلا وہ مادّی منفعت کے لیے کیوں درپے رہتے۔

مولانا کے چھوٹے صاحب زادے ڈاکٹر محمد عبدالشہید نعمانی جامعہ کراچی میں شعبۂ عربی کے چیئرمین ہیں۔ قاری فتح محمد صاحب پانی پتی کے پاس قرآن حفظ کیا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے محدّث ابوجعفر الدیبلی المتوفی ۳۲۲ھ نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے مکاتیب جمع کیے تھے ان پر موصوف نے بڑا تحقیقی کام کیا ہے۔ جس پر پی ایچ ڈی کی سند عطا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت پر بڑا پرمغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، وہ طبع ہو چکا ہے۔ بڑے ذی علم، ذی استعداد اور متقی و پرہیزگار ہیں۔ اپنے والد کی انھوں نے بڑی خدمت کی۔ خود بھی سعادت مند تھے اللہ تعالیٰ نے سعادت مند اولاد سے بھی نوازا ہے۔ لڑکے لڑکیاں سب ہی حافظ ہیں۔ اللہ انھیں خوش وخرم رکھے۔

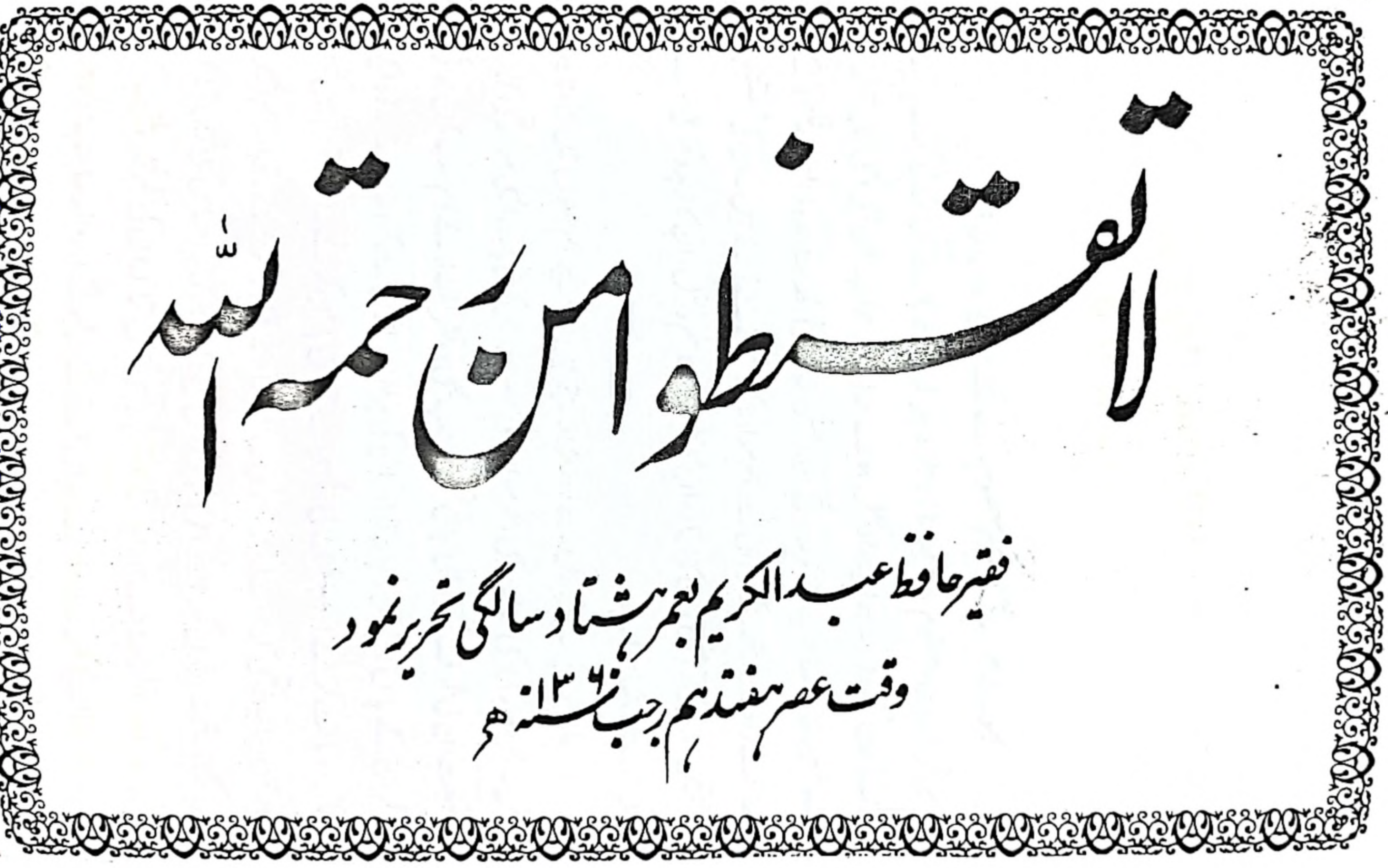
مولانا نعمانی نے ۸۵ رسال کی عمر پائی۔ کچھ دن بیمار رہے اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ڈاکٹر محمد عبدالشہید صاحب نے بتایا کہ رات بھر کلمۂ طیبہ اور سورۃ الاخلاص کا ورد جاری رہا۔ فجر کی نماز کے لیے بے چین تھے بار بار فرماتے تھے، نماز کا وقت ہوا اور بار بار اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے تھے جیسے کسی سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یقیناً فرشتے استقبال کے لیے حاضر ہو رہے تھے۔ علامہ سیوطی نے شرح الصدور میں حدیث نقل کی ہے

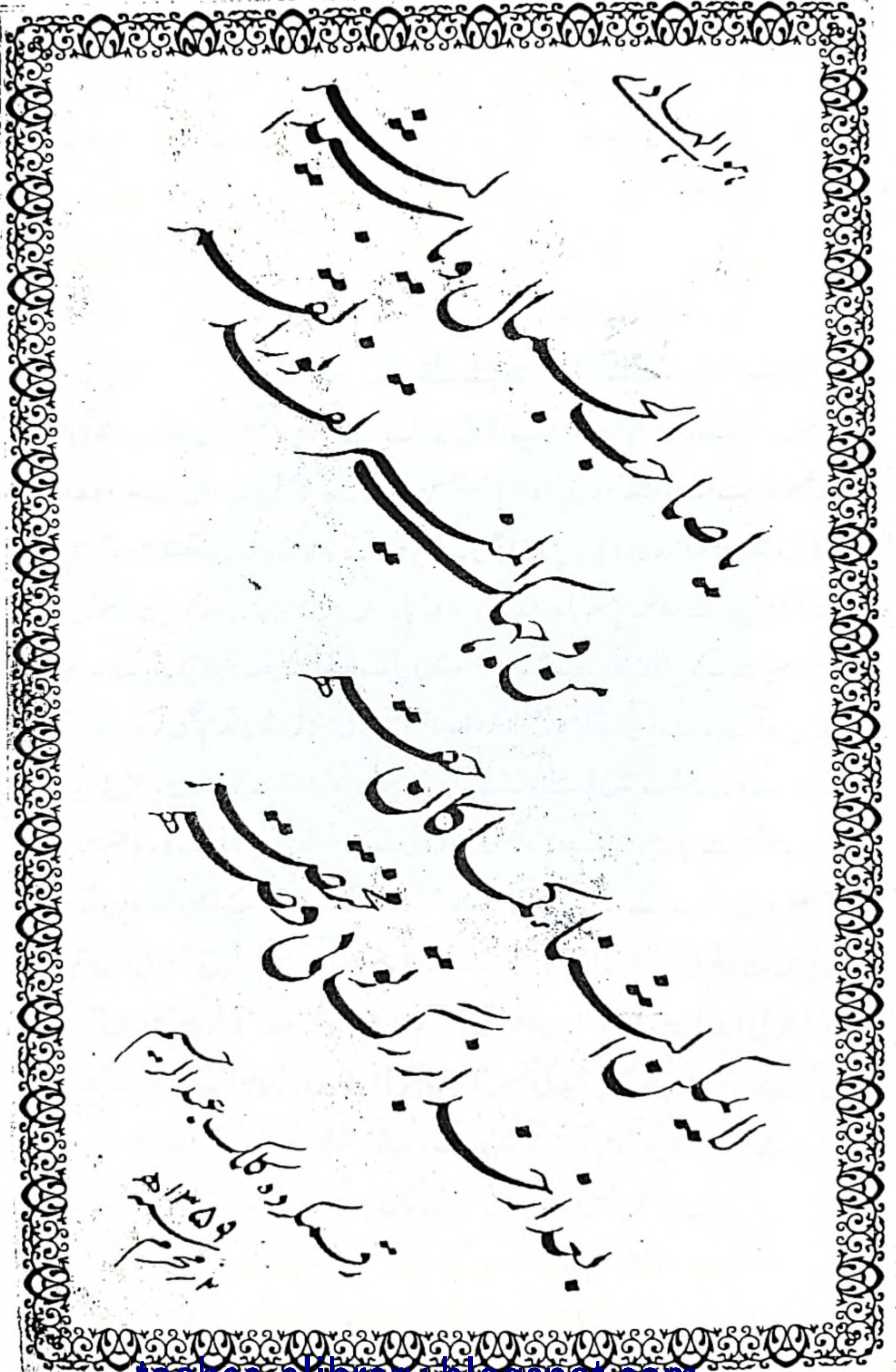
کہ مومن کے پاس وقت نزع فرشتے آتے ہیں، اسے سلام کرتے ہیں، جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ جب روح پرواز کر جاتی ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور نماز جنازہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے مومن بندے کو ملک الموت کے ذریعے سلام پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، وَارْحَمْهُ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ای تیر غمت را دل عشاق نشانہ
خلقی بہ تو مشغول و تو غائب ز میانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بہ خانہ

مشق فقیر محمد عبدالرشید نعمانی غفر اللہ لہ سنہ ۱۳۸۸
پنجشنبہ قبل عصر ۲۸ ربیع الثانی


لا تقنطوا من رحمة الله
فقیر حافظ عبدالکریم بعمر ہشتاد سالگی تحریر نمود
وقت عصر ہفتہ ہم رجب ۱۳۰۶ ھ



مولانا سعد حسن خاں

(۱۹۰۳ء۔۱۹۷۶ء)

بھولے بھولے، معصوم معصوم، کھلے کھلے: سفید براق سی ڈاڑھی، چہرے پر سرخی کی آمیزش نمایاں، معلوم ہوتا تھا تازہ تازہ بنیر (سوات) سے نقل مکانی کر کے آئے ہیں۔ مدّت ہوئی نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ اب تو خواب میں بھی کبھی نہیں آتے۔ مولانا سعد حسن خاں صاحب، حضرت شیخ حیدر حسن خاں شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بڑے صاحب زادے تھے۔ بچپن ہی سے ہم مولانا کو دیکھتے چلے آئے ہیں۔ ان کی شفقتیں، ان کی محبتیں، ان کی تواضع، ان کا ایثار، ان کا حلم، ان کا علم و فضل، ان کا زہد و تقویٰ سب آنکھوں میں اب تک بسا ہوا ہے۔

عام طور پر بچّے بڑوں سے دور ہی رہتے ہیں اور اپنے ہم سنوں میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ یہی ہماری بھی حالت تھی، مگر مولانا کی شخصیت میں کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ بے اختیار طبیعت ان کی طرف کھنچتی چلی جاتی تھی۔ جب بھی وہ تشریف لاتے ہم سب بہن بھائی گھر گھر کر ان کے پاس آکر بیٹھ جاتے اور ان کی پر لطف باتوں سے محظوظ ہوتے۔ وہ ایک ایک کا حال دریافت کرتے اور ہر ایک کی دلچسپی سے متعلّق باتیں کرتے۔ ان باتوں میں کیسی مٹھاس اور کیسی اپنائیت تھی کہ بھولے نہیں بھولتی۔ والد صاحب قبلہ سے بڑے تھے اور ہم انھیں حقیقی تایا ہی سمجھتے تھے۔ دونوں گھرانے اس طرح گھل مل گئے تھے کہ یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ہم الگ ہیں وہ الگ، والد صاحب اور مولانا کا تو ایسا قلبی تعلّق تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مولانا اپنے گھر سے ہمارے یہاں آنے کے لیے نکلے اور والد صاحب مولانا سے ملنے، جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو آپ ہی سے ملنے گئے ہیں۔ یہ محبت، یہ تڑپ اب کہاں؟ یہ

ان دونوں حضرات کا قلبی تعلق ہی تو تھا کہ ان کی اولاد میں بھی مثالی محبت قائم ہوئی۔ مولانا کے ماشاء اللہ نو بچے تھے۔ مجھ سے بڑے حبیب حسن خاں اور عزیزہ آپا، ان کے شوہر ظفر حسن خاں صاحب معجم المصنفین کے پوتے تھے۔ ہم بھی اللہ کے فضل سے نو بہن بھائی ہیں، آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ کسی کو یہ احساس تک نہ تھا کہ ہم میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ وہی ہنسی مذاق، وہی نوک جھونک جو بہن بھائیوں میں روا ہوتی ہے، ہم میں بھی تھی۔ شکر رنجی کی کوئی بات کبھی پیش نہیں آئی۔ آج جب کہ دور دور ہو گئے ہیں۔ نفسا نفسی اور خواہش پرستی کا دور دورہ ہے، ہم اسی محبت وخلوص سے ملتے ہیں جیسے پہلے ملتے تھے۔

مولانا بڑے ذی علم اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے، تعلیم و تعلّم میں ساری زندگی بسر کردی۔ علم حدیث اپنے والد اور چچا مولانا محمود حسن خاں سے حاصل کیا، اس کے علاوہ مدرسہ الٰہیات کانپور میں پڑھا اور پھر وہاں پڑھایا بھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد ٹنڈو الہ یار، تعلقہ حیدرآباد میں بہت سے اکابرین کے ساتھ پڑھایا۔ بعد میں حیدرآباد منتقل ہو گئے یہاں نور محمد ہائی اسکول میں عربی واسلامیات کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں پبلک اسکول لطیف آباد میں آ گئے۔ یہاں مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اب ہم شعور کی منزل میں قدم بھی رکھ چکے تھے۔ مولانا کے شب و روز سنّت میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اسکول کے اوقات کار ہوں یا عزیز و رشتے داروں سے تعلّقات نباہنے کی بات ہو، تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہو یا عبادت و ریاضت سے متعلّق معمولات سب کے لیے یکساں وقت نکالتے تھے۔ ''مقدمۂ ابن خلدون''، شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی ''تحفۂ اثناعشری'' کا ترجمہ کیا۔ مسند امام اعظم کی شرح، ''نبوی لیل ونہار''، ''المنجد'' (عربی اردو لغت)، ''اسلامی اخلاق''، ''دنیا کا مسافر'' اور ''آخرت کا راہی'' وغیرہ کتابیں لکھ چکے تھے۔ اب قرآنِ مجید کی تفسیر ''اعجاز القرآن واسرار البیان'' کے نام سے لکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود مزید تعلیم کی جستجو میں لگے رہتے۔ میٹرک، انٹر، بی اے اور ایم اے اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اب بھی سیری نہیں ہوئی۔ بلاشبہ تشنگانِ علم کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ وہ ہر لحہ نت نئے علوم کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء کی بات ہے مولانا کو عربی میں ایم اے کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت سندھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر امۃ اللہ،

صدر شعبۂ عربی تھیں۔ مولانا ان کے پاس گئے، اپنا مدعا بیان کیا کہ ہم ایم اے کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر امۃ اللہ ایک تو طبقۂ نسواں میں سے، دوسرے اتنے بڑے عہدے پر فائز۔

خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آہی جاتی ہے

فرمانے لگیں، ہم پہلے آپ کا امتحان لیں گے۔ آپ ''مقاماتِ حریری'' کا کوئی ایک مقامہ پڑھ آیئے، ایک ہفتہ اس کے لیے کافی ہے۔ مولانا سادہ طبیعت، سادہ مزاج، چپ چاپ چلے آئے۔ دوسرے ہی روز مولانا، ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ وہ دیکھتے ہی بولیں، آپ آج ہی آگئے۔ اچھا بتایئے، کون سا مقامہ آپ نے پڑھا ہے؟ مولانا نے نہایت سادگی سے جواب دیا، رات ہم نے پوری ''مقاماتِ حریری'' پڑھ لی، آپ جہاں سے چاہیں، امتحان لے لیں۔ اسی دوران پروفیسر غلام نبی جیلانی صاحب تشریف لے آئے، یہ بھی شعبۂ عربی میں پروفیسر تھے اور مولانا سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا، حضرت! آپ کیسے؟ مولانا نے کہا، ہم آپ کے شعبے میں داخلہ لینے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ ''مقاماتِ حریری'' کا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ پروفیسر صاحب فرمانے لگے، استغفر اللہ! اور ڈاکٹر صاحبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا، ذرا ''المنجد'' اٹھایئے اور اس کے مترجمین کی فہرست پر نظر ڈالیے۔ پہلا ہی نام مولانا کا ہے۔ پھر فرمایا، حضرت! آپ کا داخلہ تو ہو گیا آپ کو کسی امتحان کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمارے لیے تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ اس طرح ہمیں آپ سے استفادے کا موقع مل جائے گا۔ داخلے کے بعد مولانا نے بڑے ضبط و ایقان سے تمام نصابی کتب کا مطالعہ کیا۔ دوسرے ہی سال میں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ ایک روز میں نے مولانا سے کہا کہ شعبۂ عربی میں آپ ہی اوّل بدرجہ اوّل آئیں گے۔ مولانا نے نہایت سادگی سے جواب دیا، ''میاں، ہم پاس ہو جائیں یہی غنیمت ہے۔ ہمیں تو ڈر اس کا ہے کہ ہمارے لکھے کو غلط سمجھ کر نہ کاٹ دیا جائے، حال آں کہ وہ صحیح ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہت سی ایسی کتابیں جو ہمارے مطالعے میں رہ چکی ہیں، ممکن ہے وہ ان کی نظر سے نہ گزری ہوں۔ بہر حال اس سال شعبۂ عربی میں ہی نہیں، بلکہ پوری آرٹس فیکلٹی میں مولانا اوّل بدرجۂ اوّل آئے۔ الحمدللہ دوسرے سال میں شعبۂ اردو میں اوّل بدرجۂ اوّل آیا اور لوگوں کی یہ

بات کسی حد تک صحیح ہوگئی کہ چچا بھتیجے نے یونیورسٹی پر قبضہ کر رکھا ہے۔

مولانا کی طبیعت میں مزاح بھی بہت تھا تحریف لفظی اور موقع ومحل کی مناسبت سے ایسے جملے تراشتے کہ سننے والے کے چہرے پر لطیف قسم کی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ پبلک اسکول میں عبدالمنان نامی ایک اکاؤنٹینٹ تھے ان کا بھی تعلق ٹونک سے تھا شاید مولانا کے عزیز بھی ہوں، انھیں یہ ملکہ حاصل تھا کہ آپ کچھ بھی لکھ لیں وہ اپنی خود کی ہتھیلی میں دیکھ کر بتلا دیتے تھے۔ ہم سب بیٹھے تھے سب ہی نے کچھ نہ کچھ لکھا اور عبدالمنان صاحب صحیح صحیح بتاتے رہے، جب مولانا کی باری آئی تو عبدالمنان صاحب اپنی ہتھیلی پر دیکھ کر کہنے لگے، ''میں نہیں بتا سکتا۔'' مولانا نے فرمایا، آپ ہمارا لکھا نہیں بتا سکتے کمال ہے۔ عبدالمنان صاحب کہنے لگے، آپ نے یہی تو لکھا ہے۔ اس طرح پوری محفل زعفران زار ہوگئی۔

ٹونک اور بھوپال میں چہار بیت کا بڑا رواج تھا۔ چہار بیت چار چار مصرعوں پر مشتمل رزمیہ نظم ہوتی ہے، اسے دوبیتی بھی کہتے ہیں اور یہ اکثر رباعی کے وزن پر ہوتی ہے۔ آٹھ دس افراد پر مشتمل پارٹی ہوتی ہے جو دف پر بڑے جوش و ولولے سے گاتے ہیں۔ اس میں شاعر بھی ہوتا ہے جو موقع ومحل کی مناسبت سے فی البدیہ چہار بیت کہتا جاتا ہے اور یہ محفل عموماً نصف شب تک چلتی رہتی ہے۔ مولانا بھی بڑے شوق سے سنتے تھے اور داد بھی دیتے تھے، مگر اتنی ہی دیر جتنا ان کی طبیعت کو گوارا ہوتا اور اس سے ان کے معمولات میں فرق نہیں پڑتا۔

مولانا کی سب سے نمایاں خصوصیت جو ہر ایک کو متأثر کرنے والی تھی وہ سادگی ومعصومیت تھی ان کو دیکھ کر تو خود سادگی ومعصومیت شرما جاتی ہوگی۔ زندگی کے مختلف رخ ہوتے ہیں کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ملنا ملانا، پڑھنا پڑھانا اور مولانا کی زندگی کے ان تمام رخوں میں یہ صفت درجۂ کمال پر تھی۔ مفتی ولی حسن خاں صاحب کو دیکھنے والے اگر مولانا کو دیکھ لیتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے کہ مولانا میں یہ صفت دوچند ہے اور مفتی صاحب تو ان کا پرتو ہیں۔ عمل و کردار، صورت وسیرت، ورع وتقویٰ سب میں پاکیزہ ومطہر تھے۔ ہم جانے انجانے کتنے ہی گناہ کرتے ہیں اللہ معاف فرمائے، مگر مجھے یقین ہے کہ مولانا کی زندگی میں گناہ کا نام تک نہ ہوگا۔ اللہ اللہ یہی تو صفت تھی کہ بچپن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ امی وابی آپ کے

خواب وخیال میں آتے رہے۔ حدیث شریف میں ہے: مَنْ رَآنِی فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِی، فَإِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ بِی ۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا حقیقت میں اس نے مجھے ہی دیکھا، اِس لیے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا۔

مولانا کے چھوٹے بھائی قاری اسعد حسن خان صاحب نے مجھے خود بتایا کہ دادا (بعض علاقوں میں بڑے بھائی کو بھی کہتے ہیں) بہت چھوٹے تھے تین چار سال کے ہوں گے، دوپہر کو سو رہے تھے، ایک دم اٹھ بیٹھے، خوشی میں تالیاں بجانے لگے اور کہنے لگے، ابا! حضور کی سواری آ رہی ہے۔ تین چار سال کا بچہ اپنے ماں باپ کے نام تک سے واقف نہیں ہوتا، چہ جائے کہ وہ یہ جملہ ادا کرے۔ مولانا کو اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہو جایا کرتا تھا۔ وہ والد صاحب کے علاوہ اپنے گھر میں بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد والد صاحب نے ایک حیرت انگیز واقعہ یہ سنایا کہ جب مولانا پبلک اسکول سے ریٹائر ہوئے تو بہت پریشان تھے اس لیے کہ انھیں پبلک اسکول کا دیا ہوا مکان بھی خالی کرنا تھا۔ سر چھپانے کے لیے اور کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ سخت پریشانی کا عالم تھا۔ ایسے میں اہل اللہ 'وَاسْتَعِینُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ' کی عملی تصویر بن جاتے ہیں۔ چناں چہ مولانا ایک روز چاشت کی نماز پڑھ کر مصلّے ہی پر بیٹھے رہے اور اپنے سر پر رومال ڈال کر متوجہ الی اللہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے سر پر ہاتھ رکھا ہو۔ مولانا نے رومال کھینچا اوپر کی طرف نظر کی۔ دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ خوف طاری ہو گیا ایک دم اٹھنا چاہا سر پر دباؤ ڈال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، گھبراؤ نہیں، سارے مسائل اللہ تعالیٰ حل فرما دیں گے اور پھر یہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بعد میں اللہ نے سب مسائل حل کر دیے، ایک معاہدے کے تحت معقول مشاہرے پر پبلک اسکول ہی میں رکھ لیا گیا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور ہم کیا ہیں۔ افسوس کہ مولانا کے انتقال کے وقت میں حیدرآباد میں نہیں تھا۔ والد صاحب نے ہی انھیں غسل دیا۔ فرماتے تھے، غسل کے وقت آسمان سے نور اتر رہا تھا اور ہم سب اس میں نہائے ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

☆☆☆

قاری اسعد حسن خاں

(۱۹۰۵ء۔۱۹۷۸ء)

قاری اسعد حسن خاں صاحب سے ہم بچپن ہی سے واقف تھے۔ وہ لاڑکانہ (سندھ) میں رہتے تھے جب کبھی حیدرآباد آتے تو گھر ضرور تشریف لاتے۔ ان کی آمد توپوں کی سی گھن گھرج کے ساتھ ہوتی تھی۔ باہر ہی سے پتا چل جاتا کہ قاری صاحب تشریف رکھتے ہیں اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ان کی آواز سے دل دہل جاتا، خوف کی لہر پورے جسم میں دوڑ جاتی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ اگر جنگل میں اپنی پوری توانائی سے پکار بیٹھیں تو شیر اپنی کچھار سے لرزتا ہوا نکل آئے اور حیرت واستعجاب میں دہاڑنا بھول جائے۔ شیر کی عادت ہوتی ہے کہ جب بھی کچھار سے نکلتا ہے انگڑائی لے کر دہاڑ مارتا ہے۔ بھلا قاری صاحب کی آواز کے آگے بے چارے شیر کی دہاڑ کیا معنی رکھتی ہے اور دہاڑ ہی پر کیا منحصر اگر شیر سامنے بھی آجائے تو قاری صاحب کی تیز نظروں کی تاب نہ لاکر وہیں بیٹھ جائے اور دم ہلانے لگے۔

درمیانہ قد، سرخ و سپید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، مضبوط ہاتھ پاؤں، سفید براق سی ڈاڑھی، مونچھیں بالکل صاف، عینک میں سے سرخ سرخ موٹی موٹی آنکھیں جھانکتی ہوئی، چہرے پر تبسم، نہایت بے خوف اور بے باک انسان تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شیخ الحدیث اور پرنسپل حضرت شیخ حیدر حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ والدِ محترم مولانا محمد عبدالعلیم ندوی حضرت شیخ کے چہیتے شاگرد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قاری صاحب بھی والد صاحب سے بہت محبت کرتے تھے۔ خود تو بہت بڑے عالم نہ تھے البتہ شیخ القراء قاری عبدالمالک علی گڑھی ثم ٹونکی المتوفی ۱۹۵۹ء کے شاگرد تھے۔ برسوں ان کے پاس مشق کی اور سبعہ کی سند لی۔ حیدرآباد میں اپنے بڑے بھائی مولانا سعد حسن خاں کے پاس

تشریف لاتے تھے۔ رمضان المبارک میں پبلک اسکول کی مسجد میں شبینہ تھا، وہاں قاری صاحب کو پڑھتے ہوئے سنا۔ ایک فرلانگ سے ہی پتا چل گیا کہ قاری صاحب پڑھ رہے ہیں۔ بلا کا قرآنِ مجید یاد تھا، صحیح سچے مخارج، قواعد وضوابط کی پابندی، روانی، لحن عرب میں کلامِ ربانی کی تلاوت ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ حدر میں ایسا قرآنِ مجید پڑھنے والا نظر سے نہیں گزرا۔

۱۹۷۳ء میں جب گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں میرا تقرر ہوا تو میں قاری صاحب ہی کے پاس جا کر ٹھہرا۔ دل میں خوف تو تھا ہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح وقت گزرے گا، مگر مجبوری تھی، خیال تھا دو چار روز میں علاحدہ جگہ لے کر وہاں منتقل ہو جاؤں گا، لیکن جب ان کی محبت وشفقت دیکھی تو دل سے خوف دور ہوا اور طرح طرح کے وسوسے جو دل میں جمے ہوئے تھے ختم ہوئے۔ میں نے لاڑکانے میں ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کی زندگی اتباعِ شریعت کا مکمل نمونہ تھی، ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا سب عین سنت کے مطابق تھا۔ میں نے اپنے والد کو دیکھا ہے جب بھی حضرت شیخ حیدر حسن خان کا تذکرہ آتا جوشِ محبت وعقیدت میں رونے لگتے، مجھے ہمیشہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی، میں اپنے دل میں کہتا کہ یہ کہیں دِکھاوا تو نہیں ہے۔ ہمارے بھی اساتذہ ہیں، ہمیں بھی اپنے اساتذہ سے محبت ہے، لیکن ایسی محبت کیسی کہ نام آتے ہی رونے لگیں، مگر جب میں نے لاڑکانے میں قاری صاحب اور ان کی اہلیہ (چچی بی) کی شفقت ومحبت دیکھی تو یقین آیا کہ حضرت شیخ بلاشبہ ایسے ہی ہوں گے کہ ان کے تذکرے پر فرطِ عقیدت سے آنکھیں چھلک آئیں۔

گرمیوں کا زمانہ اور پھر لاڑکانے کی گرمی، صحن میں تین چار پائیاں بچھ جاتیں۔ درمیان کی چارپائی پر میں سوتا۔ میں ہمیشہ سے دو تکیے لگانے کا عادی تھا اگر کبھی اتفاق سے ایک تکیہ لگا ہوتا تو چچی بی قاری صاحب سے کہتیں کہ عبد المقیت ایک تکیہ لگائے سو رہا ہے گردن میں درد ہو جائے گا۔ اور قاری صاحب میرے سرہانے ایک تکیہ اور لگاتے۔ ان کی شفقت ومحبت دیدنی تھی، ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے، گوشت کے بڑے شوقین تھے۔

بوٹیاں میرے آگے کرتے جاتے، زبردستی کھلاتے اور بہت خوش ہوتے۔ جب وہ میری طرف دیکھتے یوں معلوم ہوتا کہ ساری محبت سارا پیار ان کی نظروں میں سمٹ آیا ہے۔ کبھی کبھی سرگوشی کے انداز میں کہتے، ابا تیرے باپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی اس سے محبت ہے اور اب تو تُو میرے پاس ہی ہے، لیکن یہ عارضی زندگی ہے، اُسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ان کی ساری محبت اور ساری نفرت محض اللہ کے لیے تھی۔ وہ اس تمام شفقت و محبت کے ساتھ مجھ سے ناراض بھی رہتے۔ اس لیے کہ میں اکثر ان کے ساتھ جماعت میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ میرے پروفیسر دوستوں کے سامنے بھی شدّت سے ناراض ہوتے۔ فرماتے، باپ بچپن سے تہجد گزار اور یہ خبیث نماز نہیں پڑھتا۔ میں خاموشی سے سنتا رہتا، جانتا تھا کہ اسی میں عافیت ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ اگر قاری صاحب کو لاڑکانے کا ڈپٹی کمشنر بنادیا جائے تو سب سے زیادہ کم بختی تمھاری آئے، ہمیشہ پابہ زنجیر نظر آؤ۔

پروفیسر عزیزالدّین مرحوم بھی اسی محلّے میں رہتے تھے۔ نماز جمعہ میں وہ ان سے مصافحہ ضرور کرتے تھے، ان سے بڑی محبت سے ملتے تھے، پھر میرا ان کا تعلّق کچھ زیادہ ہی تھا اس لیے بھی ان کی تعظیم و تکریم کرتے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر کریم الدّین احمد، پروفیسر عزیزالدّین صاحب اور میں باتیں کررہے تھے، قاری صاحب تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر کریم کیمیونسٹ مزاج کے آدمی تھے۔ بے دھڑک کچھ بھی کہہ دیتے تھے، خاص طور پر مذہبی معاملات میں۔ ہم لوگ نہایت محتاط رہ کر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ قاری صاحب نے اس مجلس میں اسلامی شعائر پر بات کرنی شروع کردی۔ میں اور عزیز صاحب بہت ڈرے کہ ڈاکٹر کریم کوئی غلط بات مُنہ سے نہ نکال دیں۔ ابھی ہم اٹھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کریم صاحب نے نہایت خفیف انداز میں کہا کہ یہ سب ایسی ہی باتیں ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ قاری صاحب کی پٹھانی رگ پھڑک اُٹھی، اسلامی غیرت جاگ گئی۔ ڈاکٹر کریم کی ٹھوڑی پر انگلیاں لگا کر تیز آواز میں کہنے لگے، یہ یہودیوں کی سی شکل لے کر اللہ میاں کے پاس جاؤ گے۔ ابھی ڈاکٹر کریم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ عزیز بھائی نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر

کریم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ضروری کام کا بہانہ لے کر نکلے چلے گئے۔ تب کہیں میری جان میں جان آئی۔ قاری صاحب ہمیشہ بارہ بور کی بندوق بھری ہوئی چارپائی پر ہی رکھتے تھے۔ خدانخواستہ اگر ڈاکٹر کریم کوئی بات خلاف اسلام کہہ دیتے تو یقین ہے کہ وہ انھیں اسی وقت گولی مار دیتے۔

اس کے برعکس ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک روز جب میں کالج سے فارغ ہو کر آیا تو دیکھا ایک بہت بوڑھا سندھی چارپائی بُننے کے لیے بان کے گٹھے بنا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا قاری صاحب خود اس کے پاس بیٹھے بان سلجھا رہے تھے اور چارپائی بُننے میں بھی برابر اس کے شریک رہے۔ جب چارپائی بُن گئی تو اس بوڑھے کو اپنے ساتھ بٹھا کر بڑی محبت سے کھانا کھلایا اور چلتے وقت اس کی پوری مزدوری ادا کی۔ میں نے کہا، قاری صاحب! اس بے چارے بوڑھے کے ہاتھ میں رعشہ ہے، کام اب سے ہوا نہیں، چارپائی تک یہ کس نہ سکا۔ آپ کسی جوان آدمی کو بلاتے۔ فرمانے لگے، اس شخص کی عمر ۱۳۰/سال ہے۔ کیا یہ عظمت کی بات نہیں کہ اب بھی یہ محنت مزدوری سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم جن لوگوں کو حقیر سمجھتے ہو، اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے۔ وہ اگر اللہ سے سوال کرلیں تو اللہ پر ان کے سوال کا پورا کرنا واجب ہو جائے۔ میں ان کے یہ جذبات و احساسات دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ بلاشبہ ان کی محبت، ان کی نفرت، سب اللہ کے لیے تھی۔

وہ قرآن کے عاشق تھے، قرآن ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ قاری صاحب بے خبر سو رہے تھے ایک دم بہ آوازِ بلند قرآنِ مجید کی تلاوت شروع کردی، میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، سمجھا شاید طبیعت زیادہ ہی خراب ہے کہ اس طرح مرض سے توجہ ہٹا رہے ہیں۔ چچی بی بے ساختہ بول اٹھیں سو جا، انھیں کچھ نہیں ہوا، یہ تو ایسے ہی بے خبر سوتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں، ہمیشہ کی عادت ہے۔ اللہ اکبر! کس طرح قرآنِ مجید رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے تھا کہ گہری نیند میں بھی پڑھ رہے تھے۔ ماہر نفسیات اسے کیا نام دیں گے؟ مجھے ایک مرتبہ خیال ہوا کہ قاری صاحب سے قرآنِ مجید پڑھ لیا جائے۔ میں نے یہ خیال چچی بی پر ظاہر کیا۔ انھوں نے گھبرا کر کہا، مت پڑھیو، بہت مارے گا۔ کچھ اس انداز سے انھوں نے فرمایا کہ خوف سے میرے رونگٹے

کھڑے ہو گئے اور میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔کیسی بدنصیبی تھی۔

قاری صاحب بڑے وضع دار، ملنسار، متواضع، بے پناہ شفقت و محبت کرنے والے انسان تھے، اللہ تعالیٰ پر کامل یقین اور بھروسا تھا۔لاڑکانہ محلہ دڑی مین ایک مسجد تعمیر کی تھی اسی میں مدرسہ تھا، قاری صاحب قرآن پڑھاتے اور قرأت کی مشق کراتے تھے۔آخیر میں تو وہ مدرسہ بھی بس برائے نام ہی رہ گیا تھا۔آمدنی کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں تھا، لیکن کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا، غیب سے اللہ تعالیٰ مدد فرماتے۔خوب اچھے سے اچھا کھاتے تھے، گوشت کے بے حد شوقین تھے۔اصلی گھی کھاتے نہیں تھے پیتے تھے، بیماری بھی کوئی نہیں تھی، کبھی ہم نے ڈاکٹر کے پاس جاتے نہیں دیکھا۔یہ سب ان کے والد حضرت شیخ کی دعاؤں کا اثر تھا۔والد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت شیخ ان کے لیے بڑے متفکر رہتے تھے۔خصوصیت سے دعائیں کرتے تھے۔

قاری صاحب بڑے بذلہ سنج اور مرنجان ومرنج قسم کے انسان تھے۔تحریف لفظی سے مزاح پیدا کرنے میں انھیں خاص ملکہ تھا کوئی بات کریں فوراً مزاحیہ جملہ تیار۔بڑے مزے مزے کے لطیفے سناتے تھے۔ان کی مجلس میں بور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔زبردست شکاری رہ چکے تھے شکار کے واقعات اس طرح سناتے گویا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ایک مرتبہ فرمانے لگے، کہ ہمارے ایک دوست بھی شکار کے بڑے شوقین تھے، زمیں دار آدمی تھے، ایک بیل گاڑی بھی انھوں نے شکار ہی کے مقصد کے لیے لے رکھی تھی۔بہترین قسم کے بیلوں کی جوڑی ان کے پاس تھی۔ایک روز شکار کے لیے نکلے ایک اور دوست بھی ساتھ ہو لیے وہ بڑے جان دار اور قوی ہیکل آدمی تھے۔راستے میں ایک بیل اڑ کر کھڑا ہو گیا، چلتا ہی نہیں، بڑی مشکل سے اسے ہانکا تھوڑی دور جا کر پھر بیٹھ گیا۔اب لاکھ جتن کیے وہ ٹس سے مس نہیں ہوا، بڑے پریشان کہ اب کیا کریں۔وہ صاحب فرمانے لگے، لاؤ میں دیکھتا ہوں۔انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بیل کے ایک زوردار گھونسا مارا اور ساتھ ہی ساتھ ڈانٹ بھی پلائی، چلتا ہے کہ نہیں خبیث۔بس یہ کہنا تھا کہ بیل اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا، تھوڑی دور جا کر پھر بیل اکڑنے لگا ان صاحب نے پھر ڈانٹ پلائی بیل اب تو چلنے کیا

دوڑنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد از راہِ تفریح ان صاحب نے پھر زوردار آواز میں ڈانٹا، بیل پھر وہیں بیٹھ گیا۔ زمیں دار صاحب نے کہا، تم خاموش چلو اس طرح تو میرا بیل خراب ہو جائے گا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ سال چھ مہینے بعد وہ صاحب پھر تشریف لائے۔ انھوں نے پوچھا، تمھارے بیلوں کی جوڑی ٹھیک ہے؟ کہنے لگے، اللہ کا شکر ہے باڑے میں بندھی ہے۔ اب پھر انھوں نے وہیں سے ڈانٹ پلائی بیل رسی تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ واقعہ سن کر ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور قاری صاحب مسکراتے رہے نہیں معلوم کہ یہ حقیقت تھا یا ہماری تفریح کے لیے سنایا گیا تھا۔

ایک مرتبہ عمِ محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے پاس بہاول پور پہنچے۔ ان دنوں مولانا نعمانی جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں شیخ الحدیث تھے اور مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الجامعہ تھے۔ فرمانے لگے، میں عبدالرشید کے ساتھ ناظم ندوی صاحب کے دفتر گیا اور تاکید کر دی کہ میرا تعارف مت کرانا دیکھیں وہ مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ وہ نہیں پہچانے غرض انھیں مختلف واقعات یاد دلائے تو پہچان گئے اور معانقہ کیا۔ رونے لگے اور کہنے لگے، آج ہم جس مقام پر ہیں سب آپ کے والد کی وجہ سے ہے۔ پھر کہنے لگے، آپ کھانا ہمارے ہی ساتھ کھائیے گا۔ آج گوشت کا ناغہ ہے اس لیے جو آپ فرمائیں اہتمام کیا جائے۔ قاری صاحب نے فرمایا، کون کہتا ہے گوشت کا ناغہ ہے؟ وہ ابھی استعجاب کی کیفیت سے نکل نہ پائے تھے کہ قاری صاحب کہنے لگے، مرغی کا گوشت کیا گوشت نہیں ہوتا۔ پھر سب مسکرانے لگے۔ غرض قاری صاحب کی طبیعت میں مزاح بہت تھا۔

قاری صاحب اپنی اہلیہ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ہم انھیں چچی بی کہتے تھے اور قاری صاحب حسو بی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے، وہ اسی سال کی بوڑھی تھیں۔ مُنہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں، مگر جوانوں سے زیادہ اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھتی تھیں، ہمیشہ مہندی سے ان کے ہاتھ سرخ رہتے تھے۔ کانوں میں سونے کی بہت سی بالیاں، ململ کے کرتے میں سونے کے بٹن سونے کی چین کے ساتھ لگے ہوئے، ریشمی چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے رہتی تھیں، میدے کی طرح سپید رنگ اس پر پان کی سرخی سے ہونٹ لال، آج

کے دور کی لپ اسٹک بھی اس کے حسن کا کیا مقابلہ کرے گی ، بالکل ابراہیم ذوق کے اس شعر کے مطابق ان کا نقشہ تھا:

پان کی سرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوسِ قزح سے
دام برائے گردنِ عنقا، چشم و چراغ دیدۂ حوا

چار پائی پر کڑھی ہوئی چادر بچھی ہوئی ، پہلو میں دو دو گاو تکیے، ان سے ٹیک لگا کر بیٹھتی تھیں۔ سردی ہو یا گرمی ، دو تھرماس چار پائی کے نیچے رکھے ہوئے ، ایک میں نرا برف اور دوسرے میں برف کا پانی ، اس پر چھوٹی سی نقشین کٹوری رکھی ہوئی اور ساتھ ہی ایک بڑا مراد آبادی نقشین پان دان دھرا ہوا۔ اس پر سرخ رنگ کا گوٹے کنارے سے مزین پان دان پوش ، پان دان کھولو تو خوشبو کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ اس میں بہت سی کلیا ئیں اور بہت سی ڈبیا ئیں، کتھا چونا عرق گلاب اور کیوڑے میں بھگویا ہوا۔ کسی ڈبیا میں زعفران، کسی میں جاوتری، کسی میں الائچی دانے۔ پھر ایک چھوٹا سا سروتا الائچی دانے کترنے کے لیے ، ایک اور سروتا جس میں ایک ڈبیا جڑی ہوئی کہ پان کو اس سے کترتیں کیوں کہ مُنہ میں دانت تو تھے ہی نہیں۔ پان دان کے ساتھ ایک پیتل کی کٹھالی بھی ہوتی اس میں پان چھالیا کوٹتیں اور چھوٹی سے چمچی سے نکال کر مُنہ میں رکھتیں ، مولوی عبدالحلیم شرر نے ''گذشتہ لکھنؤ'' میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ میں نے تو بہ چشمِ خود دیکھ لیا ہے۔

لکھنوی تہذیب و معاشرت سے متعلق بہت سے لطائف مشہور ہیں۔ ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک لکھنوی اچکن پہنے گوٹے کناری کا بٹوا ہاتھ میں لیے ٹرین میں سفر کر رہے تھے، پاس ہی ایک سرحد کے پٹھان صاحب بیٹھے تھے، ایک اسٹیشن پر لکھنوی اترے، فالسے خریدے اور دھو دھا کر دونے میں رکھ کر ٹرین میں آ بیٹھے، پھر جیب سے انھوں نے بہت ہی چھوٹا چھنگلی انگلی کے برابر چاقو نکالا، پہلے تو فالسے کا چھلکا اتارا پھر اس کی چار قاشیں کیں اور چاقو کی نوک سے ایک قاش کو مُنہ میں رکھا۔ پٹھان صاحب یہ سارا نقشہ دیکھ رہے تھے ان کے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر پوچھ ہی بیٹھے، خوچا! تم یہ کس طرح کھاتا ہے۔ لکھنوی نے نہایت متانت سے جواب دیا، ہمارے لکھنؤ میں فالسہ اسی طرح کھایا جاتا

ہے۔ یہ سن کر پٹھان صاحب کا دماغ بھک سے اڑ گیا، حیرت و استعجاب کہاں کا، غصّے کے مارے ان کی بری حالت ہوگئی۔ اگر اس وقت وہ لکھنوی صاحب کو گود میں بھر کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتے تو کچھ تعجب نہ تھا، غصّے کو ضبط کرتے رہے اور پہلو بدلتے رہے اتنے میں ایک اسٹیشن اور آ گیا، پٹھان صاحب اترے اور ایک بہت موٹی سی ککڑی خرید کر لائے، دھونا دھلانا کاہے کا، آ کر بیٹھ گئے اور جیب سے بہت بڑا سا چاقو نکالا اور لگے ککڑی کو چھیلنے، ساری ککڑی چھیل دی، بیچ میں سے اس کا گودا نکالا، اس کو ناک کے پاس لے جا کر زور سے سونگھا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ غصّے میں دانت بھینچ کر بولے،''اوئے، ہمارے ملک میں ککڑی اس طرح کھایا جاتا ہے۔''

لوگوں کے لیے تو یہ لطیفہ ہو سکتا ہے میرے لیے یہ لطیفے سے زیادہ حقیقت پر مبنی ہے۔ چچی بی نزاکت لطافت میں ڈھلی ہوئی تھیں اگر چہ وہ لکھنؤ کی نہیں تھیں بلکہ بھوپال کے پاس ایک قصبہ سرونج کی رہنے والی تھیں جو ریاست ٹونک کا ایک پرگنہ تھا اور قاری صاحب میں پٹھانی خو بو رچی بسی، اگر چہ وہ طویل عرصہ لکھنؤ میں رہے وہاں عین القضاۃ صاحب کے مدرسے میں پڑھایا بھی، مگر جبلت نہیں بدلتی، دو مختلف المزاج ہم تھے، بعد المشرقین، مجھے حیرت ہے کہ کس طرح زندگی گزاری ہوگی۔ خوشی و غم میں کس طرح ساتھ رہے ہوں گے، کس طرح ایک دوسری کی عادتوں کو ذہن میں اتارا ہوگا۔ جب کبھی قاری صاحب ناراض ہوتے تو بے چاری چچی بی دھو جنے لگتیں، میں پاس ہوتا تو مجھ سے سرگوشی میں کہتیں خصم ہے جواب دوں تو اور دو چار باتیں سننی پڑیں گی۔ ان کی ناراضی چچی بی پر نہیں ہوتی بلکہ اپنے بیٹے اور پوتوں کی کسی بات پر غصّے کی بھڑاس نکالتے تھے۔ کیسے اچھے لوگ تھے، ہنسی خوشی زندگی گزار کر چلے گئے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆☆

قاری حبیب اللہ خاں

(۱۹۱۲ء-۱۹۸۰ء)

فنافی القرآن ہم نے دو ہی اشخاص کو دیکھا ہے۔ ایک قاری اسعد حسن خان صاحب اور دوسرے قاری حبیب اللہ خان۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد اور گہرے دوست بھی تھے۔ قاری حبیب اللہ قاری، عبدالمالک صاحب کے شاگردِ خاص، قرأۃ عشرہ کے زبردست قاری تھے۔ اس کے علاوہ علم حدیث اور طب وغیرہ اپنے زمانے کے نامور علماء سے حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ میں قاضی محمد عرفان چیف جسٹس عدالت عالیہ ٹونک، مولانا حکیم برکات احمد صاحب اور شیخ الحدیث ندوۃ العلماء حضرت شیخ حیدر حسن خاں وغیرہ خاص تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انھیں حیدر آباد سندھ میں مولانا عبدالقدوس صاحب کے مدرسۂ قوۃ الاسلام میں دیکھا تھا۔ سفید ریش، بھرا بھرا جسم مٹاپے کی طرف مائل نہیں۔ چوڑی ہڈّی، موٹے فریم کی عینک لگائے ہوئے تھے، سفید قمیص شلوار میں ملبوس غالباً قراقرم کی ٹوپی پہنے ہوئے نہایت سنجیدہ متین قسم کے آدمی تھے۔ بیراج کالونی کی مسجد میں تراویح پڑھانے آئے ہوئے تھے۔ والد صاحب سے آغا صاحب کہہ کر نہایت بے تکلّفی سے ملے، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئے اور باتیں شروع، ہم بس سنتے رہے۔ اتنے میں کوئی طالبِ علم آیا اس سے قاری صاحب پشتو میں مخاطب ہوئے، بڑا تعجب ہوا یہ جان کر کہ قاری صاحب کا تعلّق سرحد کے علاقے سے ہے۔ اس سے پہلے جو اکثر ہم نے ان کا تذکرہ سنا تھا وہ لکھنؤ یا ٹونک کی نسبت سے تھا اور شاید اسی لیے وہ ہمیں کہیں سے بھی پٹھان معلوم نہیں ہوتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پیالیوں میں چائے کی بجائے مرغ کی یخنی آ گئی اس زمانے میں دیسی مرغ ہوا کرتے تھے فارمی کا تو وجود ہی نہیں تھا۔ کیسا زمانہ بدلا ہے کہ اب بچّوں کو ہی نہیں بڑوں کو بھی ہر دیسی چیز بری لگتی ہے خواہ وہ

مرغ ہو یا چوزہ۔ یخنی اتنی مزے دار تھی کہ آج تک اس کا ذائقہ نہیں بھولا۔

مدرسے میں شبینہ ہو رہا تھا کوئی قاری صاحب پڑھ رہے تھے چھوٹے بھائی حافظ محمد عبدالودود صاحب اور حافظ محمد عبدالوارث صاحب نے نیت باندھ لی۔ میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھا ان دونوں کی باہم محبت اور تعلق کا نظارہ کرتا رہا۔ میں نے اب عمر کا ایک طویل عرصہ گزار لیا ہے ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے، لیکن جو محبت و اخلاص ہمارے بزرگوں میں تھا وہ اب نظر نہیں آتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اب مفقود ہی ہو گیا ہے۔ والد صاحب فرمانے لگے، بھائی حبیب اللہ! عرصہ ہو گیا تمھارا قرآن نہیں سنا۔ قاری صاحب یہ سن کر مسکرائے اور چپ ہو گئے۔ ہمارے والد صاحب ان کے قرآن پڑھنے کے شیدا تھے، ان کے لہجے، مخارج اور اوقاف و وصل پر بس فدا تھے۔ جب کبھی وہ پڑھتے والد صاحب پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی، بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا زمانہ بڑا ناقدرا ہے صاحب فن کی اب کوئی قدر ہی نہیں رہی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ قاری صاحب بے شک اس فن کے استاد ہیں، مگر ناک میں پڑھتے ہیں۔ ہمیں تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔ ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے کچھ تو وجہ چاہیے۔ بہرحال جو صاحب شبینہ پڑھ رہے تھے، انھوں نے پارہ ختم کر کے سلام پھیرا تو قاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا، ”آؤ آغا صاحب! تمھیں قرآن سنائیں۔“ قاری صاحب نے ”اللہ اکبر“ کہہ کر نیت باندھی۔ دیکھتے دیکھتے پوری صف بھر گئی۔ مجھے اب یاد نہیں کہ قاری صاحب نے چھ پارے پڑھے تھے یا سات، سحری میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا جب انھوں نے سلام پھیرا تھا۔ ہم اس وقت فن قرأت کو سمجھتے ہی نہیں تھے۔ بس جس والہانہ انداز میں وہ پڑھ رہے تھے دل میں اترتا جاتا تھا۔ ان کے لیے دل میں ایک محبت اور عظمت کا احساس تھا جو پیدا ہوتا جارہا تھا۔ رمضان کے اخیر عشرے کی نصف شب، نور کی بارش، اللہ ربّ العزّت کا نیچے آسمان پر جلوہ گر ہونا اور اس کے ناچیز بندے کا عشق و محبت میں ڈوب کر بندگی کے احساس سے اسی کے کلام کو پڑھنا، جاں داروں ہی کو کیا شجر و حجر کو بھی متأثر کر رہا تھا۔ پرسکون اور خاموش فضا غماض تھی کہ کائنات [illegible]

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں

یہ پہلا نقش تھا جو دل پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسری مرتبہ شینے میں آخری پارا امام کسائیؒ کی روایت میں سنا۔ امام کسائیؒ امالہ کرتے ہیں یعنی زبر کو زیر کی طرف اور الف کو یا کی طرف مائل کر کے اس طرح پڑھنا کہ دونوں مجہول ظاہر ہوں۔ ہمارے یہاں چوں کہ حفص کی روایت میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لیے یہ قرأت عامی کو غلط معلوم ہوتی ہے عام طور پر قراء حضرات مختلف روایت میں ایک آدھ رکوع پڑھ لیتے ہیں اور یہ ان کی استادی کا لوہا منوانے کے لیے کافی ہوتا ہے، مگر قاری صاحب رمضان المبارک میں حفص کی روایت میں قرآن ختم کرنے کے بعد آخری پارے کو قرائے سبعہ میں سے کسی ایک امام کی روایت میں دوبارہ پڑھتے۔ ہم نے قالون اور ورش کی روایت میں بھی ان سے سنا ہے۔ پڑھتے ہوئے اگر زبان معروف قرأت (یعنی حفص) کی طرف لوٹتی بھی تو آیت ختم نہ ہو پاتی کہ احساس ہو جاتا اور اسے لوٹا لیتے۔ غور فرمایے کہ قرآن ان کے دل و دماغ میں کیسا رچا بسا تھا اور اختلاف قرأت کی کیسی مزاولت تھی کہ بسہولت پڑھ لیتے تھے۔ اب ایسے فن کار کہاں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھرے۔ آمین۔

قاری صاحب نے اپنے آپ کو قرآن کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی تھا۔ ان کی تصانیف میں ''موضح القرأت فی السبع المتواترات'' بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں ائمہ سبعہ کی قرأت میں ایک ایک حرف کے اختلاف کو نہایت سادہ اور آسان طریقے پر بیان کیا ہے۔ یہ تو پورے قرآن پر مشتمل ہے۔ قاری صاحب کے بڑے صاحب زادے قاری عنایت اللہ صاحب کی کاوشوں سے اس کے دس پارے چھپ چکے ہیں، بیس پارے ابھی طبع ہونا باقی ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ چھپ جائیں تو محفوظ ہو جائیں گے اور اہل علم کے کام آئیں گے۔ ورنہ تو ڈر ہے کہ یہ عظیم کام بھی ضائع نہ ہو جائے۔ مجھے یاد ہے لاڑکانے میں قاری اسعد حسن خاں صاحب کے پاس ایک قرآنِ مجید ان کے والد کا تھا اس پر قاری عبدالرحمٰن مکی المتوفی ۱۳۴۱ھ کے ہاتھ سے سبعہ

چڑھی ہوئی تھی اور آخر میں قاری صاحب کے دستخط بھی تھے۔ اب معلوم نہیں کہ وہ قرآنِ مجید کہاں چلا گیا۔ اس لیے ایسی نایاب و نادر چیزوں کو محفوظ کر لینا چاہیے ورنہ وقت کے ہاتھوں وہ ضائع ہو جاتی ہیں۔

قاری حبیب اللہ صاحب بڑے خلیق اور متواضع انسان تھے۔ تھے تو وہ پٹھان، مگر حلیم الطبع واقع ہوئے تھے یہ الگ بات ہے کبھی ان کی پٹھانی رگ پھڑک اٹھتی ہو جس کا ہمیں مشاہدہ نہیں ہوا۔ ہم نے تو بس ان کی ذات میں بے پناہ خلوص اور شفقت و محبت کا عنصر ہی دیکھا ہے۔ زمانے کے نرم گرم چشیدہ انسان صبر و تحمل کا پیکر نہیں ہوں گے اور کیا ہوں گے۔ حوادثات زمانہ سے اکثر نبرد آزما رہے، مگر استقلال و استقامت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اتباعِ سنّت نبوی کا ہر لمحہ خیال رہا کرتا تھا کوئی عمل ایسا نہیں کرتے جس میں کسی بھی قسم کا شک وشبہہ ہو۔ یہاں تک احتیاط برتی کہ بیٹے کو بینک میں ملازمت نہیں کرنے دی، بس نیکی و شرافت کا مجسمہ تھے۔ بلاشبہہ شرافت تو حسنِ خلق سے عبارت ہے۔

قاری صاحب کے بے شمار تلامذہ پاک و ہند اور اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سے تو اپنی شہرت کے بامِ عروج پر ہیں۔ وہ استاد تھے اور آج بھی جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں استاد ہیں، اللہ بھلا کرے قاری عنایت صاحب کا کہ انھوں نے قاری صاحب کا قرآن ٹیپ کیا ہے، اٹھارہ پارے ہی ٹیپ کر سکے ہیں۔ جب یہ حضرات موجود تھے ہمیں احساس ہی نہیں تھا کہ کتنے عظیم المرتبت لوگ ہمارے درمیان میں تھے ہم بدنصیب ان سے کچھ استفادہ نہ کر سکے۔ جب میں نے اپنے بیٹے عمیر کو حفظ پر لگایا تو ناچیز کو بھی حفظ کرنے کا خیال ہوا اور قاری صاحب کے ٹیپ سے یاد کرنے لگا۔ الحمد للہ سترہ پارے مکمل ہو چکے ہیں، اس طرح قاری صاحب آج بھی استاد ہیں۔ جَزَاءُ کُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء۔

قاری صاحب کے تین صاحب زادے ہیں اور تینوں ہی حافظ و قاری ہیں سب سے بڑے قاری عنایت اللہ ہیں بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ قاری عبدالمالک صاحب ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے، منجھلے قاری عبید اللہ ہیں امریکا میں مقیم ہیں۔ سب سے چھوٹے قاری رضوان اللہ ہیں خوب پڑھتے ہیں سانس بھی ماشاء اللہ بہت ہے۔ تجوید سے کئی کئی آیتیں ملا

کر ایک سانس میں پڑھ لیتے ہیں۔ ایس ایم سائنس کالج میں پڑھتے تھے تو قرأت میں ہمیشہ اوّل انعام لایا کرتے تھے۔ شمالی ناظم آباد میں قاری صاحب نے حفظ وقرأت کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ اب قاری عنایت اللہ صاحب اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وقت نکال کر طلبہ کو مشق بھی کراتے ہیں۔ رمضان میں تراویح کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور دونوں بھائی مل کر پڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح قاری صاحب کی تروتازہ روح یقیناً اس سے لطف اندوز ہوتی ہوگی۔

مجھ ناچیز نے کئی مرتبہ قاری عنایت صاحب سے عرض کیا کہ اٹھارہ پارے تو قاری صاحب مرحوم کی آواز میں موجود ہیں بقیہ آپ پڑھ لیں تو قرآن پورا ہو جائے گا، مگر پذیرائی نہیں ہوئی۔ آج پھر میں ان اوراق کے ذریعے درخواست پیش کرتا ہوں:

گر قبول افتد زہے عزّو شرف

☆☆☆

مولانا غلام مصطفٰے قاسمی

(۱۹۱۶ء۔ ۲۰۰۳ء)

مولانا غلام مصطفٰے قاسمی صاحب سندھ کی نامور علمی شخصیت۔ باقیات الصالحات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد تھے۔ جامعہ ملّیہ دہلی سے حضرت نے بیت الحکمۃ کے نام سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی تھی۔ جس کا کام شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو فروغ دینا تھا۔ اس مقصد کے لیے بعد میں حیدرآباد سندھ میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا۔ مولانا اس کے کرتا دھرتا تھے۔

باب الاسلام سرزمین سندھ بڑا مردم خیز خطّہ رہا ہے۔ یہاں ہر دور میں بڑے اہل علم اور صاحبِ کمال لوگ ہوئے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے قدومِ میمنت لزوم سے یہ خطّہ سعادت افروز رہا ہے۔ تاریخ و رجال کی کتابوں میں بہت سی شخصیات، مثلاً الدیبلی، المنصوری اور السندی کی نسبت سے ملتی ہیں ان کا کسی نہ کسی طور سندھ کے علاقے سے تعلق رہا ہے۔ صحابہ و تابعین کے علاوہ ہر دور میں حدیث، فقہ، تفسیر، شاعری، طب غرض مختلف علوم میں بے شمار لوگ گزرے ہیں اور ان میں سے بہت سوں کی علمی یادگاریں ہنوز محفوظ ہیں۔ ایسی شخصیات میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی (۱۷۰ھ)، ابومحمد خلف بن سالم السندی، ابونصر السندی، ابواعلیٰ السندی (۲۶۱ھ)، ابوجعفر الدیبلی (۳۲۲ھ)، شاعری میں ابوالعطا السندی (م ۱۸۰ھ) اور ابوضلع السندی نے دیارِ عرب میں بہت شہرت پائی۔ ان کے علاوہ سندھ کے نامور علماء میں علاّمہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، علاّمہ مخدوم محمد معین ٹھٹوی، ابوالحسن ڈاہری، ابوالحسن کبیر سندھی محدّث مدنی، شیخ محمد حیات سندھی مدنی، علاّمہ ملا محمد عابد سندھی، مولانا عبیداللہ سندھی اور نہ معلوم کتنے اہل علم یہاں گزرے ہیں۔ آخر میں

بقیۃ السلف ہمارے مولانا غلام مصطفٰے قاسمی صاحب ہیں یہ سندھ کی ایسی شخصیت تھے جو خود اپنی ذات میں اکیڈمی کا درجہ رکھتے تھے۔

مولانا قاسمی سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جب ہم ایم اے کے طالبِ علم تھے۔ علم کی تھوڑی بہت شدبد ہوگئی تھی۔ اسی لیے اہلِ علم سے ملنے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ خصوصاً سندھ کے علماء سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مولانا سے ملاقات ناگزیر تھی۔ والد صاحب کو وہ جانتے ہی تھے اس حوالے سے ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ بہت محبت سے ملے، والد صاحب، تایا، چچا سب کی خیریت دریافت کی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ سے ضیافت کی۔ موسم ٹھنڈا تھا۔ مولانا شلوار قمیص پر کوٹ پہنے ہوئے تھے، پیشانی کشادہ، بال سفید، ڈاڑھی کے ساتھ گھنی مونچھیں بھی تھیں، آنکھیں موٹی تھیں، عینک لگاتے تھے۔ اگر عینک اتار دیں تو آنکھیں جسم میں گڑتی ہوئی معلوم ہوں۔ ہم ان کے علمی کاموں سے پہلے ہی سے متأثر تھے اور اب ان کے اخلاق نے بھی ہمیں گرویدہ بنادیا تھا۔

مولانا قاسمی، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے۔ عربی، فارسی اور سندھی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ علمائے سندھ کی بہت سی عربی تصانیف کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے۔ پہلے اکیڈمی سے ''الرحیم'' کے نام سے اردو میں ماہنامہ نکلا کرتا تھا اور پروفیسر محمد سرور صاحب ایڈٹ کرتے تھے۔ مولانا کے دور میں ''الرحیم'' سندھی زبان میں ہوگیا اور ''الولی'' کے نام سے اردو میں نیا پرچہ نکلنے لگا۔ دونوں کو مولانا ہی ایڈٹ کرتے تھے۔ یہ پرچے بڑے علمی و ادبی اور تحقیقی تھے، بہت مفید مقالات ان میں نکلے ہیں۔ مولانا دن رات علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے اور کوئی مشاغل تھے ہی نہیں۔ ساری عمر ولی اللہی فلسفے کی ترویج و اشاعت اور علمائے سندھ کی تصانیف کو منظرِ عام پر لانے میں گزار دی۔ مولانا کا حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ عہد قدیم سے اپنے دور تک کے رجال علم ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ انھوں نے تفسیر، فقہ اور حدیث سب ہی پر کام کیا۔ شاہ ولی اللہ کے قرآنِ پاک کے ترجمے کو سندھی زبان میں منتقل کیا، حضرت نوح بالائیؒ کے قرآن مجید کے ترجمے کو اوّل مرتبہ انھوں نے ہی ایڈٹ کیا۔ اس سے

قبل استاد محترم ڈاکٹر غلام مصطفے خاں صاحب نے ۱۹۶۲ء میں اس کا پہلا پارہ شائع کیا تھا۔ یہ برصغیر پاک و ہند کا پہلا فارسی ترجمہ ہے۔ شاہ ولی اللہ کی ''الخیر الکثیر'' اور علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کی ''وسیلۃ الغریب الیٰ جناب الحبیب'' کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے بے شمار مقالات بھی لکھے۔ دینی علوم کے ساتھ سندھی زبان و ادب پر بھی مولانا کی گہری نظر تھی، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے معنی و مطالب پر انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ سندھی زبان کے رسم الخط اور سندھی نثر کی تاریخ سے متعلق بہت قیمتی مقالات تحریر کیے۔ غرض ساری زندگی علمی، ادبی اور تحقیقی کام کرتے رہے ہیں۔

مولانا بڑے ہنس مکھ، زندہ دل اور متحمل مزاج واقع ہوئے تھے۔ میں جب کبھی ان کے پاس جاتا بہت خوش دلی سے ملتے، علمی گفتگو کے دوران اکثر لطائف بھی بیان کرتے اور پوری محفل زعفران زار ہو جاتی۔ مولانا سینٹرل جیل کے پاس صحافی کالونی میں رہتے تھے وہیں قریب میں کلہوڑے خاندان کے کسی وزیر یا نواب کا مقبرہ تھا اس کے احاطے میں پیر عبدالقدوس صاحب اپنے مدرسے قوۃ الاسلام کی جانب سے عیدین کی نماز کا اہتمام کرتے تھے۔ والد صاحب ان کے حکم کے مطابق وہاں عیدین کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا بھی وہاں نماز پڑھتے تھے۔ مولانا نماز سے جلد فارغ ہو کر اپنے بنگلے پر آجاتے اور گیٹ پر کھڑے والد صاحب کا انتظار کرتے رہتے۔ جب والد صاحب فارغ ہو کر ادھر سے گزرتے تو معانقہ کرتے۔ یہ تعلق یہ رواداری اب کہاں۔ مولانا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، مجھے اپنا بھتیجا کہتے تھے۔ جب میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا تو ایک دو مرتبہ میں نے مولانا کو اپنا کام دکھایا، بہت خوش ہوئے۔ میرے کام کے سلیقے کی بڑی تعریف کی اور اس وقت جو طلبہ خدمت میں حاضر تھے ان کو دکھایا اور ان سے کہا، اس طرح تحقیقی کام کیے جاتے ہیں۔ ان کے یہ ریمارکس میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ایک بات میں نے خاص طور پر یہ محسوس کی ہے کہ بعض اوقات علمی معلومات فراہم کرنے میں وہ زیادہ فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، کم از کم میرے ساتھ تو یہی معاملہ تھا۔ مجھے ایک زمانے میں علمائے سندھ پر کام کرنے کا خیال پیدا ہوا میں نے بہت سا مواد بھی جمع کرلیا۔ گیارھویں بارھویں

صدی ہجری کے ایک محدّث کا سرسری سا تذکرہ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ غالبًا خود مولانا کی کسی تحریر میں تھا۔ اس وقت نام یاد نہیں آ رہا۔ میری یادداشت میں یقینًا محفوظ ہوگا۔ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ ان کا تذکرہ کہاں ملے گا۔ مولانا یہ کہہ کر ٹال گئے کہ تلاش کرو۔ میں پھر گیا، پھر میں نے کہا، مولانا نے فرمایا، تلاش کرو، اس وقت حافظے میں نہیں ہے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر گیا اور عرض کیا کہ بہت تلاش کیا، مگر کہیں ان کا تذکرہ نہیں ملا، فرمانے لگے، ابوغدّہ کے ہاں کہیں مل جائے گا۔ میں نے عرض کیا، اس کتاب کی نشاں دہی فرمادیں۔ فرمانے لگے، آپ خود ہی تلاش کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیا نام دوں۔ میری خوش فہمی یہ ہے کہ یہ بھی میری تربیت کا ایک حصہ تھا۔ ورنہ تو بہت سے ان کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کر چکے تھے۔ اگر یہ ان کی طبیعت کا بخل تھا تو کسی ایک کو بھی ڈگری نہیں ملتی۔

مولانا کی خدمت میں مَیں اپنے ولیمے کا کارڈ لے کر پہنچا، کارڈ دیکھتے ہی مولانا نے ''السلام علیکم'' پر انگلی رکھ دی۔ میں نے دیکھا، ''السلام وعلیکم'' 'واؤ' کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ فرمانے لگے، ایسی غلطی آپ کے ہاں نہیں ہونی چاہیے۔ میں بڑا شرمندہ ہوا۔ پروف پڑھتے وقت نظر ہی نہیں گئی۔ بلاشبہ وہ استاد تھے اور استاد کی نظر غلطیوں پر ہی فوراً جاتی ہے۔ مولانا اپنی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر ولیمے میں شریک ہوئے اور جب تک وہاں رہے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے میں ان کی اس محبت وشفقت کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں کراچی منتقل ہوگیا تو ملاقات کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ مہینوں میں کبھی ملاقات ہوتی۔ جب میری آخری ملاقات ہوئی اس وقت وہ اپنی بینائی کھو چکے تھے۔ مجھے میری آواز سے انھوں نے پہچانا۔ اللہ اللہ کیسی محبت والے انسان تھے۔

مولانا کی ذات حیدرآباد سندھ میں علم کا مرکز ومحور تھی۔ وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، مولانا سعد حسن خاں صاحب چلے گئے، والد صاحب چلے گئے، پیر عبدالقدوس صاحب چلے گئے، مولانا ابوالفتح محمد صغیرالدّین صاحب چلے گئے، مولانا محمد فاضل شمسی صاحب چلے گئے اور اب استاد محترم جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب بھی رخصت ہوگئے۔ اتنی بڑی بڑی نابغۂ روزگار ہستیوں سے حیدرآباد یکسر خالی ہوگیا۔ اکّادکّا اگر کوئی باقی ہے تو وہ بھی چراغِ سحری

ہے۔ اہلِ کمال اٹھتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ پُر کرنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہے، کیا یہی ترقی ہے۔ اب کا ہے کو وہ صورتیں نظر آئیں گی۔ فتح علی شیدا نے کیا خوب کہا ہے

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

☆☆☆

مولانا عاشق الٰہی بلند شہری

(المتوفٰی: ۲۰۰۱ء)

مولانا عاشق الٰہی کے نام کی دو شخصیتیں عام طور پر ذہنوں میں خط ملط ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں امتیاز و تفریق کے لیے ایک کے ساتھ 'میرٹھی' کا لاحقہ لگا ہوا ہے اور ایک کے ساتھ 'بلند شہری' کی نسبت ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی پہلے گزرے ہیں جو حضرت شیخ الہند کے بھائی کے شاگرد تھے، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت تھے۔ مولانا عاشق الٰہی بلند شہری بعد میں ہوئے ہیں ان کا تعلق سہارن پور اور دیوبند سے تھا۔ یہاں دارالعلوم کراچی میں پڑھایا کرتے تھے، بعد میں ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے، وہیں کے ہو رہے اور اسی مبارک سرزمین میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب کو ہم نے حیدرآباد میں یقیناً دیکھا تھا، لیکن یہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر تھا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہمیں ایسے لوگوں سے چنداں دلچسپی نہیں تھی بس والد صاحب کی وجہ سے مجبوراً مل لیا کرتے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آنکھیں کھولیں تو پھر اس قسم کے لوگ یاد آنے لگے۔ دارالعلوم کراچی سے مولانا محمد تقی عثمانی کی ادارت میں ''البلاغ'' نامی ایک پرچہ نکلتا تھا، اب بھی نکلتا ہے، اس میں مولانا عاشق الٰہی بلند شہری نے ''خواتین اسلام سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں'' کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ مضامین نظر سے گزرے، مولانا کی عام فہم، سادہ و سلیس تحریر اچھی لگی اور یہ کہ حضرت تھانویؒ کی بہشتی زیور کے بعد خواتین کی اصلاح کے لیے یہ مضامین بڑے سودمند نظر آئے۔ مولانا کی اس اصلاحی فکر نے متأثر کیا۔

مولانا، مفتی محمد شفیع صاحب کے دارالعلوم میں مدرّس تھے اور فتویٰ نویسی پر بھی مامور

رہے ہیں۔ یہاں سے وہ ہجرت کر کے مدینۂ منوّرہ چلے گئے۔ اب شب و روز اس کی پاک فضا میں بسر ہو رہے تھے، جس کی ہر مسلمان آرزو کرتا ہے۔

کیسی مبارک و باسعادت ہے وہ جگہ، جہاں کی فضا درود و سلام کے نغموں سے معمور رہتی ہے، رحمتِ حق ہمہ وقت یہاں کا احاطہ کیے رہتی ہے، ابدال و اوتاد ہوں یا قطب و اقطاب، علماء ہوں یا عامی، سب ہی اس رحمت کو سمیٹنے کے لیے متوجّہ رہتے ہیں، ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، سب اسی روح پرور فضا میں ہوتا ہے۔ وہ ہر ساعت، ہر گھڑی ندامت و شوق اور رجاء و خوف میں بسر کرتے ہیں، دل میں حسرتوں کا ہجوم، قلب میں عشق و محبت اور عقیدت و ارادت کے جذبات موج زن ہوتے ہیں۔ ذلّت و مسکنت اور عجز و نیاز سے دیدۂ اشک بار لیے کامل عبودیت کا اظہار کرتے ہوئے وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَٱسْتَغْفَرُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْتَغْفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُوا۟ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا (اور اگر وہ لوگ جس وقت اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جناب میں پڑھتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں (مفتی محمد شفیع صاحب نے ''معارف القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانے میں ہو سکتی تھی اُسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی کے حکم میں ہے۔) انتہائی تعظیم و تکریم سے، مگر حبطِ اعمال کے خوف سے سرگوشیانہ سلام عرض کرتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس کے آنے کا علم ہے، آپ کی جناب میں ان کا سلام پہنچتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بنفسِ نفیس جواب دیتے ہیں پھر اسی طرح آپ کے دونوں وزیروں کو بھی سلام عرض کرتے ہیں۔ کیسے مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں یہ نعمتِ عظمیٰ میسّر آتی ہے اور اختیار ہوتا ہے کہ صبح و شام جس وقت چاہیں حاضر ہو جائیں۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

۱۹۹۰ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے حج بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائی، مدینہ منورہ میں حاضری کا موقع ملا، کیسی مبارک ہے وہ جگہ! معلوم تو تھا کہ مولانا مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں اس لیے ان سے ملاقات ضروری تھی۔ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے تو ادارۂ اصلاح و تبلیغ، حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ مولانا بعد نمازِ عشا بابِ مجیدی کے پاس ہی بیٹھتے ہیں چناں چہ ہم وہاں پہنچے۔ مولانا کے گرد بہت سے لوگ بیٹھے تھے، ہمیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی ہم بھی اس حلقے میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب مولانا نے توجہ کی ہم نے والد صاحب کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا۔ نہایت محبت و شفقت سے ملے۔ ان کی گفتگو میں کوئی تکلف، تصنع اور نہ کسی قسم کے کبر و تکبر کا شائبہ تھا۔ دوستانہ ماحول میں استفسار کرنے والوں کو تشفی بخش جوابات دے رہے تھے۔ ان کے اشکالات کو دور کر رہے تھے۔ وہ محدّث تھے، فقیہ تھے، علوم و مسائل دین کا انھیں گہرا شعور تھا۔ ذہن ایسا حاضر العلم پایا تھا کہ فی الفور جواب حاضر۔ میں یہ دیکھتا رہا سوچتا رہا کہ اب یہ آخری کھیپ بھی ختم ہوا چاہتی ہے۔ جب مولانا اٹھنے لگے تو میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، چلیے کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیے، آپ کو حلیم کھلاتے ہیں اور بڑے ہی پیار محبت سے مجھے اپنے گھر لے گئے، حلیم کھلایا، فرمانے لگے، میاں یہ مرغی کے گوشت کا حلیم ہے۔ اس وقت ان کے صاحب زادے کوثر میاں نے سندھ یونیورسٹی میں مولانا ڈاکٹر محمد ابوالفتح صغیرالدّین صاحب کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کرا دیا تھا۔ مجھے مقالہ دکھایا، میں مقالہ دیکھتا جا رہا تھا، مولانا مجھ سے پوچھتے جا رہے تھے، کام کیسا کیا؟ اس پر ڈگری مل تو جائے گی؟ عربی میں فقہ پر سندھ کے ایک عالم کی تالیف تھی نام یاد نہیں رہا کس کی تھی، اس پر تحقیق و تحشیہ وغیرہ کا کام نہایت محنت اور سلیقے سے کیا تھا اور کیوں نہ کرتے علم و تحقیق تو خمیر میں شامل تھا، پھر رہبری و رہنمائی کرنے والا کیسا فاضل تھا۔ مولانا میری رائے جان کر بہت خوش ہوئے۔ دیر تک بٹھائے رکھا۔ مولانا نعمانی کے حالات پوچھتے رہے، والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، پھر ایک عرب طالبِ علم کے ساتھ جو اُن سے حدیث پڑھنے آیا تھا مجھے حرم کے قریب چھڑوایا۔ بعد میں تو یہ معمول ہو گیا تھا روزانہ بعد نماز عشا گھر لے جاتے، کھانا کھلاتے اور پھر چھڑواتے۔ میں ان کے اس محبت بھرے رویے سے بہت

متأثر ہوا۔ ایک روز میں نے سوال کیا کہ حضرت حرم میں چالیس نمازوں کے ادا کرنے کی کیا حقیقت ہے۔ فوراً مجھ سے سوال کیا کہ یہ حدیث میں ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں ہے تو، لیکن اس کے طُرق... ابھی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ مولانا نے بہت ہی جوش سے فرمایا، حدیث میں ہے نا؟ تین مرتبہ یہی کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ سمجھ گیا، مولانا کا مطلب کیا ہے۔ یہی اکابرین کا دستور تھا۔ وہ علمی طور پر جرح و تعدیل سے احادیث کو پرکھتے ہیں، مگر ایسی احادیث پر بھی عمل کر لیتے ہیں جن میں محدثین نے کوئی حکم لگایا ہو، اس خیال سے کہ مبادا یہ صحیح ہو اور ہم حدیث پر عمل کرنے سے رہ جائیں اور یہ حدیث تو امام احمد نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے اور اس کے رجال کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ اللہ اللہ حزم و احتیاط کا یہ عالم تو سلف کی یادگار ہے۔

والد صاحبؒ نے ''حصنِ حصین'' کی شرح ۱۹۵۴ء میں لکھی تھی۔ ''حصنِ حصین'' ادعیہ واذکارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے جس کو امام ابن الجزری نے تالیف کیا ہے اور طبقۂ علماء میں اس کتاب کا ختم مشکلات و مہمات میں بھی رائج ہے۔ ہمیں والد صاحب سے اس کی اجازت ہے اور والد صاحب کی سند بہت عالی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے بہت بعد میں اس کا ترجمہ و تشریح کی۔ مولانا کو مفتی شفیع صاحبؒ سے اس کی اجازت تھی، اس لیے خیال ہوا کہ اس کی اجازت مل جائے تو مفتی صاحب کی نسبت بھی شامل ہو جائے گی۔ چناں چہ میں نے مولانا سے ''حصنِ حصین'' کی اجازت مانگی، فرمایا، آپ کو تو مولانا (والد صاحب) سے اجازت ہونی چاہیے۔ میں نے کہا، ان سے تو اجازت ہے، مگر آپ بھی اجازت مرحمت فرمادیں۔ مولانا اس روز ٹال گئے، نہ معلوم کیوں، شاید شرحِ صدر نہیں ہوا، لیکن دوسرے روز مجھے اجازت دے دی۔ جزاکم اللہ۔

مولانا بہت ہی سادہ، مگر جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے گھٹنوں میں درد کے سبب سہارا لے کر چلتے تھے۔ جب وہ میرا ہاتھ پکڑتے تھے تو واضح طور پر ان کے نرم و ملائم ہاتھ میں محبت کا احساس ہوتا تھا۔ کیسے لوگ تھے اپنے ہوں کہ پرائے، چھوٹے ہوں یا بڑے سب سے محبت، سب سے یکساں سلوک، ہر ایک یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ تعلق ہے، ہماری تو چند دنوں کی

ملاقات تھی، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش سب ہی جگہ سے لوگ وہاں آتے تھے اور مولانا کے جاننے والے نہایت عقیدت و محبت سے ملتے تھے، مولانا بھی ان سے بڑی ہی محبت سے ملتے تھے، لیکن زیادہ توجہ مجھ خادم ہی پر رہتی، باتوں باتوں میں جدید تعلیمی مسائل چھیڑ دیتے تاکہ مجھے کچھ بولنے کا موقع مل جائے اور مولانا توجہ سے سنتے۔ اس کے بعد کامل دس سال بعد یعنی ۲۰۰۰ء میں پھر میں حج پر گیا اور مولانا سے ملاقات ہوئی۔ اب پھر وہی کہ گھر چلو کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا اور آٹھ دن کا یہ معمول بنا رہا۔ بڑے متواضع، بڑے خلیق، بڑے مہربان، علم و فضل ان کی دستار فضیلت، زہد و تقویٰ ان کی شان، اخلاق حسنہ ان کا سرمایہ۔ ایسے لوگ اب کہاں، جوش نے تو کہا تھا:

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں، کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ہمارا زمانہ آتے آتے وہ بھی اٹھ گئے ہم نے تو پھر بھی دیکھ لیے۔ اب آنے والی نسلیں ڈھونڈیں گی تو بھی نہیں ملیں گے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

روز یکشنبہ

☆☆☆

پیر عبد القدوس

(المتوفی: ۱۹۹۴ء)

پیر عبدالقدوس صاحب حیدرآباد کی معروف شخصیت، دیوبند کے فارغ التحصیل، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد، دارالعلوم قوۃ الاسلام غریب آباد کے بانی مبانی، ٹھیٹ پٹھان، نہیں معلوم کہ سرحد کے کس علاقے کے رہنے والے تھے۔ پشتو زبان بولتے تھے، مگر اردو بھی بہت صاف تھی، لباس بھی سرحد کے علماء، کا یعنی کرتا شلوار، سر پر پگڑی اور ہاتھ میں موٹا سا لٹھ ہوتا تھا۔ بہت موٹے تو نہیں تھے البتہ توند کا پھیر بہت زیادہ تھا بس جسم میں اگر کوئی چیز نمایاں تھی تو وہ توند ہی تھی۔ بڑے ہی شفقت و محبت کرنے والے انسان تھے۔ والد صاحب سے گہرا تعلق تھا اسی نسبت سے ہم پر بھی بڑے مہربان تھے، ہمیں بالکل اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اشاعت دین کے لیے صرف کردی تھی۔ نام کے ساتھ ''پیر'' کا لفظ لازمی ہوتا تھا، مگر پیروں جیسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آئی، نہ پیروں جیسی شان و شوکت، نہ وہ طمطراق، نہ وہ حور و قصور کے دعوے، نہ تحفے تحائف پر رال ٹپکنا۔ وہ تو سیدھے سادے عاجزی وانکساری اور حسن اخلاق میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ہاں، تعویذ و عملیات کے ذریعے لوگوں کے مسائل حل کر دیا کرتے تھے، اسی نسبت سے غالباً پیر مشہور ہو گئے ہوں گے۔

پیر صاحب بڑے عالم تھے اور صاحبِ تقویٰ بھی پھر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی نسبت اتنی قوی تھی کہ اس کے آگے ہر حیثیت ماند پڑ جاتی ہے، وہی مجاہدانہ زندگی جو اکابر علمائے دیوبند سے انھیں ورثے میں ملی تھی۔ جمعیت العلمائے اسلام سے تعلق تھا، مگر کبھی جلسے جلوس یا سیاسی مجمع میں ہم نے انھیں جاتے نہیں دیکھا، البتہ جمعیت کے بڑے بڑے اکابران کے کچے اور بوسیدہ سے مدرسے میں آتے تھے اور قیام کرتے تھے۔ مولانا عبدالحکیم

صاحب جن کے مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو ناکام ہوئے تھے وہ اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب سے ناچیز کی انھیں کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ لوگ بھی کمال کے تھے مولانا کے مدرسے کے ایک کمرے میں جس کی دیواریں مٹی کی، جس کا فرش کچا، چھت چٹائیوں کی بنی ہوئی، پنکھا ندارد، بوسیدہ سی چارپائی پر بغیر نرم بستر کے کئی کئی دن گزار لیا کرتے تھے۔ جب کہ انھیں بہتر سے بہتر سہولتیں میسر تھیں۔ پیر صاحب میں کوئی تو بات تھی کہ یہ لوگ بے تکلف ان کے ہاں آ کر رہتے تھے۔

پیر صاحب کے مدرسے میں حفظ کے درجے سے لے کر دورۂ حدیث تک اچھے خاصے طالبِ علم تھے۔ مدرسے کی حالت بہت ہی خراب تھی باقاعدگی سے مالی امداد بھی نہیں ملتی تھی، توکل علی اللہ بیٹھے دین کی خدمت کر رہے تھے۔ ان کے گھر کی خواتین سارے طالبِ علموں کے لیے کھانا پکاتیں، ڈھیر ساری روٹیاں اپنے ہاتھوں سے ڈالتیں اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ سب فاقے سے رہتے، طالبِ علم فاقے سے ہیں تو گھر کے سب لوگ بھی فاقے سے ہیں۔ ایسا مجاہدہ اب کون کرتا ہے، کون اتنی قربانیاں دیتا ہے، کون ہے جو ناز و نعم اور راحت و آرام کی زندگی کو چھوڑ کر ایسی سخت ابتلا و آزمائش والی زندگی اختیار کرتا ہے۔ بلاشبہہ آزمائش و ابتلا کی زندگی تو وسیع تر مقصد کے حصول کے لیے ہے اور جن کا مقصود ہی حق تعالیٰ ہوں تو پھر آلام و مصائب تو ہمہ وقت ان کے استقبال کے لیے بازو پھیلائے رہتے ہیں اور قربِ حق کے متمنی جانتے ہیں کہ رحمت حق کا ادراک اور تحقّر و تحقق سہولت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خوف و حزن اور آلام و مصائب کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، مگر صبر و استقامت سے، اس کو سمیع و بصیر جان کر، رحیم و کریم سمجھ کر، اطمینان قلب اور شکر کے جذبات سے لب ریز ہو کر، پھر رحمت حق اسی جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ مولانا جامی نے کیا خوب کہا ہے:

با درد بسا ز چوں دوائے تو منم
در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سرِ کوئے عشق ما کشتہ شوی
شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

تعجب تو اس امر پر ہوتا ہے کہ ہم پھر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مدارس بڑے مالدار ہوتے ہیں، بڑی ایڈ ملتی ہے۔ مولوی خوب کھا کھا کر دنبے ہو رہے ہیں۔ استغفراللہ۔ مجھے یاد ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنے خطبے میں پیر صاحب نے فرمایا، آپ جو کچھ ہمیں دیتے ہیں اس کو ہم صحیح مصرف میں لاتے ہیں۔ ہم قیامت تک آپ کی ایک ایک پائی کے جواب دار ہیں، میں تو یہ سن کر کانپ گیا۔ اللہ اکبر یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ کون ہے جو یہ ذمّے داری قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟ یہ دعویٰ تو وہی کر سکتا ہے جس کو یہ احساس ہمہ وقت دامن گیر رہے کہ دنیا عارضی و فانی ہے اس دنیا کے اعمال پر ہی آخرت کی دنیا بنے گی، سنورے گی۔ یہ دعویٰ تو وہی کر سکتا ہے جو زندگی کے ایک ایک لمحے کو اللہ کی امانت تصوّر کرتا ہو اور امین بن کر حزم و احتیاط سے اس کی حفاظت کرتا ہو۔ وہ تمام نفسی لذّات و شہوات کو شکنجہ لگا کر اپنے قابو میں کر لیتا ہو اور عقل قہرمان کے تمام میلانات کو لگام لگا لیتا ہو اب اس کا کچھ ذاتی مفاد نہیں رہتا۔ کھانے پینے پہنے کی احتیاج ضرورت کے درجے میں ہی ہوتی ہے۔ اب وہ اَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلاَّ عَيْشَ الاٰخِرَة کو ہی نصب العین جانتا ہے بلاشبہہ ایسا ہی شخص نفسانی خواہشات سے مُنہ موڑ کر اپنی زندگی کو قیمتی بناتا ہے پھر یہاں کی محرومی و سخت کوشی آخرت کی نعمتوں اور آرام و سکون پر منتج ہوتی ہے۔ ایسے کامل یقین رکھنے والے اب خال خال ہی نظر آئیں تو آئیں۔

پیر صاحب بڑی خصوصیات کے حامل تھے۔ صاحب کشف بھی تھے۔ آج کے سائنسی دور میں کشف و کرامات کی باتیں لغو و مبالغہ ہوتی ہیں، کسی کو یقین ہی نہیں آتا، لیکن ہم نے بہت سی حیرت انگیز باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ ایک مرتبہ والد صاحب سخت پریشان تھے۔ پیر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شہر میں کسی چڑھائی پر جارہے ہیں کہ ایک بزرگ صورت لمبا کرتا پہنے، گریبان کھلا چھڑی ہاتھ میں لیے ہوئے ملے اور فرمایا، آپ مولانا محمد عبدالعلیم ندوی کے احباب میں ہیں، وہ میرے بیٹے ہیں ان سے کہیے کہ پریشان نہ ہوں، صبر سے کام لیں اللہ تعالیٰ سارے مسائل حل کر دیں گے۔ پیر صاحب نے ہمارے دادا کا ٹھیک حلیہ بتا دیا اور جے پور کے وہ گلی کوچے بتا دیے جہاں ہمارا مکان تھا جب کہ پیر صاحب کبھی جے پور نہیں گئے اور انھوں نے ہمارے دادا کو بھی کبھی نہیں دیکھا۔

ایک واقعہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا پیر صاحب ہی نے غسل دیا۔ دوسرے روز پیر صاحب گھر تشریف لائے ۔ مجھے تنہائی میں لے گئے، فرمایا، میں ابھی حضرت کی قبر پر مراقبہ کر کے آ رہا ہوں الحمد للہ حضرت بڑے آرام میں ہیں تمھارے لیے ایک پیغام دیا ہے، جب میں نے وہ پیغام سنا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ بات صرف میرے اور میرے والد صاحب کے درمیان میں تھی کوئی تیسرا اس میں شریک نہیں تھا۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو پیر صاحب کو بتا نہیں کہ حل ہوا۔ ایسے ہمدرد، ایسے شفیق و مہربان، ایسے اللہ والے لوگ اب کہاں کہ جن و بشر سب ان کی روحانی قوت کے آگے سرنگوں ہوں اور وہ جن سے جس وقت چاہیں کام لے لیں۔ یہ بات ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ دراصل عبد و معبود کے درمیان ایک ازلی رشتہ ہے۔ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي سے اس کی دلیل نکلتی ہے اس لیے انسان عبودیت کی منزل میں ہوتے ہوئے بھی وجودِ حق کا مشاہدہ کر سکتا ہے مجاہدہ و ریاضت سے باطن کی صفائی اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور جس قدر تزکیۂ نفس اور صفائی قلب ہوتی ہے اسی قدر ظاہر و باطن سب روشن و منور ہو جاتے ہیں اور تمام ممکناتِ وجود اس پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس کا کل معاملہ اور سارا کاروبار خلق سے ہے، تمام حسی و علمی تعلقات مخلوق سے قائم ہوتے ہیں اس لیے وہ اس کے نفع و ضرر کو خوب پہچانتا ہے اور ایمان و یقین کی روشنی میں جو بصیرت اسے حاصل ہوتی ہے اس کی موجودگی میں ہر ذرہ اس کا تابعِ فرمان ہو جاتا ہے، کل مخلوق حکم برداری کے لیے دست بستہ استادہ رہتی ہے، لیکن وہ ہے کہ ضرورت کے درجے میں ان سے کام لیتا ہے ورنہ اصل میں تو یہ ساری بصیرت اس نے وجود مطلق کے مشاہدے کے لیے حاصل کی تھی جس کے نشے میں وہ ہمیشہ سرشار رہنا چاہتا ہے۔

والد صاحبؒ کے انتقال کے بعد پیر صاحب ہی ہمارے بزرگ رہ گئے تھے۔ ہمارا ان کا خونی رشتہ تو نہیں تھا، لیکن تعلق خونی رشتوں سے زیادہ تھا، ان کی توجہ اب ہماری طرف اور بھی زیادہ ہو گئی تھی ۔ ایک تو ان کا بڑھاپا اس پر بہت سے عوارض بس ہمت کے سہارے کام کرتے تھے۔ ہمارے لیے ہر پابندی، ہر بیماری اور ہر رکاوٹ پس پشت ڈال دیتے، ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تمام کاروبار منقطع کر دیتے، حاضرین محفل کو رخصت کر کے ہماری

طرف متوجہ ہو جاتے، پڑھاتے ہوتے تو سبق کو مختصر کر دیتے۔ میں ان سے کہتا آپ
پڑھائیے میں بھی اس درس میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔اس طرح میں ان کے درس میں کئی
بار شریک ہوا ہوں۔وہ ہم پر ہی نہیں بلکہ ہمارے متعلقین پر بھی خصوصی توجہ دیتے۔میرے ہم
زلف انوار محمد قریشی مرحوم کو اسی تعلق سے بہت عزیز رکھتے تھے۔

میں نے دیکھا ہے کہ زیادہ تر لوگ ان سے دعا کرانے، اپنے مسائل حل کرنے کے
لیے آتے تھے اور وہ ہر مسئلے کو بڑی توجہ سے سنتے اور ان کا حل پیش کرتے، تہجد میں ان کے
لیے خصوصی دعائیں کرتے۔اللہ تعالیٰ ان کے مسائل حل کر دیتا اور ان کا حلقۂ ارادت وسیع
سے وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔کہاں سے لائیں ایسے لوگوں کو جن کے
مشفقانہ رویوں اور ہمدردی وخلوص کے جذبات سے ہر خاص وعام مستفید ہو رہا تھا۔ اَللّٰھُمَّ
اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ مَا آتِی، وَخَیْرَ مَا اَفْعَلُ، وَخَیْرَ مَا اَعْمَلُ، وَخَیْرَ مَا بَطَنَ
وَخَیْرَ مَا ظَھَرَ، وَالدَّرَجَاتِ الْعُلٰی مِنَ الْجَنَّةِ. آمِیْن۔

آنچه خوبان همه دارند تو تنها داری

☆☆☆

مولوی صاحب (والدِ محترم)

(۱۹۸۷ء-۱۹۱۹ء)

سیرت و کردار پر سب سے زیادہ جو شخصیت اثر انداز ہوتی ہے وہ والد یا استاد کی ہوتی ہے، شیخ بھی استاد ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے والد اور تایا کو حضرت شیخ حیدر حسن خاں صاحب جیسا کامل استاد اور مرد صالح بزرگ میسّر آیا کہ ان کے پرتو سے ان کی زندگی مثالی بن گئی اور ہماری خوش بختی کہ والد صاحب اور استادِ محترم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب رحمہم اللہ میسّر آ گئے۔ جو کچھ بھی آج میرے دامن میں ہے وہ سب انھیں دونوں بزرگوں کے اثر سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین۔ میرے والد مولانا محمد عبدالعلیم ندوی تھے۔ میں انھیں ہمیشہ سے مولوی صاحب کہتا آیا ہوں۔ آج بھی یہی لفظ استعمال کروں گا۔

آج کا طالبِ علم جب کتابوں میں بزرگوں کے حالات و واقعات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے علم و فضل، ایمان و عمل، فکر و فن، امانت و دیانت اور زہد و تقویٰ کا دفتر کھل جاتا ہے اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہر گھر علم و فضل کا مرکز رہا ہو، ہر شخص حسن اخلاق کا مظہر ہو، پورا معاشرہ پاکیزگی و طہارت اور اخلاص و وفا پر قائم ہو، لیکن جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے اس کی عملی شکلیں معدوم دکھائی دیتی ہیں۔ شعبہائے زندگی میں ایمان داری و دیانت داری کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ حیات انسانی کا ہر پہلو تاریک اور حسن اخلاق سے عاری معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے تاریخ کے صفحات محض رنگین داستان یا خیالی افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر یقین کرنے میں اسے تردد ہونے لگتا ہے، لیکن اگر حسن اتفاق سے معاشرے کے کینوس میں کسی ایسے بزرگ کی تصویر دکھائی دے جائے جو علمائے سلف کی یادگار

ہو تو پھر بے اختیار اس کا ذوق تجسس عود کر آتا ہے وہ اس کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیوں کر متضاد رنگین خطوط کے درمیان سادہ، مگر جاذب نظر شخصیت ابھری، طوفان باد و باراں اور تلاطم ہائے دریا میں کیوں کر قطرۂ نیساں صدف کی گود میں پروان چڑھ کر گوہر آب دار ہوا اور جوں جوں وہ اس کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرتا ہے تو اس کی عظمت کے نقوش اس کے دل پر ثبت ہونے لگتے ہیں۔ اب اسے تاریخ کے اوراق رنگین داستان نہیں حقیقت پر مبنی معلوم ہونے لگتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ بزرگوں کی عظمت کا قائل ہو جاتا ہے بلکہ جلد یا بدیر اپنی زندگی کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ تاریخ کے صفحات سے اپنی زندگی کو بہتر خطوط پر استوار کرنے کے لیے خام مواد حاصل کرتا ہے۔ میں نے والد صاحب کو دیکھا ہے، اپنے تایا مولانا نعمانی کو دیکھا ہے، اپنے استاد ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب کو دیکھا ہے اور والد صاحب کی وساطت سے اور بہت سے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے، اس لیے مجھے تو تاریخ کے اوراق کی صداقت پر کسی بھی قسم کا شک یا تردد نہیں ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی محمد عبدالعلیم، ابوالعلا کنیت اور آغا عرف تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، خطاطی کی مشق بھی گھر پر ہی کی۔ دادا حضرت سے اصلاح لیتے تھے۔ بڑے دادا حافظ محمد عبدالکریم صاحب سے قرآن حفظ کیا تھا۔ پھر مولانا قدیر بخش صاحب بدایونی سے عربی علوم کی تحصیل شروع کی۔ کچھ وقت ڈابھیل (سورت) میں گزرا۔ ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو پہنچے۔ اس وقت عم محترم مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے حدیث کی تحصیل کر کے واپس آ چکے تھے۔ مولوی صاحب ندوہ کے ہوسٹل میں نہیں بلکہ حضرت شیخ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس طرح شب و روز حضرت شیخ سے استفادے کا خوب موقع ملا۔ حدیث، فقہ، تفسیر کے ساتھ علم ہیئت کی کتابیں بھی پڑھیں۔ فرماتے تھے کہ حضرت شیخ تہجد کے وقت اٹھا دیا کرتے اور فجر کی نماز

کے فوراً بعد پڑھانے بیٹھ جاتے چناں چہ میں نے بخاری و مسلم پوری قراءتاً و سماعاً علاحدہ میں پڑھیں۔ اس طرح کامل چار سال وہ سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں حضرت شیخ کے ساتھ رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ندوہ سے فارغ ہوئے پھر مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کی غرض سے ۱۹۳۹ء میں لاہور چلے گئے۔ یہاں مولانا فیوض الرحمٰن صاحب اور مولانا سیّد محمد طلحہ صاحب کے پاس تیاری کر کے مولوی فاضل کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر ۱۹۴۰ء میں واپس جے پور آ گئے، یہاں منشی فاضل کی تیاری شروع کر دی۔ معاش کی سبیل کے لیے جے پور کے مشہور استاد اور جوہری حافظ آجا بھیّا سے جواہرات کا کام سیکھنے لگے اور بڑی محنت و جاں فشانی سے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں اس فن میں مہارت پیدا کر لی، ایسی کہ ان کا بنایا ہوا نگینہ بمبئی تک میں پہچانا جانے لگا۔ ابھی جواہرات کی تجارت کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ بسلسلۂ ملازمت دکن چلے گئے۔ یہاں دارالترجمہ کے تحت حضرت شیخ حیدر حسن خاں صاحب کے برادر معظم علاّمہ محمود حسن خاں ٹونکی کی ''معجم المصنّفین'' کی تدوین و تالیف کا کام جاری تھا اس میں حصّہ لیا اور تین سال تک علاّمہ موصوف کی نگرانی میں ہزاروں رجال اسلام کے تراجم کی چھان بین میں مصروف ہو گئے۔ یہ پروجیکٹ ۶۰ رجلدوں میں ۲۰ رہزار صفحات پر پھیلا ہوا کم و بیش ۴۰ رہزار شخصیات پر مشتمل تھا۔ وقت کے ہاتھوں ایسا برباد ہوا کہ پتا ہی نہیں چل سکا کہاں گیا۔ مملکت آصفیہ سے اس کی صرف ۴ رجلدیں شائع ہوئی تھیں وہی نمونہ بس موجود ہے۔ اس کے بعد جے پور آ گئے اور جواہرات کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تبلیغ دین سے بھی شغف رکھا، اکثر تبلیغی جماعتوں کے ساتھ باہر بھی جاتے رہے۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے، کراچی میں قیام کیا۔ یہاں ایک اسکول میں ملازمت اختیار کی پھر سندھ کے ایک قصبے کنری میں عبدالعزیز جان سرہندی کی خواہش پر ان کے مدرسے میں چلے گئے۔ اب مولوی صاحب کو یہاں حدیث و فقہ کی تدریس کا موقع ملا تھا۔ یکسوئی سے علوم دین کی خدمت کرتے کہ وہاں کے ہندوؤں کی سازش کا شکار ہو گئے اور مجبوراً کراچی واپس آنا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں مستقل حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کی اور اسکول میں ملازم ہو گئے۔ فارغ وقت میں مولانا پیر عبدالقدوس صاحب کے مدرسہ

تو ۃ الاسلام میں فقہ و حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے۔ اس دوران تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ علامہ ابن الجزری کی ''حصن حصین'' کا ترجمہ اور شرح وہ لکھ چکے تھے جو اصح المطابع کراچی سے ۱۹۵۵ء میں طبع ہوئی تھی۔ ایک رسالہ فضائل درود پر لکھا، اپنے استاد مولانا قدیر بخش صاحب بدایونی کی کتاب ''النکاح والطلاق'' مرتب کر کے شائع کی، شیخ شرف الدین النووی کی ''اربعین'' کی شرح لکھی۔ ''دعا کی حقیقت'' کے عنوان سے طویل مضمون لکھا۔ آخر میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (م ۱۷۶۰ء) کی ''فرائض الاسلام''، ''کشف الرین'' اور ''تنقیح الکلام فی مسئلہ قرأۃ خلف الامام'' وغیرہ کتابوں کو بڑی تحقیق سے مختلف قلمی نسخوں سے موازنہ کر کے مرتب کیا ان کا ترجمہ اور تشریح کی۔ حضرت شیخ حیدر حسن خاں کا ایک رسالہ ''التعامل'' کا ترجمہ بھی کیا۔

مولوی صاحب نور اللہ مرقدہ نے تصوف و سلوک کی تعلیم بھی حضرت شیخ حیدر حسن خاں سے حاصل کی۔ حضرت شیخ، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ تھے۔ یہ نسبت بہت ہی بڑی تھی۔ حضرت شیخ کے انتقال کے بعد مبلغ اعظم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی (حضرت جی) سے دست بدست بیعت ہوئے۔ بعد میں حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری خلیفہ اجل حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے تجدید بیعت کی۔ مولوی صاحب کا حضرت جی اور پھر مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری سے جو تعلق خاطر تھا۔ اس کو ہم نے خود دیکھا ہے۔ حضرت جی جب پاکستان تشریف لاتے تو مولوی صاحب مجھے لے کر حضرت کی خدمت میں پہنچ جاتے، حضرت جی بھی بڑی محبت سے ملتے، بڑا خیال رکھتے۔ مجھے یاد ہے جمعہ کا دن تھا مولوی صاحب منبر پر خطبہ دیتے ہوئے اس قدر روئے کہ ان کو خطبہ دینا مشکل ہو رہا تھا، بمشکل نماز پڑھائی اور خوب رو رو کر دعا مانگی، سب لوگ حیران تھے کہ آج مولوی صاحب کو کیا ہوا ہے۔ گھر پر آئے کہ خبر آ گئی حضرت جی کا انتقال ہو گیا۔ یہ کشش، یہ محبت اور یہ دلی تعلق اب کہاں رہا۔ اسی طرح حضرت رائے پوری کی بھی مولوی صاحب پر خصوصی توجہ تھی۔ مولوی صاحب کو اوّل حضرت شیخ حیدر حسن خان نے خلافت عطا کی بعد میں حضرت مولانا شاہ محمد علی مونگیری کے پوتے حضرت شاہ فضل اللہ گیلانی

الصّمد نے خلافت و اجازت سے سرفراز فرمایا، لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے مولوی صاحب نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔ وہ کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، اپنے آپ کو چھپاتے تھے۔ رحمۃ اللہ واسعۃ۔

مولانا نعمانی کو تو پڑھنے پڑھانے کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، مگر مولوی صاحب زندگی کے دیگر معاملات میں بھی برابر کے شریک رہتے تھے۔ بچپن میں بھی وہ کھیل کود میں دلچسپی رکھتے تھے۔ پتنگ اڑانے میں بہت ماہر تھے، کبوتر بازی کا بھی انھیں شوق ہو گیا تھا۔ لکڑی چلانا اور تیراکی بھی بچپن کے شوق تھے۔ جو تعلیم کے دوران ختم ہو گئے تھے، لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد جوانی میں پھر دوبارہ ابھر آئے۔ بدن ان کا کسرتی تھا۔ اکھاڑے میں زور کرتے میں نے خود انھیں دیکھا ہے۔ اسی طرح لکڑی چلانے سے متعلق یہ واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک مرتبہ لطیف آباد میں مولوی صاحب مجھے لے کر ایک شخص سے ملنے گئے۔ وہ مفلوک الحال اپنے کوارٹر میں کُھری چارپائی پر بنیان پہنے اور تہہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ مدقوق سے تھے، سانس کے مرض میں مبتلا، تیز تیز سانس لے رہے تھے، بولنا ان سے دشوار ہو رہا تھا، کم زور اتنے کہ ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی۔ مولوی صاحب نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ نگینے کے بہت اچھے کاریگر ہیں اب صحت جواب دے چکی ہے اس لیے کام نہیں کر سکتے، یہ بھی بتایا کہ یہ اپنے وقت میں لکڑی چلانے کے بڑے ماہر تھے۔ میں نے یہ سنا تو ان کے جسم پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔ ان صاحب نے دیکھ لیا اور ایک دم بھڑک اٹھے، کہنے لگے، میاں صاحب زادے! آپ ہماری ظاہری حالت دیکھ کر ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ابھی آپ ایک لکڑی ہمیں دے دیں اور چارپائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دیں اگر نکل جائے تو ہم آپ کی غلامی لکھ دیں گے۔ پھر فرمانے لگے، یہ مولانا جو آپ کے والد ہیں یہ بھی خوب لکڑی چلانا جانتے ہیں۔ پہلی مرتبہ مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا۔ گھر آئے تو میں نے کہا، ہمیں بھی لکڑی چلانا سکھا دیں۔ مولوی صاحب نے کہا، بہت مشکل ہے اور اب اس کا زمانہ گیا گزرا ہوا، لیکن ہم سیکھنے کے لیے بضد تھے۔ فرمایا کہ ایک کٹے میں (پٹ سن کی نصف بوری کو 'کٹا' کہتے تھے، اُس زمانے میں اُسی میں سیمنٹ آتی تھی)

بجری بھرواور دیوار سے اس طرح لگاؤ کہ ۱۲۰ رڈگری کا زاویہ بن جائے۔ پھر گھر میں رکھی ہوئی ایک پرانی لکڑی تقریباً پانچ فٹ کی تو ہوگی نکالی اور اس کو تیل میں ڈبو کر کھڑا کر دیا، رات بھر لکڑی تیل پیتی رہی۔ دوسرے روز مولوی صاحب نے ہمیں پینترا بتایا اور فرمایا، پہلا سبق یہ ہے کہ تم اس کٹے پر پوری طاقت سے وار کرو، ہم نے بمشکل تمام اس پر دس بارہ لکڑیاں ہی برسائی تھیں کہ مولوی صاحب نے فرمایا، طاقت سے مارو، کیا کھاتے نہیں ہو؟ یہ کہہ کر لکڑی انھوں نے لے لی اور پینترا لے کر اس زور کا وار کیا کہ بوری پھٹی اور دور تک بجری سرسراتی ہوئی پھیل گئی۔ اللہ اکبر! یہ طاقت میں حیران سوچتا ہی رہ گیا۔ فرماتے تھے۔ ہمارے استاد ہمیں تالاب میں لے جا کر ناف تک پانی میں کھڑا کر دیتے کہ اب پانی پر لکڑی برساؤ۔ جب ہاتھ میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ لکڑی کی ضرب سے پانی پھٹنے لگے، واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتا دکھائی دے تو سمجھو کہ اب پہلا سبق پورا ہوا۔ پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ ''طاقت بادشاہ ہے اور داؤ وزیر ہے۔'' اس کی صداقت کا اب یقین ہوا تھا۔ بہر حال، ہم ہمت ہار گئے، لکڑی چلانے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ مولوی صاحب فرماتے تھے، مسلمان کو اپنے اندر جہاد کا جذبہ جوان رکھنا چاہیے۔ لکڑی چلانا، بانک پٹا، بنوٹ (میرے پاس اس فن کی ایک کتاب بھی ہے) تلوار بازی، گھڑسواری اور تیراکی وغیرہ آنا چاہیے۔ یہی اس زمانے کے فنون حرب تھے۔ اب آج کے فنون حرب سیکھنا چاہیے۔ جب سے مسلمان کے اندر یہ جذبہ سرد ہوا ہے روز بروز زوال پذیر ہوتا چلا گیا ہے۔ غلامی اس کا مقدر بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس جذبے کو قائم رکھنے کی توفیق دے۔

مولوی صاحب تیراکی میں بھی بڑے ماہر تھے۔ لکھنؤ میں وہ گومتی ندی میں تیرتے تھے۔ وہاں تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد پھلیلی نہر میں تیراکی کی مشق جاری رکھی۔ یہاں کراچی میں پی این ٹی کالونی سے آگے جواَب ڈیفنس کا علاقہ ہے، بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہاں کسی زمانے میں بڑے بڑے ریت کے ٹیلے ہوا کرتے تھے قریب ہی پہاڑیوں کے درمیان ایک جھیل تھی اس میں تیرنے جاتے تھے۔ میں ساتھ ہوتا اس وقت مشکل سے میں سات یا آٹھ سال کا رہا ہوں گا۔ پانی میں

جانے کے لیے بے تاب، یہ دیکھ کر مولوی صاحب نے مجھے گود میں بھرا اور پانی میں پھینک دیا، ساتھ ہی ساتھ کہتے جارہے تھے کہ جلدی جلدی ہاتھ پیر مارو۔ اس اچانک افتاد پر کس کے حواس بجا ہو سکتے ہیں۔ جب میں بالکل ہی ڈوبنے لگا تو چچا سے کہا، اسے نکال لاؤ۔ دو تین مرتبہ انھوں نے یہی کیا، لیجیے، سارا خوف نکل گیا اور تیرنا آ گیا۔ کمال کے لوگ تھے میں کبھی سوچتا ہوں کہ کیا ہم اپنے بچّے کو اس طرح پھینک سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح مجھے نگینہ کاٹنا سکھایا۔ نگینوں کی کٹائی کے لیے ٹین کی ایک قُرص کو تکلے میں لاکھ سے جوڑ کر ہاف ہارس پاور کی موٹر سے گھمایا جاتا ہے، اس کی دھار بہت تیز ہوتی ہے۔ پھر نگینے کو اس کی دھار سے لگا کر انگوٹھے اور ایک انگلی کی مدد سے دھار کے اوپر کے حصّے پر مسالا لگایا ہے جس میں پسا ہوا ہیرا شامل کیا ہوا ہوتا ہے تاکہ رگڑ سے نگینہ کٹ سکے۔ یہ بڑا مشکل کام ہوتا ہے ذرا سی غفلت سے انگلی کٹ سکتی ہے۔ جب مولوی نے پہلی مرتبہ مجھے کام پر بٹھایا تو میں بہت ڈرا کسی طرح اس قُرص پر انگلی پھیرنے کو تیّار ہی نہیں۔ مولوی صاحب نے میری ایک انگلی پکڑ کر ایک دم اس قُرص میں ڈال دی۔ انگلی کا پوروا نصف تک کٹ کے لٹک گیا، خون کی دھار بہنے لگی، کہاں کی پٹی، کیسا مرہم، اصرار کہ کام کرو، مرتا کیا نہ کرتا، خون ٹپکتا رہا اور ہم کام میں مصروف ہو گئے تا آں کہ نگینہ کاٹ لیا۔ لیجیے خوف دور ہو گیا، کام آ گیا بعد میں مرہم پٹی ہوئی۔ آج کے دور میں تو اسے ظالمانہ فعل سے تعبیر کریں گے، لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ کام اسی طرح آتا ہے۔

مولوی صاحب کو بچپن ہی سے کبوتر باری کا شوق ہو گیا تھا۔ کبوتر بازی کا شوق تو بڑے بڑے لوگوں کو رہا ہے۔ محمد سعید صاحب کے ذیل میں اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مولوی صاحب کو یہ شوق آخری عمر تک برقرار رہا اور میں بھی اس شوق میں ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ وہ اس فن کو خوب سمجھتے تھے، اس فن کے بہت بڑے استاد تھے۔ مختلف نسل کے کبوتر انھوں نے بنائے تھے۔ خوب اُڑے۔ عالم تھے اس لیے کبھی خود شرطیں نہیں اڑائیں البتہ شاگردوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے شاگرد تھے، ان میں محمد خلیل خاں اور شاہ رخ بہت سوجھ بوجھ رکھتے تھے، شرطوں میں بڑے بڑے استادوں کو نیچا دکھایا تھا۔ خلیل خاں پیشے کے

اعتبار سے خیاط تھے۔ ملتان چلے گئے تھے۔ وہاں ان کی بڑی شہرت تھی، قرب و جوار میں ان کا بڑا نام تھا۔ ایک مرتبہ مولوی صاحب جواہرات کے سلسلے میں ملتان گئے میں بھی ساتھ تھا۔ پورے ملتان اور اردگرد کے علاقے میں شہرت ہوگئی کہ خلیل خاں کے استاد آئے ہیں بڑی عزت ہوئی، لوگ فرمائش کرتے کہ استاد ہمارے یہاں تشریف لائیں اور ایک جوڑا لگا دیں۔ گویا اس طرح استاد کا اکرام مقصود تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی حیات میں بیس بائیس سال پہلے ہی کبوتر گھر سے نکال دیے تھے۔ شاگردوں کے ہاں کبھی کبھار چلے جاتے اور شوق پورا کر لیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ کوئی کام ہو، کوئی شوق ہو، کمال کے درجے پر پہنچانا چاہیے۔ یہی عظمت کی بات ہے۔ انھوں نے جو بھی کام کیا کمال کے درجے پر اسے پہنچا کر دم لیا۔ جوانی میں جب یہ شوق اپنے عروج پر تھا اس وقت بھی زندگی کے معمولات میں، عبادات و ریاضت میں اور تصنیف و تالیف میں بڑا انہماک رہا۔

مولوی صاحب خطاطی بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد اور تایا سے اصلاح لی تھی۔ جب مجھے خطاطی کا شوق ہوا تو میں نے قدیم اساتذہ میں میر علی تبریزی، میر عماد الحسینی، آغا عبدالرشید دیلمی، محمد حسین کشمیری، جواہر رقم، محمد مراد کشمیری، حافظ نور اللہ، محمد امیر رضوی پنجہ کش دہلوی، آغا مرزا اور رحیم اللہ بیگ وغیرہ کے نمونے حاصل کیے اور مولوی صاحب سے ان کی نقلیں کرائیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ انھوں نے ان کے خط سے ایسا خط ملایا ہے کہ سرِ مو فرق نظر نہیں آتا۔ اہلِ فن اس کو دیکھیں تو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچپن میں تو ہم نے تختی لکھی تھی۔ اب ہم نے مولوی صاحب سے کہا، ہمیں بھی خطاطی کی مشق کرا دیں۔ چناں چہ ایک روز وہ نیزوں کا گٹھرا اٹھا لائے اور ایک قلم بنا کر بتایا کہ اس طرح قلم بناؤ۔ یہی پہلا سبق ہے۔ ہم نے قلم بنانے شروع کیے کھڑی ہتھیلی کی ضرب سے قط لگانا اور وہ بھی بہت سارے قلموں پر ناممکن تھا، ہم نے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لیا، اس کی ضرب سے قط لگانے لگے۔ فرمایا نہیں صرف ہتھیلی کی ضرب سے ہی قط لگایا جائے۔ اوّل تو اتنے سارے نیزوں کا قلم بنانا کارے دارد ہے اور اگر آپ نے کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے بھی کر لیا تو ”نظم پروین“ پوری زبانی یاد کریں پھر کہیں جا کر مفردات کی مشق کی نوبت آتی۔ مولوی صاحب

تعلیم و تعلم کے معاملے میں قدیم اساتذہ کی ڈگر سے ایک انچ تو بڑی چیز ہے ایک سوت بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ نقطے پر نقطہ رکھنے کے قائل تھے۔ کہتے بھی یہی تھے کہ آدمی کامل اسی وقت بنتا ہے جب اساتذہ کے بتائے ہوئے طریقوں سے انحراف نہیں کرے۔ بہر حال ہم ان طویل اور دشوار گزار مراحل سے نہیں گزرے البتہ ہمارے دادا کے استاد منشی ہیرا لال مونس کی پوری الف سے ی تک مفردات کی مشق جو انھیں کی پریس میں چھپی تھی اس پر ہاتھ پھیرتے رہے اور کچھ نہ کچھ قطعات کی بھی مشق کی۔ بھلا اس سہل پسندانہ مزاج کے ہوتے ہوئے کوئی فن کبھی آیا ہے۔ فن تو خون جگر پیتا ہے، پوری پوری عمریں اس کے حصول کے لیے کھپانی پڑتی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ابا میاں نے تیس سال تک ہیرا لال جی کو مشق دکھائی ہے۔ فن تو مزاولت چاہتا ہے۔ تھوڑے دن کے لیے بھی چھوڑ دیجیے ہاتھوں سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے پرندہ ہاتھوں میں ایک دم مچل کر نکل بھاگتا ہے۔

مولوی صاحب مجسّم اخلاق تھے۔ ان کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا عین سنّت کے مطابق تھا۔ وہ جیسے جلوت میں تھے ویسے ہی خلوت میں تھے۔ حصن حصین انھیں ازبر تھی اسی لیے ہر موقع پر ان کی زبان سے وہی دعائیہ کلمات ادا ہوتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان صدق بیان سے ارشاد ہوئے ہیں اور ہمیں بھی اس کی تلقین فرماتے۔ ایک مرتبہ محلّے میں آگ لگ گئی سب لوگ برتن بھانڈے لے کر آگ بجھانے نکل کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب نے بھی بالٹی بھری اور آگ بجھانے کے لیے چلے آگ پر پانی ڈالتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔ یَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى اِبْرَاهِيمَ۔ خدا خوفی، بے نفسی، عاجزی وانکسار، صبر وقناعت، شفقت ومحبت، استقلال واستقامت، ایثار وتوکل، حزم واحتیاط، غرض تمام اخلاقِ حسنہ ان کی ذات میں سمٹ آئے تھے، بزرگوں سے والہانہ شیفتگی رکھتے تھے۔ عقیدت اس درجہ تھی کہ تذکرہ کرتے ہوئے آنکھیں چھلک جاتی تھیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ابا میاں یا حضرت شیخ کا تذکرہ آیا ہو اور ان کی آنکھیں نم آلودنہ ہوئی ہوں، ان دونوں سے ایسا قلبی تعلق تھا کہ مصائب کے ہجوم میں اگر عالم رؤیا میں ان میں سے کسی کی بھی زیارت نصیب ہو جاتی تو اللہ کے فضل سے تکلیف رفع ہو جاتی۔ رقیق القلب

ایسے تھے کہ قیامت کا ذکر کرتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تکالیف بیان کرتے یا صحابہ کے مصائب کا تذکرہ کرتے تو آنکھیں سرخ ہو جاتیں، لڑی بند آنسو ٹپکنے لگتے اور کبھی کبھی تو ہچکی تک بندھ جاتی۔ شاید اس پر قیاس کر کے اپنی تکالیف و مصائب کو بھولنا مقصود ہوتا ہوگا۔

مولوی صاحب حد درجہ عبادت گزار تھے، نوعمری ہی سے تہجد پڑھنے لگتے تھے، تہجد میں با آواز بلند طویل قرأۃ کرتے تھے۔ حافظ تو تھے ہی جہاں سے چاہتے پڑھتے تھے، مگر زیادہ تر چھبیسواں پارہ پڑھتے سنا ہے، پھر رکوع و سجود میں خوب گڑگڑا کر دعا مانگتے۔ نوافل کا بطورِ خاص اہتمام فرماتے تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ تہجد گزار ہی پایا ہے۔ میں اکثر مشاعروں اور ادبی محفلوں سے رات گئے آتا تھا۔ اس وقت نہایت ناراضی کے انداز میں فرماتے، ''آپ کے آنے کا وقت ہے اور ہمارے اٹھنے کا وقت ہے۔'' اشراق، چاشت اور اوّابین کی نمازوں پر بھی مداومت تھی۔ ایک روز میں ان کے اسکول گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مَعْمَل (لیبارٹری) میں ہیں، میں سخت حیران کہ وہاں ان کا کیا کام، جب وہاں پہنچا دیکھا کہ لیبارٹری تو خالی ہے اور مولوی صاحب چاشت کی نماز بڑے انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ روزانہ بعد نماز مغرب جب ساری مسجد خالی ہو جاتی تو ایک شخص تنِ تنہا نیت باندھے کھڑا نظر آتا تھا۔ مولوی صاحب اوّابین پڑھ رہے ہوتے۔ اس کے بعد گھر پر آکر اسم ذات اور کلمۂ طیبہ کا بالجہر ذکر کرتے تھے۔ سورۃ مزمّل اور حزب البحر کے عامل تھے، عموماً رمضان المبارک میں ''حصنِ حصین'' پڑھا کرتے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو ''حصنِ حصین'' کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ ہمیشہ باوضو رہتے، سوتے تو اکثر وضو کر کے سوتے۔ خدا کی ذات پر کامل یقین اور بھروسہ تھا۔ ذرا بھی تکلیف آتی بارگاہِ خداوندی میں دست بستہ خشوع و خضوع سے کھڑے ہو جاتے، اس کی رحمت کو پکارتے، اپنے ضعیف و کم زور ہونے کی دلیل دیتے، ناتوانی و ناطاقتی کا اظہار کرتے، اس کو اس کی قدرتِ کاملہ کا واسطہ دیتے، رحم کی درخواست کرتے اور مدد و استعانت کے طلب گار ہوتے، اس طرح وہ گویا ''وَاسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ'' کی عملی تفسیر بن جاتے۔

میرے بیٹے عمیر میاں کی ولادت کے موقع پر زچہ و بچہ دونوں کی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، سخت اذیت اور پریشانی کا عالم تھا، اہلیہ کا آپریشن ہو رہا تھا، یہ صبح آٹھ

بجے کا وقت تھا، اللہ نے کرم کیا، ساتھ خیریت کے بچّے کی ولادت عمل میں آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ مولوی صاحب قریب کی مسجد میں ہیں، میں وہاں پہنچا دیکھا کہ نیت باندھے کھڑے ہیں اور رجوع الی اللہ میں اس قدر انہماک تھا کہ گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ ''اللہ اکبر'' کہہ کر میں نے متوجہ کیا، نماز پوری کر کے سلام پھیرا تو میں نے خوش خبری سنائی، سنتے ہی پھر سجدے میں گر پڑے اور رو رو کر ربّ العزّت کا شکر ادا کیا۔ فرماتے تھے، ہمیں کچھ نہیں آتا، ہاں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے رب سے بڑے پرامید ہو کر مانگتے ہیں اور وہ جلد یا بدیر سب مسئلے حل کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمانوں کی آمد کو خدا کی رحمت سمجھتے تھے جو کچھ ہوتا ان کے سامنے پیش کر دیتے۔ فرماتے، مجھے میرے شیخ نے نصیحت کی تھی کہ اگر کوئی مہمان آ جائے اور اس کی خاطر مدارات کے لیے تیرے پاس کچھ نہ ہو تو پانی کا گلاس ہی اس کی خدمت میں پیش کر دینا۔ چناں چہ ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ایک بے تکلّف دوست تشریف لائے۔ مولوی صاحب باتیں کرتے رہے کچھ دیر بعد مولوی صاحب نے کہا، آپ کے لیے پانی لاؤں۔ وہ کہنے لگے، پیاس نہیں ہے۔ باتوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، پھر تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کہنے لگے، پانی لاؤں، انھوں نے پھر انکار کر دیا۔ آخر تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب اٹھے اور پانی کا گلاس لا کر پیش کیا۔ وہ صاحب کہنے لگے، آپ پانی پلانے پر کیوں مصر ہیں، کچھ کھلانے کی بات نہیں کرتے۔ مولوی صاحب نے کہا، آج پانی ہی گھر میں ہے۔ وہ بھی کمال کے آدمی تھے پھر تو انھوں نے ایک نہیں، دو گلاس منگوائے اور اس ذوق و شوق سے پانی پیا جیسے کوئی بہت عمدہ مشروب پی رہے ہوں۔ جب کبھی گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی ہمیں یقین ہوتا کہ آج ضرور کوئی مہمان آئے گا اور مہمان آ جاتا تو اتنا خوش ہوتے جیسے کوئی بہت قیمتی خزانہ انھیں ہاتھ آ گیا ہو اور اگر کبھی اتّفاق سے مہمان نہیں آتا تو ہم پر ناراض ہوتے کہ تم ایسے بے عمل ہو کہ مہمان تک نہیں آتا۔ مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے گھر پر علماء و فضلاء اور بزرگان دین کی آمد کا سلسلہ رہا۔ بعض تو غیر معروف بھی تھے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لائے، ان کی اہلیہ نے ٹوپی والا برقع پہن رکھا تھا جب

وہ چلے گئے تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ سیدھے سادے بزرگ بڑے عبادت گزار ہیں۔روزانہ سات ہزار مرتبہ درود پڑھتے ہیں اور اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔انھیں بزرگوں کے طفیل ہمارا گھر پاک و پاکیزہ اور روشن و منور تھا۔

مولوی صاحب بڑے روادار تھے، ہر مسلک اور ہر مشرب کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اور جس سے ایک مرتبہ تعلق قائم ہو جاتا تو زندگی بھر اس تعلق کو نباہتے تھے، کسی بھی قسم کی کمی نہیں آنے دیتے۔منشی ابراہیم صاحب، حکیم نسیم جلالی، محمد سعید صاحب، بھائی لیاقت حسین صاحب، محمد اسحاق صاحب، حکیم مظفر حسن صاحب، قاری اسعد حسن خاں صاحب، مولانا سعد حسن خاں صاحب، قاری حبیب اللہ خاں صاحب اور پیر عبدالقدوس صاحب وغیرہ سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ اس کی مثال مجھے نظر نہیں آتی۔

شیخ صاحب کے صاحب زادگان سے ان کا جو قلبی تعلق تھا وہ احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ان میں مقناطیسی کشش تھی کہ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے جاتے تھے۔اکثر ایسا ہوا کہ مولانا سعد حسن خاں صاحب اپنے گھر سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے اور مولوی صاحب اپنے گھر سے، وہاں پہنچ کر پتا چلتا کہ وہ آپ ہی سے ملاقات کے لیے گئے ہیں۔وہ ایک دوسرے کی اولاد کو اپنی حقیقی اولاد پر ترجیح دیتے تھے۔میں تو لاڑکانے میں قاری اسعد صاحب کے پاس رہا ہوں ان کی اور ان کی اہلیہ (چچی بی) کی محبت و شفقت دیدنی تھی، پھر ان کی اولاد میں اور ہم میں ایسا تعلق ہو گیا تھا جیسے حقیقی بہن بھائیوں میں ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس تعلق کو نسلاً بعد نسلٍ قائم و دائم رکھے۔آمین۔

مولوی صاحب جدید تعلیم یافتہ طبقے سے متنفر نہیں تھے بلکہ ان کی کوشش ہوتی کہ اس طبقے کو قریب لائیں تاکہ انھیں دین کی طرف راغب کرنے کا موقع ملے۔وہ میرے دوستوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے، ان سے ایسی باتیں کرتے جو ان کی دلچسپی کی ہوتیں میرے دوست ان کے ساتھ بیٹھ کر کبھی نہیں اکتاتے بلکہ اکثر مجھ سے کہتے کہ یار! تمھارے والد مولوی نہیں ہیں، ان میں مولویوں والی کوئی بات نہیں ہے، ان سے گفتگو کرنے اور پاس بیٹھنے میں بڑی طبیعت [illegible] بزرگ معلوم ہوتے

ہیں اور مولوی صاحب موقع موقع سے دین کی باتیں ان کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے۔
ایک مرتبہ ہم قربانی کا جانور لینے گئے قاصد عزیز مرحوم بھی ساتھ ہو لیے۔ مولوی صاحب نے قاصد عزیز سے پوچھا، آپ بھی قربانی کی طرف توجہ دیجیے، اس کا بہت بڑا اجر ہے، قاصد کہنے لگے، مولوی صاحب! میں مہینے کا سامان تو ادھار لیتا ہوں اور تنخواہ پر ادا کر دیتا ہوں، میں کہاں کر سکتا ہوں، مولوی صاحب نے فرمایا، اگر آپ کوشش کریں تو کیا تنخواہ میں سے قربانی کر سکتے ہیں؟ قاصد کہنے لگے، کی تو جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا، تو پھر ادھار لے کر قربانی کر دیں تنخواہ پر ادا کر دیجیے گا، قاصد نے کہا، قرض لے کر قربانی کہاں جائز ہے۔ مولوی صاحب نے کہا، بھائی! بچّوں کو تو تم قرض لے کر کھلاتے ہو جو تم پر فرض ہے اور پھر یہ قرض کہاں ہے یہ تو آپ نے اپنا نظم ایسا بنالیا ہے۔ ذرا سی کوشش کریں گے یہ نظم بھی صحیح ہو جائے گا۔ اس دن کے بعد قاصد عزیز ہر سال پابندی سے قربانی کرنے لگے۔

مولوی صاحب بڑے زمانہ شناس تھے۔ وہ ان تنگ نظر اور متعصب مولویوں میں سے نہ تھے جو جدید علوم کی تحصیل کو کفر کے درجے میں شمار کرتے ہیں اور نہ ہی مولوی نما مسٹر تھے کہ دینی علوم کو غیر سود مند خیال کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں اسی لیے انھوں نے اپنی اولاد کو جدید و قدیم دونوں علوم کی تعلیم سے آراستہ کیا، سب کو اعلیٰ تعلیم دلوائی الحمدللہ تین چھوٹے بھائی حافظ ہیں۔ ناچیز جب ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہا تھا تو ان سے حدیث پڑھی، مشکوٰۃ المصابیح میں کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ مکمل اور کتاب الجہاد دو کتاب الآداب کے متعدد حصّے پڑھے۔ یہ انھیں کی ترتیب تھی کہ میں نے اپنے بیٹے عمیر کو حافظ بنایا اور خود بھی قرآن حفظ کرنے لگا الحمدللہ اٹھارہ پارے یاد ہو گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پورا قرآن کرادے اور اس نعمت غیر مترقبہ سے مالا مال کر دے۔ آمین۔

مولوی صاحب کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ اختلافی مسائل کبھی نہیں چھیڑتے تھے، انھوں نے کبھی کسی سے بغض یا عداوت نہیں رکھی۔ ہر ایک سے مساویانہ سلوک روا رکھا یہی چیزیں ان کے تعلق کی اساس بنیں۔ احباب ہوں یا اعزّہ کسی سے بھی ایسی کوئی بات نہیں کرتے جو دل آزادی کا موجب ہو، طنز اور طعن و تشنیع سے گریز کرتے اور یہ بات مجھے ہمیشہ

اجنبی معلوم ہوتی، اِس لیے کہ میں نے اس طبقے (علماء) میں طنز اور طعن و تشنیع کا رواج دیکھا ہے۔

والدۂ محترمہ (اللہ تعالیٰ اُن کا سایہ تادیر قائم رکھے) سے بڑی محبت کرتے تھے اس بات کا اعتراف کرتے کہ انھوں نے ہر دور میں ہر قسم کے حالات میں انتہائی خوش دلی سے رفاقت نباہی ہے۔ فرماتے تھے، عورت محض جمال و زیبائش، رعنائی و دل کشی ہی سے مرد کے دل میں گھر نہیں کرتی بلکہ متعلّقین کے ساتھ رویے، اخلاق و کردار اور ضبط و تحمل سے مرد کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ عبادت و ریاضت ایک طرف، لیکن شوہر کے متعلّقین کے تند و تیز رویے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، ان کی خدمت کرنا اور اولاد کی تربیت میں ہاتھ بٹانا بھی عبادت ہے اور یہ تمام کام تمھاری ماں نے بڑی خوبی سے سرانجام دیے ہیں۔ ہم گواہ ہیں کہ والدہ نے ہر ایک کی بلا امتیاز خدمت کی ہے۔ خاص طور سے چچاؤں کی۔ اس کا صلہ تو وہ خدا ہی سے چاہتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے دادا فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص کسی کے ساتھ نیکی کرے پھر یقین رکھے کہ اس کا بدلہ ضرور برائی سے ملے گا اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھ لے کہ اس کی نیکی قبول نہیں ہوئی۔ ذرا بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں صدیوں کا تجربہ پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ والدہ کو جزائے خیر دے۔

مولوی صاحب کی طبیعت میں بڑی چابک دستی تھی، معاملہ فہمی اور تدبّر حد درجہ پایا جاتا تھا۔ حالات و واقعات سے ہونے والی بات کا پہلے سے ہی اندازہ کر لیتے تھے اور حسنِ تدبیر سے ہر معاملے کو نمٹا لیتے تھے۔ اپنی ذات پر انھیں پورا اعتماد تھا اسی لیے اپنے کیے ہوئے ہر فیصلے پر سختی سے کاربند رہتے اور کسی کی دخل اندازی قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ پاکیزہ اور نفاست پسند طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے، ہر چیز کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے، اپنی استطاعت کے مطابق بہترین لباس زیبِ تن فرماتے، عموماً سفید لباس پسند کرتے تھے۔ عطر کے بے انتہا شوقین تھے۔ داڑھی پر خوب عطر لگاتے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ چاندرات کو ان کے لیے بہترین سے بہترین عطر لے کر آتا اور وہ بہت ہی خوش ہوتے۔

مولوی صاحب رفاہی اور دینی کاموں میں بڑے ذوق شوق سے حصّہ لیتے تھے۔ متعدد مساجد [illegible] کی [illegible] رکھی۔ جامع مسجد لطیف آباد نمبر ۱۰ میں ایک دارالعلوم قائم کیا تھا

اس سے سیکڑوں حفاظ نکل چکے ہیں۔ اس میں دارالحدیث قائم کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ تو لوگوں کی جدید علوم کے مقابلے میں دینی علوم کی طرف سے بے رغبتی اور کچھ ناموافق حالات کے سبب یہ آرزو دل ہی میں لے کر چلے گئے۔

مولوی صاحب کو عرصے سے ضیق النفس کی شکایت تھی۔ کبھی کبھی مرض شدت اختیار کر جاتا تھا، وہ ہمیشہ بڑی مستعدی سے علاج کراتے تھے۔ مرض تو آخر مرض ہی ہے، تنفس سے قلب بھی متأثر ہوا تھا، لیکن معمولات زندگی تھے کہ جاری تھے، اکثر دعا فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کسی کا محتاج نہ کرے، چلتے پھرتے ایمان کے ساتھ بلا لے۔ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کی۔ ذیل پاک ماڈل اسکول سے ریٹائر ہو کر میمن انجمن ہائی اسکول حیدرآباد میں جز وقتی مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ گذشتہ چھ ماہ سے کوئی تکلیف بھی نہ تھی، چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ انتقال سے دو تین دن پہلے ایک ایک سے مل کر آئے، جن لوگوں سے عرصہ تک ملاقات نہیں ہوئی تھی ان سے بھی خاص طور پر ملنے گئے۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء کو حسبِ معمول اسکول گئے۔ سب کام کیے، روزانہ بعد نماز عشا کھانے سے فارغ ہو کر گھر کے آگے ٹہلتے جاتے اور تسبیح پڑھتے جاتے تھے، اس روز بھی یہی عمل دہرایا، مرض کا نام و نشان تک نہ تھا اطمینان سے سو گئے۔ رات نصف شب ایک بجے کے قریب اُٹھے۔ استنجا کیا اس کے بعد وضو کرنے بیٹھے وہ اکثر وضو کر کے سوتے تھے۔ وضو کے دوران تنفس ہو گیا، چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے اور اسم ذات کا بالجہر ذکر کرنے لگے، اکثر مرض کی شدت میں وہ ایسا ہی کرتے تھے، معمول کی دوائیں استعمال کیں، مگر مرض بڑھتا گیا، لیٹنے لگے تو محمد عبدالرافع نے سہارا دیا لیٹے لیٹے "رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ" کے الفاظ زبان سے ادا ہوئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زبان بند ہو گئی، اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔ میں یہاں کراچی میں ہی تھا ایک روز پہلے ہی ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ اطلاع ملتے ہی روانہ ہو گیا۔ فجر کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ مسجد سے اعلان ہوا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ سب متعجب تھے کہ رات کو تو مولانا کو ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مولانا پیر عبدالقدوس صاحب نے غسل دیا۔ بعد ظہر دفنانا طے ہوا تھا۔

۳۰ ستمبر سخت ترین گرمی پڑ رہی تھی۔ سورج کی تپش ایسی کہ الامان والحفیظ۔ ۱۲ بجے کے قریب میں میت کے قریب گیا دیکھا کہ سینہ پھولا ہوا ہے، مجھے سخت تشویش ہوئی۔ میں نے مولانا نعمانی سے کہا کہ مولوی صاحب نے رات معمول کے مطابق کھانا کھایا تھا، آج گرمی شدید ہے، پیٹ پھول رہا ہے، ڈر ہے کہیں پھٹ نہ جائے لہٰذا فوراً ہی دفنا دینا چاہیے۔ مولانا نے دیکھا پھر فرمایا، گھبراؤ نہیں کچھ نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو حافظ ہوتا ہے، کثرت سے قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے مرنے کے بعد قرآن سینے پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس وقت تک ساتھ رہتا ہے۔ جب تک وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے۔ تب مجھے اطمینان ہوا۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور سے یہاں پوری حدیث نقل کی جاتی ہے:

> ابن ابی دنیا نے ''التہجد'' میں اور ابن الفریس نے ''فضائل القرآن'' میں اور حمید بن زنجویہ نے ''فضائلِ اعمال'' میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ تم رات کو قرآن پڑھو تو بلند آواز میں پڑھو کیوں کہ اس سے شیاطین اور سرکش جن بھاگ جاتے ہیں اور ہوا میں رہنے والے فرشتے اور گھر کے رہنے والے سنتے ہیں۔ نیز جب کوئی قرآن نماز میں پڑھتا ہے تو لوگ اس کو دیکھ کر نماز پڑھتے ہیں اور گھر والے بھی پڑھتے ہیں۔ جب یہ رات گزرتی ہے تو یہ رات اگلی رات کو وصیت کر دیتی ہے کہ اس عبادت گزار بندے کو اسی طرح رات کو جگا دینا اور اس کے لیے تو آسان ہو جانا۔ پھر جب موت کا وقت آتا ہے تو قرآن اس کے سر کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب لوگ اسے غسل دے کر فارغ ہوتے ہیں تو قرآن اس کے سینے اور کفن کے درمیان داخل ہو جاتا ہے اور جب قبر میں اس کے پاس منکر نکیر آتے ہیں تو قرآن بندے اور ان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ تو درمیان سے ہٹ جا، ہم اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو

قرآن کہتا ہے کہ بخدا میں اس شخص کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ یہ جنت میں نہ چلا جائے۔ اگر تم کو اس کے بارے میں کچھ حکم دیا گیا ہے تو تم اسے پورا کرو۔ پھر قرآن مُردے کی طرف دیکھ کر کہتا ہے، تُو نے مجھے پہچانا یا نہیں، وہ کہے گا نہیں، قرآن کہے گا میں قرآن ہوں جو تجھ کو رات بھر بیدار رکھتا تھا اور دن میں پیاسا رکھتا، نفسانی خواہشات سے منع کرتا خواہ وہ آنکھوں کی ہوں یا کان کی۔ اب تُو مجھے سب سے بہتر دوست اور سب سے سچا بھائی پائے گا۔ اب تُو بشارت سن کہ تجھ سے منکر نکیر کا سوال نہیں ہوگا، پھر منکر نکیر اس کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور قرآن بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے اور اس مُردے کے لیے بچھونا اور چادر طلب کرتا ہے، جنت کی قندیل اور خوشبودار پھول ایک ہزار مقرب فرشتے اٹھا کر لاتے ہیں، لیکن قرآن ان سے پہلے قبر میں پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا تُو میرے بعد خوف زدہ تو نہیں ہوا؟ میں تو صرف اس لیے بارگاہِ خداوندی میں پہنچا تھا کہ اس سے بستر، چادر اور چراغ کی سفارش کروں، اب یہ تمام چیزیں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ پھر فرشتے آ کر اس کا بستر کرتے ہیں، چادر قدموں کے نیچے رکھتے ہیں اور پھول سینے کے پاس، وہ شخص ان کو روزِ محشر تک سونگتا رہے گا۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کے پاس ہر روز ایک یا دو مرتبہ آتا ہے اور ان کے لیے سربلندی اور بھلائی کی دعا کرتا ہے۔ اگر اس کی اولاد میں سے کوئی قرآن حفظ کرتا ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے اور اگر کوئی برا ہو جاتا ہے تو وہ اس پر افسوس کرتا ہے، روتا ہے اور یہ طرزِ عمل صور پھونکے جانے تک ہوگا۔

نمازِ جنازہ مولانا نعمانی نے پڑھائی۔ جنازے میں ایک جمِ غفیر تھا۔ جس میں علماء وصلحاء سب ہی شریک تھے۔ بعد میں عرصے تک تعزیت نامے آتے رہے۔ ہندوستان سے مولانا

سیّد ابوالحسن علی ندوی اور حضرت مولانا انعام الحسنؒ کاندھلوی نے تعزیت نامے بھیجے، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مولانا محمد عبدالسمیع ندوی صاحب نے تعزیتی خط لکھا اور ہدایت کی کہ تم اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ ، وَارْحَمْہُ پڑھا کرو، اب ان کا عمل ختم ہوگیا اب تم جو کچھ ان کے لیے کرو گے وہی ان کے کام آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ راقم الحروف، حافظ محمد عبدالودود، حافظ محمد عبدالوارث (برلن، جرمنی) حافظ ڈاکٹر محمد عبدالمغیث، محمد عبدالواسع (انجینیئر) اور سب سے چھوٹے محمد عبدالرافع (انجینیئر، کینیڈا) بہنوں میں امۃ العلیم (عذرا پروین) امۃ العزیز اور امۃ الرؤف (عفیفہ) ہیں۔ میرے اور محمد عبدالرافع کے درمیان بائیس سال کا فرق ہے۔ ابھی حال ہی میں مَیں امریکا اپنی بیٹی سمیہ کے پاس شکاگو گیا تھا، محمد عبدالرافع میاں، ونی پیگ (Winnipeg) کینیڈا سے سولہ گھنٹے کی طویل ڈرائیور کر کے آئے مجھے اور میری اہلیہ کو اپنے گھر لے گئے، اس کی بیوی ڈاکٹر مبین فاطمہ کو اہلیہ ہی بیاہ کر لائی تھیں وہ وہاں مینی ٹوبا یونیورسٹی (University of Manitoba) میں بچوں کی ڈاکٹر ہے۔ Pediatric neurology کی بہت بڑی ڈاکٹر مانی جاتی ہے اور Stock کے شعبے میں تو وہ کینیڈا میں چوتھے پانچویں نمبر پر آتی ہے، ان دونوں میاں بیوی نے ہمیں نہایت محبت اور پیار سے رکھا، محمد عبدالرافع نے تو میری ساتھ ایسا رویہ رکھا جیسا وہ مولوی صاحب کے ساتھ رکھتا، اگر وہ زندہ ہوتے۔ ان کے دو بچے ہیں: امیمہ اور عمار۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش و خرم رکھے، سب کو اپنی عافیت اور امان میں رکھے اور دونوں کو اپنی اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ میں عمر کے جس حصّے میں ہوں، اس میں مجھے کچھ نہیں چاہیے، صرف محبت۔ میں تو دعا کرسکتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اَللّٰھُمَّ اَلِّفْ بَیْنَ قُلُوبِنَا وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِنَا وَاھْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّورِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَبَارِکْ لَنَا فِی اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَّاتِنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ، وَاجْعَلْنَا شَاکِرِینَ لِنِعْمَتِکَ، مُثْنِیْنَ بِھَا، قَابِلِیْھَا وَاَتِمَّھَا عَلَیْنَا۔

آج مولوی صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن مجھے ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف یاد ہے۔ ان کی محبتیں، ان کی شفقتیں، ان کی عنایتیں ان کی نوازشیں سب از بر ہیں وہ زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا تھے اور زندگی کو ایک بڑی حقیقت سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

اور گردابِ بلا تو ہر ایک کو اپنی سمت کھینچ کر تہہ نشیں کر دیتا ہے، مگر وہ غواص فطرت طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے کہ جس نے بحرِ حیات کی شناوری کی خوب مشق کرائی تھی۔ اب انھیں نہ گردابِ بلا کا خوف تھا اور نہ حالات کے نہنگ واژدر کا ڈر تھا۔ ہمّت، حوصلہ، استقلال و استقامت یہی ہمیشہ ان کے معاون رہے۔ پہاڑوں سے ٹکرانا اور طوفانوں سے کھیلنا ان کی فطرت بن چکا تھا۔ زندگی کے طویل سفر نے ہمیشہ انھیں آبلہ پا ہی رکھا، لیکن یہ آبلہ پائی ان کے لیے کبھی زنجیر نہیں بنی۔ بے رحم اور عناں گسستہ عناصر ہمیشہ ان کی طرف بڑھتے رہے اور وہ نہایت جرأت وہمّت سے ان کو لگام لگاتے رہے۔ زندگی کی طوفان خیز لہروں سے ہم نے ہمیشہ انھیں نبرد آزما دیکھا۔ شدائد حیات کے سامنے کبھی انھیں سپر افگندہ نہیں پایا اور نہ مصائب کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بے دست و پا، بلکہ مضبوط چٹان کی طرح وہ ہر جگہ استادہ ہی نظر آئے اور اخیر عمر تک مستعدی و جفاکشی میں فرق نہیں آیا:

رہ رواں را خستگیٔ راہ نیست
عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

یوں بھی زندگی قرار وثبات کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ زندگی زمانے کے نشیب وفراز ہی سے عبارت ہے اور زندگی گزارنا استقلال و استقامت ہی سے مشروط ہے۔ نیرنگیٔ فلک کج رفتار نے نہ معلوم کون کون سے ان پر مظالم کیے، لیکن ضبط وتحمل سے زندگی کا فسانہ ترتیب دیتے رہے اور اشہبِ دوراں کی لگام تھامے ناہموار راستوں پر رواں دواں رہے۔ ان کی زندگی مسلمہ اصولوں کی پابند تھی وہ کسی بھی حال میں اصولوں کا سودا نہیں کرتے تھے، جس بات کو حق سمجھتے اس پر جمے رہتے، انسانی شعور جب بیدار ہو جاتا ہے تو آدمی

حق و باطل میں تمیز کرنے لگتا ہے پھر یہی اس کی پہچان بن جاتی ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

زمانے کی بے ثباتی و ناپائیداری کا انھیں ہمیشہ ہی احساس رہا ہے۔ یہی احساس عبادت و ریاضت پر منتج ہوا۔ بہت ہی حساس اور رقیق القلب واقع ہوئے تھے رات کی تاریکی میں بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہو کر اس قدر گڑگڑاتے کہ سننے والوں کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔ منبر رسول پر کھڑے ہو کر جب دست بدعا ہوتے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا، گلا رندھ جاتا، جذبات کا تلاطم ہر بند کو مسمار کرتا ہوا آگے بڑھنے لگتا۔ گویا خواجہ میر درد کی زبان میں کہہ رہے ہوں:

واعظ کسے ڈراوے ہے یوم الحساب سے
گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

اثر و تاثیر کی یہ کیفیت ہوتی کہ ہزاروں کے مجمع میں چھوٹا ہو یا بڑا متأثر نظر آتا اور آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ ان کی طبیعت میں کیسا اخلاص اور کیسی محبت تھی اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن سے ان کا کسی نہ کسی عنوان تعلّق رہا ہو، وہ اپنے پرائے ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے۔ طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا بظاہر خاموش رہتے، کسی پر اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا رعب نہیں ڈالتے، لیکن جب کبھی اہل علم کی محفل میں ہوتے وہاں ان کے جوہر کھلتے بڑی مدلل گفتگو فرماتے تھے۔ ان میں مولویانہ تنگ نظری اور اکھڑپن قطعاً نہ تھا، جیسی محفل ہوتی اسی کے مناسب حال گفتگو فرماتے، البتہ ناپسندیدہ امور پر سختی سے نہیں نہایت نرمی سے تنبیہ کرتے۔ مولانا طلحہ صاحب کی شگفتہ بیانی اور خوش مزاجی کا مزہ لے لے کر تذکرہ کرتے، ان کے جملے اور باتیں یاد کر کے تبسم فرماتے۔ شاید شگفتہ بیانی اور خوش مزاجی کا حصہ انھیں مولانا ہی کی صحبت میں رہ کر حاصل ہوا ہوگا۔ وہ جب بھی اپنے بزرگوں اور اساتذہ کا تذکرہ کرتے جذبات کی رو میں بہہ جاتے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کہہ رہے ہوں:

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

وہ کٹر حنفی المسلک تھے، امام ابوحنیفہ سے بے حد عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ میں اکثر امام صاحب سے اختلاف کرتا کبھی کبھار تو میرے مُنہ سے ایسے جملے نکل جاتے جو امام صاحب کے مرتبے کے موافق نہ ہوتے مثلاً یہ کہ امام صاحب نے بڑی گڑ بڑ پھیلا دی، سارا قصور انھیں کا ہے کہ دین میں بہت سی آسانیاں فراہم کر دیں، جب ہی تو ہم جیسے دینی امور میں تسائل برت جاتے ہیں، یا یہ کہ امام بخاری نے ان کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ صحیح ہیں وغیرہ۔ ایسے مواقع پر چہرے پر غصّے کے آثار نمایاں ہو جاتے، آنکھیں سرخ ہو جاتیں، نظریں نیچی کر کے خاموشی اختیار کر لیتے گویا اپنے غصّے پر قابو پا رہے ہوں، پھر نہایت نرمی سے سمجھاتے، کتابوں کے حوالے دیتے اور دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس پر بھی اگر میں اپنے موقف پر ڈٹا رہتا تو یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ میاں مطالعہ کرو پھر تمھاری سمجھ میں آئے گا۔ مولویوں کی طرح غصّے میں آپے سے باہر نہیں ہو جاتے۔

تربیت کا انداز بھی عجیب تھا۔ زاہدِ خشک کی طرح ناصح نہیں بن جاتے بلکہ دوستانہ ماحول میں دینی یا اخلاقی تعلیم دیتے۔ انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے۔ ایسے وقت نصیحت فرماتے، جب اس کا مناسب موقع ہوتا۔ جانتے تھے کہ لوہا گرم ہو تو ہلکی سی چوٹ بھی مؤثر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ملّائیت سے بیزار نہیں، بلکہ متنفر ہے، ان سے خوش تھا، ان کی طرف رجوع کرتا اور مطمئن ہو جاتا۔ میرے ساتھ معاملہ ہی عجیب تھا۔ موقع موقع سے علمی و ادبی مسائل چھیڑ دیتے۔ میری دلیلوں کو رد کر دیتے اور مجھے زیادہ سے زیادہ بحث کا موقع فراہم کرتے۔ کوئی بھی فقہی یا علمی مسئلہ درپیش ہوتا تو یاد ہوتے ہوئے بھی اصلی ماخذ کی طرف رجوع کرتے۔ یہ انھی کا فیض ہے کہ ناچیز کو بھی تحقیق و تلاش کے سلسلے میں اصل مآخذ و مصادر اور لفظوں کو صحت سے استعمال کرنے کے سلسلے میں لغات کی طرف بار بار مراجعت کی عادت ہو گئی ہے۔ شعر و ادب کا خاص ذوق تھا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی کی نثر کے گویا شیدائی تھے۔ غالب کے مقابلے میں ذوق اور مومن کو ترجیح دیتے تھے۔

مجھے اس سے اختلاف ہوا تو علمائے معانی و بیان کی کتابوں کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ میں نے انھیں کے مشورے پر شمس الدّین محمد بن قیس رازی کی ''المعجم فی معائیر اشعار العجم''، ''چہار مقالہ'' جلال الدّین سیوطی کی ''الاتقان'' کا ترجمہ، علامہ شبلی نعمانی کی ''شعرالعجم''، نجم الغنی رامپوری کی ''بحر الفصاحت'' اور عبدالحئیٰ صاحب کی ''گلِ رعنا'' کا مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خود انھوں نے ''نقد الشعر''، ''العمدہ''، ''صبح الاعشیٰ'' اور ''صناعتین'' وغیرہ کے بہت سے ابواب پر مجھے لیکچر دیے۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ ان کی ایک ڈائری ہے جس میں انھوں نے عربی و فارسی اور اردو شعراء کے کلام کا انتخاب کیا ہے، فارسی شعراء میں امیر خسرو، سعدی، حافظ، نظیری، فیضی، عرفی، ابو طالب کلیم، صائب اور غالب کا کلام ہے۔ اس میں زیادہ تر غزلیں ہیں، لیکن قاآنی اور عرفی کے قصائد کا انتخاب بھی ہے۔ فارسی شعراء میں صائب کو بہت پسند کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم کے بڑے عاشق تھے۔ کبھی کبھی تو ترنم میں بہت لہک لہک کر مثنوی کے اشعار پڑھتے۔ اس ڈائری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ شعر و سخن میں ان کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ علم معانی، بیان، بدیع اور قافیہ و ردیف کے ساتھ علم و عروض میں بھی انھیں بڑا درک تھا۔ میں نے علم عروض میں ''محیط الدائرہ'' انھی سے پڑھا۔

آہ! میں ان کی کس کس بات کو دہراؤں۔ بیان کرنے کا یارا نہیں۔ افسوس، صد افسوس کہ میں نے ان سے کچھ نہیں سیکھا۔ ابھی تو مجھے ان سے زندگی گزارنے کا درس لینا تھا۔ طوفانِ باد و باراں اور برق و رعد کے تند و تیز موسم میں استادہ رہنے کی ان سے تعلیم حاصل کرنی تھی کہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر پائے استقامت میں لرزش پیدا نہ ہونے پائے۔ شفقت و محبت، مہر و مروت، رحمت و رافت اور اخلاص و وفا کی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ استقلال و استقامت کی عملی شکلیں ان سے سیکھنا تھیں، زندہ دلی، شگفتہ بیانی اور خندہ روئی کی مشق کرنی تھی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

زندگی گزارنے کا سلیقہ ہر کسی کو نہیں ہوتا، قوت برداشت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے

ایثار و قربانی کے مفہوم سے بہت کم آشنا ہوتے ہیں، زمانے کے سرد و گرم کا مزا چکھنے کی صلاحیت ہر ایک میں نہیں ہوتی اس کو سیکھنے کے لیے تو رہبر کامل کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی رہبر کامل ہم سے جدا ہو گیا، ہمیشہ کے لیے کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔

اے ہم نفسان محفلِ ما

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

بے شک وہ ہمارے پاس نہیں ہیں، لیکن ان کا فیض ابھی تک جاری ہے، ہر مشکل گھڑی میں وہ نگراں رہتے ہیں۔ ان کے انتقال کے کئی سال بعد میرا اپینڈکس پھٹ گیا رات گیارہ بجے یہ واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا دوسرے روز دوپہر کو سمجھ میں آیا، آپریشن کا فیصلہ ہوا۔ شام چار بجے کے قریب مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا جانے لگے۔ میں اسٹریچر پر لیٹا جب برآمدے سے گزر رہا تھا تو میری نظریں چھت کی طرف تھیں۔ میں نے وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین جگہ مولوی صاحب کی آنکھیں حقیقۃً چمکتی ہوئی دیکھیں اور وہ یہ احساس دلا رہی ہیں کہ گھبراؤ نہیں ہم نگراں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی پوری زندگی روز روشن کی طرح میرے سامنے ہے وہی میرے لیے مشعلِ راہ ہیں، ان پر گزرنے والے واقعات و حالات میرے لیے کسوٹی اور معیار ہیں مجھے اب کسی تجربے کی ضرورت نہیں، ان کی دعائیں میرے ساتھ ہیں، یہی میرا سرمایۂ حیات ہے، یہی میری دولت ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ فی الدارین خیراً:

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ!

وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ ، وَارْحَمْہُ ، وَعَافِہٖ ، وَاعْفُ عَنْہُ ، وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَہٗ ، واغْسِلْہُ بِالْمَآءِ وَالثَّلَجِ وَالْبَرْدِ ، وَنَقِّہٖ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ ، وَاَبْدِلْہُ دَارًا خَیْرًا مِّنْ دَارِہٖ، وَاَھْلاً خَیْراً مِنْ اَھْلِہٖ ، وَزَوْجاً خَیْراً مِّنْ زَوْجِہٖ ، وَاَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ،وَاَعِذْہُ مِنْ عَذَابِ القَبْرِ وَ عَذَابِ النَّار

☆☆☆

حکیم مظفر حسن خاں

(المتوفٰی: ۱۹۷۸ء)

مولانا محمود حسن خاں ٹونکی صاحب معجم المصنفین کے صاحب زادے، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بھتیجے تھے۔ باپ، چچا، تایا، دادا سارا ہی خاندان علماء کا خاندان تھا۔ ایک چچا طبیب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے طب کی تعلیم اپنے چچا سے اور وقت کے دوسرے نام ور اطباء سے حاصل کی اور اپنے چچا کے مطب ہی میں بیٹھنے لگے۔ جے پور میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ وہیں آ گئے اور مطب کرنے لگے۔ طبابت وحذاقت گھٹی میں پڑی تھی اس لیے مطب خوب چلا۔ قیام پاکستان کے بعد حیدر آباد منتقل ہو گئے، بڑا سخت دور گزرا۔ بعد میں شاہی بازار حیدر آباد میں سلیمی دواخانے میں بحیثیت طبیب بیٹھنے لگے تھے۔ نبض دیکھتے جاتے تھے اور نسخہ لکھتے جاتے تھے۔ از خود کوئی اپنی بیماری بتاتا تو وہ سنتے رہتے، خود کچھ نہیں پوچھتے تھے اور لوگوں کو شفا بھی ہوتی تھی۔ جے پور میں جب تھے تو ایک مرتبہ والدہ کو دیکھنے آئے۔ اس زمانے میں پردہ بہت سخت تھا، خواتین دروازے سے باہر ہاتھ نکال دیتیں اور حکیم صاحب نبض دیکھ کر مرض کی تشخیص کر لیتے تھے۔ جب حکیم صاحب نے والدہ کی نبض دیکھی تو دادا کو لڑکے کی پیدائش کی خوش خبری سنائی۔ یہ میری ہی پیدائش کی خوش خبری تھی۔ پرانے اطباء نبض اور قارورہ دیکھ کر حتمی طور پر بتادیا کرتے تھے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ آج الٹرا ساؤنڈ سے جنس بتائی جاتی ہے۔

وہ زمانہ بھی عجب کس مپرسی کا زمانہ تھا، زیادہ تر لوگوں کے حالات خراب تھے۔ ڈاکٹروں کی فیس زیادہ ہوتی تھی کہاں سے ادا کرتے، سرکاری ہسپتالوں میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ بیمار تو بیمار اس کے ساتھ جانے والا بھی بیمار ہو جاتا تھا۔ مجبوری کے درجے میں لوگ

طبیبوں سے ہی رجوع کرتے تھے۔ اللہ بھی مددگار ہوتا تھا۔ صدیوں سے جو معجونیں، جوارشیں، مرکبات اور جوشاندے چلے آرہے تھے انھیں سے فائدہ ہوجاتا تھا۔ پھر نہ کھانے کے لیے مرغن غذائیں میسّر تھیں، نہ بہترین سواریاں، نہ آرام دہ زندگی تھی۔ سیدھی سادی غذا، محنت و مشقت سے بھرپور زندگی نت نئی بیماریاں کہاں سے آتیں۔ ام الامراض تو معدہ ہے۔ معدہ ہی خالی ہوتو پھر بیماریوں کا کیا سوال۔ کتبِ تاریخ ورجال میں مرقوم ہے کہ چین کے بادشاہ نے علاج معالجے کے لیے اپنا ایک طبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بھیجا وہ طبیب کم وبیش ایک سال تک وہاں رہا۔ آخرِ کار اس نے اپنے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ یہاں میرا کوئی کام نہیں ہے، حکم ہوتو میں واپس آجاؤں۔ بادشاہ نے بلا لیا۔ جب وہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو عرض کیا کہ حضور! وہاں تو کوئی بیمار ہی نہیں ہوتا۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ لوگ نہ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں نہ بیمار ہوتے ہیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ پیٹ کے تین حصّے کرو: ایک حصّہ غذا کے لیے، ایک حصّہ پانی کے لیے اور ایک حصّہ ہوا کے لیے جو سانس کے ذریعے جاتی ہے)، لیکن ہم ہیں کہ وقت بے وقت، الابلا، مرغوب و نامرغوب، ہر قسم کی چیزیں پیٹ میں اتار لیتے ہیں، نہ سادہ زندگی رہی نہ سادہ غذا۔ یوریا کھاد نے زمین پر حد سے زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ ایٹمی توانائی کے اثرات سے فضا اور بھی زیادہ مکدّر ہوگئی ہے، اب نت نئی بیماریاں ہیں ان سے بچنا محال ہے۔ میڈیکل سائنس بھی اب اس نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہے کہ جان بچانی ہوتو جان لے لو۔ وائرس کو مار دو جان بچ جائے گی۔ سیکڑوں اینٹی بایوٹک (antibiotic) دوائیں ایجاد ہوگئی ہیں ان کے استعمال کے بعد بھلا اب کون سی دوا کارگر ہوسکتی ہے۔

حکیم صاحب بڑے فاضل طبیب تھے، ان کا علم بھی وسیع تھا، مریض کو دیکھتے تو اپنی جملہ صلاحیتوں سے کام لے کر اس کا علاج تجویز کرتے پھر اس کی صحت یابی کے لیے اللہ کے آگے گڑگڑاتے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے بڑی پیچیدہ پیچیدہ بیماریوں کا علاج کیا ہے۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہوکر مریض ان کے پاس آتے اور صحت یاب ہوجاتے۔ وہ بڑے متقی پرہیزگار، ایمان دار و دیانت دار، شفیق و مشفق انسان تھے۔ اپنے پرائے سب سے حسن سلوک کا

معاملہ تھا۔ والد صاحب سے خصوصی تعلق تھا ایسا گہرا کہ بھائیوں جیسا اور زندگی کے آخری سانسوں تک یہ تعلق اسی انداز میں برقرار رہا۔

حکیم صاحب نے زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کو خوب خوب برداشت کیا۔ ویسے بھی اہل کمال تو ہمیشہ حوادث کا شکار رہے ہیں۔ شاید زمانے کو آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ میں چھوٹا سا تھا، لیکن مجھے بہت سی باتیں واضح طور پر یاد ہیں، بہت سی نہیں بھی ہیں۔ عیدالاضحیٰ کا دن والد صاحب اور ہم عید کی نماز پڑھنے گئے۔ یہ موقع ایسا تھا کہ ہمارے گھر قربانی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت والد صاحب کے پاس صرف ۱۴/ آنے تھے۔ اس زمانے میں روپیہ ۱۶/ آنے پر مشتمل ہوتا تھا۔ عیدگاہ میں حکیم صاحب مل گئے ان کے بھی حالات وہی تھے جو ہمارے تھے، حکیم صاحب جانتے بھی تھے۔ تذبذب کے عالم میں مستغرق کہ نہ معلوم آغا صاحب کے پاس بھی پیسے ہوں گے کہ نہیں۔ پھر غیرت بھی انھیں سوال کرنے سے روک رہی تھی، مگر مجبور تھے۔ خیال ہوا ہوگا کہ آج کے دن بچے بغیر کھائے پیے کیسے رہیں گے۔ اس زمانے میں عزیز واقارب اور محلّے پڑوس میں خال خال ہی قربانی ہوتی تھی۔ اکثر گھروں میں انتظار ہوتا تھا کہ کہیں سے گوشت آئے گا تو پکے گا۔ والد صاحب نے حکیم صاحب کی حالت بھانپ لی۔ فرمایا، میرے پاس کل ۱۴/ آنے ہیں آٹھ آنے آپ لے لیجیے اس طرح ہم دونوں کا ہی کام چل جائے گا۔ میں کبھی سوچتا ہوں کہ نہ معلوم حکیم صاحب نے کتنے ہی دن ایسے سخت گزارے ہوں گے اور وہ اللہ توکل زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہوں گے۔ بعد میں تو اللہ کا فضل ہو گیا اور وہ فراغت سے زندگی گزارنے لگے۔

حکیم صاحب بڑے خاموش طبع تھے، نرم رو، چلتے تھے تو آگے کی طرف جھک کر نیچی نظریں کیے ہوئے، اردگرد سے بے نیاز بس سیدھے چلے چلے جارہے ہیں، منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتے تھے۔ ہم سے بہت محبت وشفقت سے ملتے تھے، بزرگانہ رویّے کے ساتھ، ہمیشہ والد صاحب اور والدہ کی خیریت دریافت کرتے۔ وہ خوش مزاج بھی تھے، مگر ان کی خوش مزاجی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رہتی تھی۔ اس کے برعکس ان کے صاحب زادے ڈاکٹر ظفر حسن بڑے ہی ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے۔ ہمارا ان کا تعلق بھائیوں کا سا تھا۔ کبھی تو وہ ہمیں

بھائی سمجھتے اور کبھی سالا۔ اس تعلق سے کہ مولانا سعد حسن خاں صاحب کی بڑی صاحب زادی عزیزہ آپا ان کی اہلیہ تھیں۔ حکیم صاحب بڑے ہی محنتی، مستعد اور چاق و چوبند قسم کے آدمی تھے، سستی کاہلی تو ان کو چھو کر نہیں گزری، تھکن کیا ہوتی ہے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا، اگر کبھی تھکن ہوئی بھی تو بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ صبح آٹھ بجے سے ظہر تک مطب میں جمے بیٹھے رہتے، اشد کوئی ضرورت ہو تو اٹھتے ہوں گے، ورنہ اپنی کرسی سے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم جب بھی مطب کے سامنے سے گزرتے انھیں بیٹھا ہوا ہی پایا۔ لوگوں نے ان کی ذات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ انھیں اس کا احساس بھی تھا، مگر اس کے باوجود کبھی بھی ان کی طرف سے آنکھ میلی نہیں ہونے دی اور حسبِ سابق محبت و مؤدّت کا رویہ برقرار رکھا۔ اصل میں یہ وہ لوگ تھے جو زندگی کو بامقصد جانتے تھے اور اس کو اس طرح برتتے تھے کہ مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ لہٰذا خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے روزمرہ کے معمولات بندھے ٹکے تھے، کچھ بھی ہو، کیسے ہی حالات ہوں اپنے معمولات انھیں پورے کرنے ہیں۔ ایسے مستقل مزاج اور ہوش مندوں کے آگے تو وقت خود بے دست و پا ہو جاتا ہے اور وہ وقت کو اپنے اشاروں پر رکھتے ہیں:

صورتیں آنکھوں میں پھرتی ہیں، وہ نقشے یاد ہیں
کیسی کیسی صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں



☆☆☆

حکیم عبداللہ خاں جوشؔ

(المتوفی: ۱۹۸۵ء)

خواب وخیال ہو گئے وہ لوگ جو اپنی وضع قطع، اپنے اخلاق، خلوص اور مشفقانہ رویّوں سے پہچانے جاتے تھے۔ کہنے کو تو آج ہم نے ترقّی کے بڑے مدارج طے کر لیے ہیں، ہمارے معاشی واقتصادی حالات بہت بہتر ہیں۔ ایسے ذرائع بھی ہمارے پاس ہیں جن کے سبب ہم مختلف ممالک اور قوموں کے حالات سے واقف ہیں۔ اخلاقی ومعاشرتی ضوابط جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں ان سے بھی ہم کماحقہٗ آشنا ہیں، لیکن ان کی عملی صورتیں اب معدوم ہیں۔ انسانیت کا ہم بڑے زور وشور سے پرچار کرتے ہیں، لیکن انسانیت ہم میں برائے نام بھی نہیں، وہ سانچے ہی ختم ہو گئے جس میں انسان ڈھلا کرتے تھے۔ اب اگر بھولا بسرا کوئی انسان نظر آجائے تو اس کو اہمیت دینا تو کجا اس کی صورت دیکھ کر ہی بیزاری کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ یونان کے دیوجانس کلبی نے اس زمانے میں انسان کی آرزو کی تھی جب تہذیب وتمدّن اور معاشرت اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی، جس کو مولانا روم نے اس طرح نظم کیا:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہم رہانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتند، یافت می نشود، جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود، آنم آرزوست

اور ان اشعار کو علامہ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں فاتحۃ الکتاب کے طور پر لیا ہے۔ دیکھا جائے تو آج بھی یہی کیفیت ہے، لیکن پھر بھی جستہ جستہ ایسے لوگ مل جائیں گے جو انسانیت کا پیکر ہوں، صرف دیکھنے والی نگاہ چاہیے۔ حدیث شریف کا یہ ٹکڑا بڑا معنی خیز ہے: لَا تَمنَعُوا العَینِ قُوَّتَھَا فَتَمنَعُکُم مِنْ ضَوْئُھَا (آنکھ سے اس کی خوراک نہ روکو، ورنہ وہ تم سے روشنی روک دے گی) میری خوش قسمتی کہ مجھے بغیر جستجو و تلاش کے ایسے لوگ مل گئے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیہِ مَن یَشَاء وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیمٌ (یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا کرے۔)

ایسے ہی لوگوں میں حکیم عبداللہ خاں جوشؔ تھے۔ ہمارے ہی محلّے لطیف آباد حیدرآباد نمبر۱۰ میں رہتے تھے۔ ریاست جھالاواڑ کے رہنے والے تھے، حکیم بھی تھے اور شاعر بھی۔ بھرا بھرا بدن، گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، مہیب ہاتھ پیر، راجپوتانہ پگڑی سر پر، ڈاڑھی بھری ہوئی خشخشی گویا وہ بھی راجپوتوں کی طرح، مگر مونچھیں صاف، قمیص اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس، نری کا جوتا پہنے، دھیمی چال جس میں بلا کا اعتماد ہوتا محلّے میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ بس ان سے ہم اسی حد تک واقف تھے کہ یہ محلّے کے بزرگ ہیں۔ ہمیں جب شاعری کا شوق ہوا اور کچھ ٹوٹے پھوٹے اشعار کہے تو والد صاحب کو دکھائے۔ والد صاحب نے فرمایا، ہم تو شاعر ہیں نہیں، تم حکیم صاحب کو دکھلاؤ وہ شاعر بھی ہیں، چناں چہ ان کی طرف رجوع کیا۔ نہایت شفقت و محبت سے پیش آئے اور خاموشی سے اشعار پر اصلاح دے دی۔ نہیں معلوم کہ ہمارے متعلّق ان کی کیا رائے قائم ہوئی۔ بہر حال ان سے اب باقاعدہ اصلاح لینے لگے اور اُس تقریب سے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ہوا۔ وہ بڑے ہی زندہ دل آدمی تھے، بے تکلّفی سے ہر موضوع پر ہم سے گفتگو کرتے، مگر چھوٹے بڑوں کے درمیان جو فاصلے اور حدود و قیود روا ہوتے ہیں ان کو ضرور برقرار رکھتے، وہ ناپسندیدہ اور غلط بات دیکھتے تو برملا ٹوک دیتے، اس میں کسی قسم کی مصلحت کو پیشِ نظر نہیں رکھتے تھے، اس طرح انھیں بزرگانہ حق کا استعمال بھی خوب آتا تھا۔ حکیم صاحب کی طبیعت میں ظرافت تھی، مگر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔

حکیم صاحب کے والد ریاست میں میر شکار تھے۔ وہاں کے راجا بھوانی سنگھ کے مزاج میں انھوں نے بڑا رسواخ حاصل کر لیا تھا۔ راجا پوری ریاست میں سب سے زیادہ انھیں پر اعتماد کرتا تھا اور 'بڑے بھیا' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا، یہ واحد آدمی تھے جو بغیر اذن محل میں داخل ہو سکتے تھے۔ حکیم صاحب اپنے والد کے زیر تربیت نہیں رہے۔ ورنہ وہ بھی شکاری یا دیگر خاندانی افراد کی طرح فوجی ہوتے، پڑھنے لکھنے سے کچھ واستہ ہی نہیں ہوتا۔ خوش قسمتی کہیے کہ خالہ نے انھیں گود لے لیا، اور پڑھنے لکھنے پر لگا دیا۔ طب کی تعلیم انھوں نے اپنے شوق سے حاصل کی۔ ان کے استاد مہاراجا کے طبیب تھے۔ یاقوتی پر ایک کتاب لکھی تھی جو غالباً نول کشور لکھنؤ سے چھپی تھی، میں نے خود دیکھی ہے۔ یاقوتی کے سیکڑوں نسخے اس میں مرقوم تھے، اب پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ وہ بڑے مخلص، ہمدرد اور کھرے انسان تھے۔ یہی صفات ہمارے حکیم صاحب میں بھی آ گئیں۔ وہ خلوص کا پیکر تھے، ہمدردی کے جذبے سے سرشار رہتے تھے، ایثار ایسا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے صابر و شاکر قسم کے انسان تھے۔ غیرت و حمیت ان میں کوٹ کوٹ کی بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑے ماہر طبیب تھے۔ طب کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ فرماتے تھے، ہمارے استاد کو مفردات پر بڑا عبور تھا۔ ایک ہی نسخہ کئی کئی طرح لکھوا دیتے، اس میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ ایک مرتبہ بمبئی کا کوئی سیٹھ آیا، اس کی بیوی بیمار تھی۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھا، وہ نسخہ اُس سستے دور میں پچیس تیس روپے کا بنتا تھا۔ جوشؔ صاحب نے عرض کیا، استاد محلّے کی فلاں عورت کو بھی یہی مرض ہے۔ فرمانے لگے، ہاں ہاں، تم یہی نسخہ اُس کو بھی دے دو۔ میں نے عرض کیا، اتنا مہنگا وہ بے چاری کہاں سے خرید سکے گی۔ پھر فوراً ہی انھوں نے دوسرا نسخہ لکھوا دیا وہ بمشکل دو پیسے یا ایک آنے کا ہوگا، مگر تاثیر میں دونوں ہی برابر تھے۔

ہمارے حکیم صاحب بھی مفردات کا گہرا علم رکھتے تھے، خواصِ ادویہ پر انھیں کمال حاصل تھا۔ یہ تو بارہا ہمارے مشاہدے میں آیا ہے ہمیں کوئی تکلیف ہوتی، گھر کے سامنے ہی کیبن کے ساتھ ایک بینچ ہوتی تھی حکیم صاحب روزانہ شام کو وہاں آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے، ہم ان کے پاس [illegible] تے، کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ،

میرے پاس کیا ہے نہ مطب نہ دوائیں مدّت ہوئی حکمت چھوڑے ہوئے۔ ہم کہتے تو پھر آپ کا کیا فائدہ۔ پھر فرماتے، ارے یار! بڑا تنگ کرتے ہو تم لوگ۔ اچھا فلاں چیز گھر میں ہے اس کو اونٹا کر پی لینا، یا پیس کے فلاں چیز ملا کر کھا لینا۔ وہ نسخہ اتنا زود اثر ہوتا کہ مرض ایک دو خوراک میں ہی رخصت ہو جاتا۔ میری بچّی کو اسہال کی شکایت ہوئی۔ والد صاحب نے حکیم صاحب سے کہا، حکیم صاحب نے فرمایا، جائے پھل گھس کر چٹا دیجیے، لیجیے آناً فاناً مرض غائب۔ ۱۹۷۷ء کی بات ہے میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں تھا میرے گردے میں درد ہوا۔ درد روز بروز بڑھتا گیا، کسی کل چین نہیں آتا تھا۔ چانڈکا میڈیکل کالج میں علاج کرایا، وہاں کے پرنسپل اور دوسرے ڈاکٹروں سے تعلق تھا۔ شاگرد بھی وہاں تھے بہت توجہ سے تشخص کے مراحل سے گزرا، آئی وی پی ٹیسٹ بھی کرایا۔ تمام ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ آپ کو انفیکشن ہے۔ پتھری نہیں ہے۔ اسی دوران حیدرآباد آنا ہوا۔ میں نے حکیم صاحب سے عرض کیا کہ آپ تو اطمینان سے سوئیں ہم وہاں رات رات بھر درد میں تڑپتے رہیں۔ گردے میں شدید درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے، آپ کو انفیکشن ہے۔ فرمانے لگے، کہ درد کے دوران متلی ہوتی ہے۔ میں نے کہا، جی ہاں ہوتی ہے۔ پھر فرمانے لگے، آپ کو پتھری ہے۔ میں نے کہا، حکیم صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، ایکسرے لے لیے، آئی وی پی کرا لیا، پتھری کا تو نام ونشان ہی نہیں ہے۔ کہنے لگے، ڈاکٹروں کا اپنا علم ہے، مگر ہمارا علم یہی کہتا ہے کہ تمھیں پتھری ہے۔ اچھا یہ بتاؤ واپس کب جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا دو تین دن بعد۔ کیسے اچھے لوگ تھے بازار سے دوائیں لائے کوٹا پیسا معجون حجر الیہود بنا کر دی۔ میں نے اٹھارہ بیس دن کھائی ہوگی کہ ایک روز بڑی تکلیف ہوئی اور کھجور کی گٹھلی کے برابر پتھری نکلی۔ اس روز کے بعد آج تک الحمدللہ درد نہیں ہوا۔ ایک نصیحت انھوں یہ کی تھی کہ گرمیوں میں خربوزہ اور سردیوں میں مولی کا خاص طور پر اہتمام رکھنا۔ اِدرار ہوتا رہے گا، پتھری نہیں ہوگی۔

اسی طرح ایک روز میں علی الصبح نہار مُنہ حکیم صاحب کے گھر پہنچ گیا اپنی نبض دکھانے۔ یہی سنا تھا یہی پڑھا تھا کہ نبض نہار مُنہ دیکھی جاتی ہے، میں نے عرض کیا، حکیم صاحب! میری نبض دیکھ لیں۔ انھوں نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا، کہنے لگے، تمھاری

نبض دیکھوں؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ فرمایا، بھائی نبض تو اس کی دیکھی جاتی ہے جس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو، تم چھوٹے سے ہمارے سامنے بڑے ہوئے ہو، تمھارے مشاغل، تمھارا کھانا پینا سب ہمارے سامنے ہے، تم تو یہ بتاؤ کہ ہمیں یہ تکلیف ہے، اُس کا علاج ہو جائے گا۔ یہ نبض کا علم بڑا مشکل ہے کسب سے زیادہ خداداد ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ وہاں ریاست میں جب کبھی راجا نبض دکھانے کی خواہش کرتے تو ہم پندرہ دن کا وقت لیتے اس دوران مختلف قسم کے حلوے اور پلٹسیں پکا پکا کر اپنی انگلیوں پر باندھتے کہ انگلیاں حساس ہو جائیں تب کہیں جا کر راجا کی نبض دیکھتے تھے۔ نباض تو حکیم نابینا گزرے ہیں۔ بیسوں آدمیوں کی لائن ہوتی ہر ایک کی نبض دیکھ جاتے اور اسی ترتیب سے نسخہ لکھوا دیتے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی۔ ریاست حیدرآباد دکن میں میر محبوب علی خاں نظام دکن کے عہد حکومت میں شاہی طبیب تھے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ''لقمان الملک'' کا خطاب دیا تھا۔ حافظہ بڑا قوی تھا، بڑے نباض تھے۔ خود خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ مہاراج سرکشن پرشاد کے بچّوں کی نبض دیکھنے کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ میں حیران رہ گیا کہ وہاں بیگمات اور بچّوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا۔ خود ہی ہر بیمار کی تفصیلی کیفیت نبض پر ہاتھ رکھ کر بتادی اور بیمار نے تصدیق کی کہ بے شک یہی حال ہے۔ ان کی دوائیں مقدار میں قلیل ہوتی تھیں، مگر بہت زیادہ مؤثر۔ حکیم صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ حضرت نے ایک موقع پر فرمایا کہ تم کسی کو مٹی بھی اٹھا کر دے دو گے تو شفا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

ہمارے حکیم صاحب قیام پاکستان کے بعد کراچی کے ایک مطب میں بطور طبیب بیٹھے۔ اس زمانے میں اطباء دواخانوں میں بیٹھتے تھے، صرف نسخہ لکھا کرتے تھے۔ دواخانے سے کمیشن طے ہوتا تھا، وہی ان کو ملتا تھا، البتہ اگر کہیں مریض کو دیکھنے جاتے تو فیس لیتے تھے۔ آج کے ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ مریض ان کے پاس گیا اور ان کی فیس کھری، حکیم صاحب فرماتے تھے، ایک روز ایک بوڑھی عورت آئی میں نے اسے نسخہ لکھ کر دیا۔ وہ جب دوا

خانے میں لینے گئی تو مالک فوراً ہی میرے پاس آیا کہنے لگا حکیم صاحب ہم نے آپ کو اس لیے رکھا ہے کہ آپ نسخے میں ہمارے بنے ہوئے مرکبات لکھیں۔ حکیم صاحب نے کہا، بھائی! ہمارے دوا خانے میں کوئی مرکّب دوا ایسی نہیں جس سے اس کو فائدہ ہوتا، اس لیے میں نے مفردات پر مشتمل نسخہ لکھ دیا۔ وہ کہنے لگا، آپ کو تو صرف ہمارے ہاں کی ادویہ ہی نسخے میں لکھنا چاہیے۔ یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب نے استعفاد ے دیا اور پھر مرتے دم تک کبھی کسی مطب میں نہیں بیٹھے۔ فرماتے تھے، لوگ اپنے ذرا سے نفع کی خاطر کسی کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے، ہم ان کا حصّہ کیوں بنیں۔ خود ان کے پاس سرمایہ نہیں تھا کہ مطب کھول کر بیٹھ رہتے۔ صبر وشکر سے زندگی گزار دی یہ غیرت، یہ حمیّت اور یہ توکّل اب کہاں۔

حکیم صاحب نے ریاست کے حالات کا بہت گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ریاست سے متعلق بڑے مزے مزے کے قصّے سنایا کرتے تھے۔ ان کو سن کر شخصی حکومتوں کے خدوخال سب ابھر کر سامنے آجاتے تھے اور آج کی نام نہاد جمہوری حکومتوں سے موازنہ آسان ہو جاتا۔ ایک واقعہ انھوں نے یہ سنایا کہ ایک مرتبہ ریاست میں غلّے کا قحط ہو گیا۔ بڑے بڑے سیٹھوں نے گندم ذخیرہ کر لیا، رعایا بڑی پریشان، راجا نے اپنی کابینہ سے مشورہ کیا۔ کسی نے گندم درآمد کرنے کا مشورہ دیا تو کسی نے ذخیرہ اندوزوں کو جیل میں ٹھونسنے کا، غرض جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔ راجا نے خاموشی سے اپنے آدمی دوڑا دیے کہ معلوم کریں کہاں کہاں گندم ذخیرہ کیا گیا ہے۔ کابینہ کا اجلاس جاری ہی تھا کہ جاسوسوں نے آکر خبر دے دی۔ راجا اپنی پوری کابینہ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ عوام ساتھ ہو لیے جہاں جہاں غلّہ ذخیرہ کیا گیا تھا وہاں وہاں پہنچ کر اپنے سامنے سارا غلّہ لٹوا دیا۔ بھلا ایسی صورت میں کس کی مجال ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی چیز ذخیرہ کرے اور مصنوعی مہنگائی پیدا کرے۔

راجا بھوانی سنگھ کی عادت تھی کہ روز شام کو چہل قدمی کرتے ہوئے شہر سے ذرا باہر کی طرف نکل جایا کرتے تھے۔ ایک روز راجا کہنے لگے، آج کل جنگل میں جلیبیاں بہت لگی ہوئی ہیں ان سے لطف لیا جائے، مصاحبین ساتھ، شام کی سیر کو روانہ ہوئے۔ دو خادم پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے حلوائی سے جلیبیاں بنوائیں اور شہر سے ذرا باہر نیچی نیچی شاخوں کو

صاف کر کے لگا دیں۔ راجا آئے اور سب جلیبیوں سے شغل کرنے لگے۔ اسی دوران دیکھا کہ ایک دیہاتی راجپوت اپنی عورت کو مارتا ہوا لا رہا ہے۔ راجا نے اس کو بلوایا، پوچھا، کیوں مارتا ہے۔ وہ بولا، حضور! یہ میری جورو ہے، میکے جا کر بیٹھ رہی تھی، آتی ہی نہیں تھی اس لیے میں اسے اس طرح لا رہا ہوں۔ راجا نے عورت سے کہا، یہ بھلا مانس ہے، تُو اس کے ساتھ کیوں نہیں جاتی۔ عورت نے کہا، نہیں مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا۔ راجا نے دیہاتی سے کہا، تُو اپنی عورت سے معافی مانگ لے۔ ایک ہندو راج پوت بہت سے لوگوں کے سامنے عورت سے معافی مانگے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ دیہاتی کی کیفیت دیکھ کر مصاحبین نے کہا، اپنی انا چھوڑ جو حکم دیا جائے وہی کر، ورنہ خیر نہیں۔ دیہاتی بے چارہ کیا کرتا، اس نے عورت سے کہا، نیک بخت! مجھے معاف کر دے، مان جا۔ عورت کم عقل ٹھہری۔ اس نے راجا کو حمایت کرتے دیکھا تو شوہر کو جھڑک دیا۔ راجا نے شاید اتمامِ حجت کے لیے دیہاتی سے کہا، اپنی پگڑی اس کے پاؤں میں رکھ دے۔ دیہاتی نے خوف زدہ ہو کر راجا کی طرف دیکھا اور بچشمِ پُر آب پگڑی اتار کر عورت کے پاؤں میں رکھ دی۔ اس ناسمجھ نے پگڑی کے ٹھوکر مار دی۔ راجا کی آنکھیں غیظ و غضب سے ابل پڑیں۔ فوراً آواز دی، بڑے بھیا، چاقو! بڑے بھیا نے بڑا سا شکاری چاقو کھول کر راجا کے ہاتھ میں دے دیا۔ راجا نے وہ چاقو اس راجپوت کی طرف بڑھا کر کہا، لے اس عورت کی ناک چوٹی کاٹ لے۔ غصّے اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں دیہاتی نے اپنی عورت کی ناک اور چوٹی دونوں کاٹ لیں۔ اس واقعے کا پوری ریاست پر بہت اثر ہوا۔ اگر ریاست میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی تنازعہ ہوتا تو ایک، دوسرے کو یہی دھمکی دیتا کہ راجا کے پاس جاؤں اور وہ سیدھے ہو جاتے۔

حکیم صاحب حیدرآباد کے بزرگ شعراء میں سے تھے۔ وہ محسنؔ کاکوروی کے بھتیجے اور داماد مولوی عبدالوحید نیرنگؔ کے شاگرد تھے۔ حضرت نیرنگ ریاست جھالاواڑ کے مہاراجا بھوانی سنگھ کے استاد تھے۔ ملک الشعراء کا خطاب تھا۔ سواری حاضری رہتی تھی۔ ریاست میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کا دیوان مطبعِ منشی نول کشور لکھنؤ سے طبع ہو چکا ہے۔ حکیم صاحب ان کا بڑی محبت و عقیدت سے تذکرہ کرتے تھے۔ وہ لکھنوی تہذیب و معاشرت میں

ڈھلے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنوی تکلف و تصنع کا ذکر آ گیا تو حکیم صاحب نے فرمایا، نیرنگ صاحب لکھنوی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ میں اکثر مطب سے فارغ ہو کر اصلاح لینے جاتا تھا۔ ان کے ہاں پانی کی ایک ٹھلیا اور اس پر ایک کٹوری پانی پینے کے لیے رکھی رہتی تھی۔ گرمی کی شدت، پیاس سے بے حال، میں کٹوری سے پانی پینے لگا۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ مشکل سے ایک گھونٹ پانی آتا تھا۔ میں نے صرف تین چار کٹوری ہی پانی پیا تھا کہ مجھے احساس ہو گیا کہ نیرنگ صاحب دیکھ رہے ہیں اور کٹوری رکھ دی۔ نیرنگ صاحب فرمانے لگے، تم ٹھہرے ریاستی، تمھارا اس کٹوری سے کیا بھلا ہوگا ٹھلیا ہی منہ سے لگا لو۔

اسی طرح ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت نیرنگ کی سواری آ رہی تھی اور عین مطب کے آگے آ کر ٹھہر گئی۔ نیرنگ صاحب اتر کر ہمارے استاد کے پاس آئے۔ فرمانے لگے، حکیم صاحب! اب ضعف بڑھ گیا ہے، حافظہ ساتھ نہیں دیتا، کوئی دوا تجویز فرمائیے۔ ہمارے استاد نے کہا، آپ روزانہ پانچ بادام بھگو دیں اور علی الصبح کھرل کر کے ایک چھٹانک گھی میں بریاں کر کے کھایا کریں۔ نیرنگ صاحب نے متعجبانہ لہجے میں بہت زیادہ کھینچ کر کہا، پانچ بادام اور میں کھاؤں، ہضم کون کرے گا۔ میں یا آپ۔ ارے حضرت! میں تو روٹی کی پپڑی مونگ کی دال کے پانی میں بھگو کر کھاتا ہوں۔ پانچ بادام! یہ کہتے ہوئے چلے گئے اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

حضرت نیرنگ اگرچہ تہذیب و معاشرت میں لکھنؤ کے نمائندہ تھے، مگر ان کی شاعری لکھنؤ کے تصنع و تکلف اور ضلع جگت سے پاک تھی۔ سیدھی شاعری اور سیدھے سچے مضامین تھے۔ یہی کچھ اثرات حکیم صاحب کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔ وہ سادہ و سلیس زبان میں روزمرہ و محاورے کے مطابق عام فہم مضامین نظم کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے ہاں محاوروں کی کثرت ہے نہ دور از کار تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہے کہ جس سے کلام بوجھل ہو جائے، البتہ رعایت لفظی ضرور پائی جاتی ہے اور عشق کے بیان میں کبھی کبھی خارجی مضامین سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمانے کی تلخیاں بھی ان کے کلام میں ہیں۔ اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ اصلاح بھی اس طرح دیتے تھے کہ شاگرد کو سوچنے اور فکر

کرنے کی ترغیب ہو۔ آج کل کی طرح نہیں کہ استاد مصرعے کے مصرعے کاٹ کر بدل دیتے ہیں بلکہ وہ پہلے لفظوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ پھر لفظ رکھتے تھے۔ اگر اشعار قابل اصلاح نہیں ہوتے تو لوٹا دیتے، مگر اپنی طرف سے شعر یا غزل نہیں دیتے تھے اور طرحی مصرعے بھی ایسے دیتے تھے جس میں کاوش کرنی پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ ہم نے یومِ حسرت منایا، اس موقع پر یہ مصرعِ طرح دیا:

ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم

اور ہم نوجوانوں پر یہ قید لگادی کہ اس میں خدا کا قافیہ باندھنا۔ اس ردیف کے ساتھ خدا کا قافیہ تو بہت مشکل تھا۔ بہت کوشش کی، مگر شعر ہوتا ہی نہیں تھا۔ مشاعرے کا وقت ہوگیا۔ ہم جانے کے لیے تیار ہو ہی رہے تھے کہ خود بخود ڈھلا ڈھلایا شعر آ گیا۔ شعر یاد ہے، سن لیجیے۔

شرابِ محبت کا عالم نہ پوچھو
کہ اب محوِ ذکرِ خدا ہوگئے ہم

ہمارے محلّے میں ایک اور استاد تھے حضرت نظام فتح پوری، بڑے پختہ کار شاعر تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر مغیث الدّین فریدی بھی ان کے شاگرد تھے۔ میں نے بھی ان سے اصلاح لی ہے اور علم عروض میں بھی ان سے مشورہ کرتا تھا۔ وہ بھی بڑے ٹیڑھے ٹیڑھے مصرعے طرح کے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے یہ مصرع دیا:

طاقتِ پرواز ہے شہ پر میں، شہ پر ہاتھ میں

پتھر میں پتھر ہاتھ میں، خنجر میں خنجر ہاتھ میں، دلبر میں دلبر ہاتھ میں، اس دُہری ردیف کے ساتھ ہم نے کوشش کی، ہم سے تو ایک بھی شعر ڈھنگ کا نہیں ہوا۔

حیدرآباد میں شعروشاعری کا بڑا سازگار ماحول تھا۔ پورے شہر میں کئی بزمیں بنی ہوئی تھیں: بزمِ خلیل، بزمِ نہال، بزمِ ادب اور بہت سی۔ ان کے تحت مشاعرے ہوتے تھے اور زیادہ تر طرحی مشاعرے ہی ہوتے تھے۔ شعراء بڑی کاوش سے شعر کہتے تھے۔ حکیم صاحب پابندی سے مصرع طرح پر غزل کہتے تھے اور ہم دو تین نوجوانوں، میں، قدرت اللہ عروج اور اسلم اشعر پر اصرار کہ غزل ضرور کہیں۔ ان کے پاس جو بیاض تھی اس پر تاریخ ضرور ڈالتے

تھے۔غزل ہی ان کی محبوب صنف سخن تھی ،نعت ومنقبت بھی کہتے تھے۔نعت کے شعر دیکھیے:

یہی ہے حاصلِ الفت یہی جینا ہے جینے میں
کہ میں ہوں سندھ میں بے کل، مرا دل ہے مدینے میں
تلاطم بحر ہستی کے ہمارا کیا بگاڑیں گے
اماں پاتے ہیں خود طوفاں محمد کے سفینے میں
بجز اللہ کے کوئی نہیں جوہری اس کا
منقش نامِ احمد ہے مرے دل کے نگینے میں
وہ آنکھیں پھوٹ جائیں جو نہ دیکھیں آستاں ان کا
وہ پاؤں ٹوٹ جائیں جو نہ لے جائیں مدینے میں
محبّ محبوب سے اپنے جدا ہو، ہو نہیں سکتا
تمھیں یہ راز کیا معلوم، مکہ ہے مدینے میں
یہی جوشِ جنوں اے جوشؔ اک دن کام آئے گا
برہنہ سر، برہنہ پا میں پہنچوں گا مدینے میں

غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

بہاریں فیض پاتی ہیں خزاں سے
چمن اُگتے ہیں آشیاں سے
مرے سوزِ دروں سے برق لرزاں
پڑی رہتی ہے کوسوں آشیاں سے
نشیمن میں ہے پوشیدہ اسیری
قفس بنتے ہیں شاخِ آشیاں سے
کہیں آنکھیں بھی کر لیتی ہیں باتیں
کہاں ہر بات ہوتی ہے زباں سے
وہی کشتی ہوئی ہے نذرِ ساحل
نکل آئی جو بحرِ بے کراں سے

شب غم آنکھ سے آنسو نہ نکلے
ستارے دیکھتے ہیں آسماں سے
بڑا جاں باز پروانہ ہے، لیکن
مرا سوز جگر لائے کہاں سے
فقط اک جوش کے دم سے ہے رونق
عقیدت کس کو ہے پیرِ مغاں سے

☆☆☆

فراق آتش، خیال آتش، کسی کا انتظار آتش
محبت ایک چنگاری ہے، لیکن بے شمار آتش
کسی کی مانگ میں سیندور کی سرخی ہزار آتش
بشکلِ برق آتی ہے گھٹاؤں پر سوار آتش
لگائے فطرتِ نمرود دنیا میں ہزار آتش
مقابل ہو براہیمی تو بنتی ہے بہار آتش
مزیّن افسرِ فرعونیت ہیروں کی تابش سے
جہاں طاغوت غالب ہے، وہاں ہے تاج دار آتش
یہاں دیکھا ہے ہم نے اختلاط آب و آتش بھی
رواں تھے شمع کے آنسو، ہوئی جب شعلہ بار آتش

حکیم صاحب کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر ہے:

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اسی زمین میں یہ غزل ہے:

رنگ محفل دریں ایام دگر می بینم
بے سبب بغض و حسد، فتنہ و شری بینم

وائے افسوس، گلستانِ سخن شد ویراں
خار و خس را بمقامِ گلِ تر می بینم
تاخت کردند شغالاں بشرارت صحرا
حیف، در خوابِ سحر شیرِ ببر می بینم
قابضِ شمعِ شبستاں متشاعر گشتند
تائبِ شعر و سخن اہلِ ہنر می بینم
شاعرِ قوم کہ از فنِ ادب شد مایوس
مبتلائے مرضِ دردِ جگر می بینم

حکیم صاحب کے بڑے صاحب زادے ذوالقرنین شوقؔ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ وہ بھی شاعر تھے، خوب شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی وہی خصوصیات نظر آتی ہیں جو حکیم صاحب کے کلام میں ہیں، دو تین شعر دیکھیے:

جانے کیا رہ گیا پیشانی پہ چسپاں ہو کر
تک رہا ہے یہ زمانہ مجھے حیراں ہو کر
آشیاں سے جو شراروں کو نکلتے دیکھا
برق کچھ بجھ سی گئی آج پشیماں ہو کر
اب نہیں شوقؔ کو تاریکیٔ قسمت کا گلہ
روشنی دینے لگے داغ فروزاں ہو کر

☆☆☆

دیوانے وہ جن کی ہے آگہی روش
میں ہوش مند ہوں کہ ہے دیوانگی روش
دونوں ہیں اپنی راہ پہ یوں گام زن ہنوز
تیری روش غرور، مری عاجزی روش

حکیم صاحب بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ طبیب بھی اچھے، شاعر بھی اچھے،

…اہرِ فن، استادِ کامل، تمام محاسن اخلاق ان کی ذات میں جمع تھے۔ ان کی یہ مذکورہ چند باتیں ہی …ورہ گئیں اگر ذہن کو کریدوں تو یادوں کی دبی چنگاریاں شعلۂ جوّالہ بن کر ابھر آئیں۔ بس …تنا ہی کہہ سکتا ہوں:

داستان بن سکے تو لے لیجیے
یاد ہیں چند واقعات مجھے

☆☆☆

جانے والوں کی یاد آتی ہے
جانے والے کبھی نہیں آتے

نظام الدّین نظاؔم فتح پوری

(المتوفی: ۱۹۷۶ء)

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامؔی

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ابراہیم ذوقؔ نے کہا تھا:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

اولاد سے تو یہی دو پشت، چار پشت

شاعری بلاشبہ وہبی فن ہے، کسب و محنت سے یہ فن نہیں آتا۔ خداداد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں اس فن سے نوازیں۔ افاعیل، تفاعیل میں مقید رہ کر شاعری کرنا خونِ جگر کی متقاضی ہوتی ہے۔ آپ جب کوئی شعر پڑھتے ہیں اور دل و دماغ پر اس کے اثرات محسوس کرتے ہیں تو یہ بلاشبہ شاعر کی جگر کاویوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آج کل آزاد شاعری کا رواج ہو چلا ہے۔ محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ہو یا اردو کے انشائیہ ادب پاروں کے کچھ حصے منتخب کر کے چند ٹکڑوں میں لکھ دیجیے آزاد نظم ہوگی۔ نظم اور وہ بھی آزاد... سبحان اللہ! جس کو دیکھو، شاعر بنا پھرتا ہے۔ ہمارے تو حلق سے یہ بات کسی طور نہیں اترتی یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم پرانے دقیانوسی لوگوں کے صحبت یافتہ ہیں ان کا اثر بہت گہرا ہے اس لیے اس قسم کی نئی چیزوں سے چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں ایسے ہی پرانے ایک بزرگ شاعر کا جنھوں نے داغ، سیماب، جلیل مانک پوری اور اس دور کے دیگر نامور شعراء کو دیکھا ہے، ان کی صحبتیں اٹھائی ہیں۔ یہ ہیں حضرت غلام نظام الدّین چشتی فتح پوری۔

حضرت نظام فتح پوری طویل القامت تھے؛ چوڑا چکلا سینہ، مہیب ہاتھ پیر، معلوم ہوتا

تھا کہ جوانی میں پہلوانی کرتے رہے ہیں، شرعی ڈاڑھی، کرتے یا قمیص کے ساتھ پتلون پہنتے تھے، ہمارے محلّے لطیف آباد نمبر دس میں آ کر رہے تھے۔ اس وقت وہ پچھتر یا اسّی کے پیٹے میں ضرور رہے ہوں گے۔ ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا، لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ دور سے محسوس ہونے لگے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، یہاں پاکستان آ کر انور عادل سے ملے اور نوٹری پبلک کا لائسنس لے لیا۔ یہی ان کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ شاعر تھے اور قادرالکلام شاعر تھے ابتدا میں داغ دہلوی کے معاصر مرزا خادم حسین رئیس اکبر آبادی کے شاگرد ہوئے بعد میں آگرے کے ایک اور شاعر میر استاد علی شور متھراوی سے اصلاح لینے لگے اور بہت جلد استادی کے درجے پر فائز ہو گئے۔ ان کے شاگردوں میں مغیث الدّین فریدی پروفیسر دہلی یونیورسٹی، عزیز متھراوی، عبدالرزاق بیدل، معین فریدی، بے چین اعتماد پوری اور رونق فتح پوری وغیرہ خاصے کے شاعر ہوئے ہیں۔

نظام صاحب کو شعر و سخن کے ساتھ علم و عروض پر بھی بڑا درک تھا، ہمارا طالبِ علمی کا زمانہ تھا، علم عروض ہی ملاقات کی تقریب بنا۔ میں نے والد صاحب سے اس فن میں محیط الدائرہ پڑھی تھی، لیکن اردو شاعری میں رائج بحور و زحافات کا چنداں ادراک نہیں ہوا تھا۔ چناں چہ نظام صاحب سے علم و عروض سیکھنے لگا اور گاہے گاہے اشعار پر بھی اصلاح لینے لگا۔ اصلاح میں نظام صاحب شعر کاٹ کر دوسرا شعر لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں تھی۔ میں جب بھی اصلاح لیتا کہہ دیتا کہ آپ شعر نہ بدلیں بلکہ جہاں ضروری سمجھیں وہیں تبدیلی کریں۔ آپ اپنا شعر لکھ دیں گے تو ہم سہل پسند ہو جائیں گے، کوشش و کاوش کیوں کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں تو زندگی بھر یہ شعور ہی نہیں آئے گا کہ شعر کی خامیوں کو سمجھ سکیں اور لفظوں کے ذرا سے فرق سے شعر کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس رویّے نے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ بے معنی، بے وزن شعر کہہ کر لاتے استاد کے آگے رکھ دیتے وہ ایک ایک شعر کاٹ کر دوسرا شعر لکھ دیتے لیجے غزل تیار۔ مشاعرے میں پڑھی خوب داد وصولی اب وہ مستند شاعر ہو گئے۔ کبھی کبھی تو بعض یہ کرتے کہ عین مشاعرے کے دن آتے اور کہتے استاد مصروفیت کی وجہ سے غزل نہیں کہہ سکا، کچھ کہہ دیں اور استاد فی الفور

غزل کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ انھیں اس پر ٹوکتا تھا، مگر انھوں نے اپنی اس روش کو نہیں چھوڑا۔ کچھ لوگوں نے یہ تک کیا استاد کی تازہ بہ تازہ غزل چرالی اور مشاعرے میں پڑھ دی۔ استاد حیران، وہیں مشاعرے میں بیٹھے بیٹھے غزل کہتے پھر پڑھتے۔ ایک کم بخت نے تو یہ کیا کہ استاد کا شعر چرالیا اور مشاعرے میں پڑھا۔ جب ہم نے ٹوکا کہ یہ شعر تو نظام صاحب کا ہے تو اس نے کہا، میں اصلاح لینے گیا تھا، اچھا شعر تھا اس لیے انھوں نے اسے اپنا بنالیا:

بفروغِ چہرہ زلفت ہمہ شب زند رہِ دل
چہ دلاورست دُزدے کہ بکف چراغ دارد

شعر آپ بھی سن لیجیے، مضمون اگرچہ پرانا ہے، مگر سہلِ ممتنع ہی اس کی خوبی ہے:

اظہارِ غم زبان ہلانے کی بات تھی
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

کوئی نومشق یہ شعر نہیں کہہ سکتا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ پیدائش سے پہلے ہی چھپ چکا تھا۔ پوری غزل یہ ہے:

اک وہ مقام بھی مرے رستے میں آپڑا
دنیا کے راستوں کو جہاں بھولنا پڑا
جب تیری آرزو سے مجھے سابقا پڑا
آغوش میں بٹھا کے تجھے ڈھونڈنا پڑا
جانے مری نگاہ کہاں تک پہنچ گئی
آئینہ بار بار اُسے دیکھنا پڑا
اِتنا تو کہہ ہی دیجیے نخوت شعار سے
رہنے لگا ہے اب دلِ خوش خوگرا پڑا
اٹھنے لگی ہے پھر نگہِ التفاتِ دوست
لے میری آرزو! تجھے پھر جاگنا پڑا

اظہارِ غم زبان ہلانے کی بات تھی
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا
مجھ سے کسی کو ضد نہ پڑی عمر بھر نظامؔ
پیچھے پڑا تو ایک غمِ جاں گزا پڑا

نظام صاحب، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے، بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ زندہ دل ایسے کہ نوجوانوں کے ساتھ نوجوان، بوڑھوں کے درمیان بیٹھ کر بھی اپنے آپ کو جوان العمر ظاہر کرتے۔ وہی شوخی جو جوانوں کا خاصہ ہے ان کے ہاں بھی تھی، داد دینے کا بھی انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ اچھے شعر کو خوب سراہتے تھے۔ اگر شعر میں کوئی کمزوری پاتے تو برملا اظہار کر دیتے اور اصلاح کر کے دہرا دیتے۔ بہت سے خود ساختہ استادوں کو ان کی یہ بات بڑی ناگوار ہوتی تھی، مگر وہ ان سب سے بے نیاز تھے۔ مشاعروں کے بڑے دلدادہ تھے، کوئی مشاعرہ نہیں چھوڑتے تھے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں جاتا اپنی تازہ غزل ضرور سناتے تھے اور ناراضی کے انداز میں تنبیہ کرتے کہ تم شعر کہہ کر لایا کرو۔ ہم باقاعدہ شاعر تو تھے نہیں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، گاہے گاہے مشاعروں میں شرکت کر لیا کرتے تھے۔ بعد میں تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ برسوں ہو گئے ایک شعر بھی نہیں کہا۔

نظام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ حافظ شیرازی کے تو وہ عاشق تھے۔ ان کے بہت سے شعر انھیں یاد تھے۔ حافظ کی ایک فارسی شرح بھی ان کے پاس تھی، اب نام یاد نہیں رہا بڑی لاجواب شرح تھی، لیکن ان کی شاعری میں حافظ کی سی رنگینی و سرمستی نہیں پائی جاتی۔ سادہ شعر کہتے تھے۔ ان کے پاس کئی قلمی کتابیں بھی تھیں ایک کتاب ''تاریخ صیحہ المعروف بہ تنویرِ سلیمی'' تھی۔ اس کے مؤلف امراؤ علی صاحب تھے۔ اس میں نظام صاحب کے خاندانی حالات بھی تھے۔ اس کے مطالعے سے پتا چلا کہ شاعری ان کے خاندان میں نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔ ان کے والد ولی الدین ولیؔ بھی اچھے شاعر تھے۔ محرّم کے ایام میں مرثیہ ضرور کہتے تھے۔ نظام صاحب بھی مرثیے کا اہتمام کرتے تھے اور جب تک مجھے پورا مرثیہ نہ سنائیں چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۲۶ء سے استادی

کے درجے پر فائز ہو گئے تھے۔ میں نے اس کتاب پر ایک مضمون لکھ کر نقوش کے محمد طفیل صاحب کو بھیج دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ نقوش کے کسی شمارے میں شائع کریں گے۔ معلوم نہیں شائع ہوا کہ نہیں۔ اب تو اس کتاب کا بھی پتا نہیں کہ کہاں ہے۔ اسی طرح سیّد فرزند علی حسینی مونگیری نے غلام حسین طباطبائی کی ''سیر المتاخرین'' کی فارسی ہی میں ''ملخص التواریخ'' کے نام سے تلخیص کی تھی۔ یہ نسخہ بہت صاف شکستہ آمیز نستعلیق میں لکھا ہوا تھا۔ نظام صاحب اسے بیچنا چاہتے تھے۔ میں نے انجمن ترقیٔ اردو میں دیا، لیکن انھوں نے خریدنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ مشفق خواجہ مرحوم اپنی ذاتی لائبریری کے لیے دو سَو روپے میں خریدنا چاہتے تھے نظام صاحب ہزار سے کم بیچنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے لہٰذا میں واپس لے آیا۔ اب نہ معلوم وہ نسخہ کہاں ہے۔

میں عام طور پر نظام صاحب کے پاس دوپہر میں جایا کرتا تھا۔ وہ اشعار کے ساتھ ساتھ بڑے مزے مزے کی باتیں بیان کرتے تھے اپنے استاد رئیس اکبر آبادی اور شور متھراوی کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے تھے۔ رئیس اکبر آبادی کا تذکرہ تو غالباً ''خم خانۂ جاوید'' میں ہے۔ فرماتے تھے، ہمارے استاد پرانی وضع کے آدمی تھے۔ ایک مرتبہ پیلے رنگ کا ریشمی کرتا، پیلا انگرکھا، پیلا پاجامہ، پیلی ٹوپی اور پیلی ہی جوتی پہنے مشاعرے میں تشریف لائے۔ ان کے ایک شاگرد، جو ریختی کہتے تھے، دوپٹا اوڑھے اپنا کلام سنا رہے تھے۔ شاگرد نے جوں ہی اپنے استاد کو اس ہیئت کذائی میں دیکھا۔ فوراً ہی ناک پر انگلی کر یہ شعر پڑھا:

اوئی اللہ! مرے استاد آئے
میں تو سمجھی تھی، تعزیہ آیا

ایک واقعہ یہ بتایا کہ آگرے میں مشاعرہ تھا داغ دہلوی تشریف لائے ہوئے تھے۔ غزل پڑھی جب یہ شعر پڑھا کہ:

آئینے کا جو شوق تھا ان کو
میرے دل کو اٹھا کے دیکھ لیا

تو بڑی داد ملی، مگر رئیس صاحب خاموش رہے۔ داغ نے رئیس صاحب کو متوجہ کر کے پھر شعر

پڑھا۔ رئیس صاحب پھر بھی خاموش رہے آخر داغ کہنے لگے، آپ کو شعر پسند نہیں آیا۔ رئیس اکبر آبادی نے اپنے ایک شاگرد کو مخاطب کر کے کہا، تم یہی شعر پڑھو۔ اس نے شعر پڑھا:

آئینے کا یہ شوق تھا اُن کو
رکھتے رکھتے اٹھا کے دیکھ لیا

غرض اس قسم کے بہت سے واقعات وہ سنایا کرتے تھے۔

نظام صاحب خوب شعر کہتے تھے۔ انھوں نے ایک دیوان ترتیب دیا تھا اور یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر غزل کے شروع میں اس کی بحر مع ارکان و زحافات لکھی تھی۔ میں نے استاد محترم ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں کو وہ دکھلایا۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے ایک لڑکی زہرا رحمٰن غوری کو ایم اے کے مقالے کے طور پر مرتب کرنے کے لیے دے دیا کہ وہ اس کو چھپوا بھی دے گی وہ چھپا، مگر کتابت و طباعت بہت ناقص ہے، کاغذ بھی بہت ہی ردّی استعمال کیا گیا۔ یوں سمجھیے کہ اس لڑکی نے اپنا بوجھ اتارا تھا، لیکن اس سے اتنا ہوا کہ آج جب وہ نہیں ہیں ان کا کچھ نہ کچھ کلام محفوظ ہو گیا۔ میری خوش نصیبی کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے۔

نظام صاحب قدیم زمانے کے شاعر تھے۔ غزل، سلام، نوحے، مرثیے، رباعی، قطعات اور نظمیں اکثر اصناف سخن میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں پختگی ہے، لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے استادی کی شان ظاہر ہوتی ہے، روانی، سلاست و متانت، فکر و نظر کی گہرائی ہر ہر شعر سے عیاں ہے۔ شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تخیل صاف و سادہ الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ نہ تعقیدِ لفظی ہو، نہ تعقیدِ معنوی۔ جو اشعار صاف و سادہ ہوتے ہیں انھیں کو قبولِ عام حاصل ہوتا ہے اور زبانوں پر ضرب المثل کے طور پر رائج ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اور میر تقی میر کی یہی تو خصوصیت ہے جس کے سبب وہ عالمی شہرت کے حامل ہوئے۔ نظام صاحب کے کلام میں بھی اکثر ایسے اشعار مل جائیں گے۔ وہ روزمرہ اور محاورات کو ملحوظ خاطر رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے ہاں محاوروں کی بہتات ہے، مگر ایسی نہیں جو ذہن پر گراں بار ہو۔ تخیل ان کا بلند ہے کہیں کہیں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، لیکن شعر میں جو ایک کیفیت ہوتی ہے، دل و دماغ جس کے تابع ہو

جائے وہ ان کے ہاں خال خال ہے۔ تغزل میں کہیں کہیں بہت اچھوتے اور پر لطف شعر کہے ہیں، تصوّف کی چاشنی بھی ان کے ہاں ہے۔ مولانا عبد المقتدر صاحب قادری بدایونی سے بیعت بھی تھے۔ ان کے کلام میں صنائع بدائع، تشبیہات و استعارات اور اچھوتی تراکیب بھی ہیں۔ یہ سب اب اس دور میں گئی گزری ہوئی چیزیں ہوئیں، نہ تو کوئی انھیں پڑھتا ہے اور نہ برتتا ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لیکچرار اور پروفیسروں سے صنائع بدائع، تشبیہ واستعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ وغیرہ کی تعریف اور ان کے باہمی فرق کو معلوم کرو تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال دیتے ہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہے، بس کورس کی حد سے آگے وہ کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ عام حالات ہیں، مستثنیات تو کہاں نہیں ہوتے۔ آٹے میں نمک کی طرح ہوتے ہیں۔ تھوڑا بہت علم ایسے ہی لوگوں سے منتقل ہو جاتا ہے۔ بہر حال، نظام صاحب کے کلام میں یہ سب چیزیں بڑی خوبی سے وارد ہوئی ہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہم بھی دیارِ عشق میں آکر لٹے تو خوب
یہ بھی خبر نہیں کہ رہا کیا ہے، کیا گیا

☆☆☆

خوشی خوشی تری محفل میں آگیا اے دوست!
تری نگاہ سے اپنا شکار میں نے کیا
تری طرف سے بہت نا امیدیاں تھیں، مگر
بصد امید ترا انتظار میں نے کیا

☆☆☆

اے طالبانِ دید، مکان و زماں کی خیر!
وہ بجلیاں چھپا کے چلے ہیں نقاب میں

☆☆☆

مرے حالاتِ پریشاں کی شکایت نہ کرو
جب کہیں آگ سلگتی ہے، دھواں ہوتا ہے

عشق میں ہر قدم ہے موڑ نیا
پاؤں لگ جائے، یہ وہ راہ نہیں

☆☆☆

کوئی گنجائشِ تسکیں دلِ مضطر میں نہیں
پاؤں پھیلانے کی وسعت مری چادر میں نہیں

☆☆☆

چاہتے ہیں وہ رلانا تو ہنسا دیتے ہیں
اک دبی آگ کو پھونکوں سے ہوا دیتے ہیں

☆☆☆

نظام کوشش پیہم بھی صبر و ضبط کے ساتھ
جو پھولتے ہیں، وہ پودے ضرور پھلتے ہیں

☆☆☆

ابتدائے عشق ہے ہلکی سی جنبش حسن کی
انتہائے زندگی لبریز پیمانے کا نام

☆☆☆

اک عشق کا تقاضا، اک ضبط کا تماشا
دو پھول دیکھتا ہوں دامانِ زندگی میں

☆☆☆

حسن کی فطرتِ معصوم بھی ہے شعلہ مزاج
پھول کھلتے ہیں تو شبنم کو رلا دیتے ہیں

☆☆☆

یہ دیکھنے کو بڑھاتا ہوں لو محبت کی
کہ اِس چراغ سے کتنے چراغ جلتے ہیں

نظر کے سامنے تصویر ہے، خیال نہیں
تری قسم، تجھے نزدیک دیکھتا ہوں

اللہ تعالیٰ نظام صاحب کے درجات بلند کرے، انھیں جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے۔ بڑے بااخلاق، بہت ملنسار، بہت محبت کرنے والے، بڑے شفیق انسان تھے۔ مجھ ناچیز پر تو خصوصی توجہ تھی۔ میں ان کی محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

☆☆☆

عبدالرحیم قریشی

(۱۹۱۰ء۔۱۹۸۰ء)

شخصیت تو سعی و عمل اور جہد مسلسل سے بنتی ہے، اس کا کام اور کردار ہی اس کا اصل تعارف ہوتا ہے۔ نام کا اچھا ہونا، خاندان کا اعلیٰ و ارفع ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا اصل حیثیت تو اس وقت بنتی ہے جب وہ دنیا میں ایسے نقوش چھوڑے جو اَن مٹ ہوں، رہبری کام دیتے ہوں، جہد و عمل کے لیے تازیانہ ہوں، فکر کے سوتوں کو منجمد کرنے والے نہ ہوں بلکہ تیز دھاروں میں تبدیل ہو کر دور دور تک خشک کھیتوں کو سیراب کرنے والے ہوں۔ یہی کیفیت میرے خسر کی بھی تھی۔

عبدالرحیم قریشی عرف بابو، طویل قامت، گورے چٹے، خوب صورت، جوانی میں بڑی متاثر کن شخصیت کے مالک رہے ہوں گے۔ نہ معلوم کون کون ان پر مرمٹا ہوگا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی ہوگی۔ اجمیر کے رہنے والے تھے۔ اجمیر صحرا نوردوں کا علاقہ، دور در تک ریگ زاروں کا سلسلہ پھیلا ہوا۔ سادہ مزاج لوگ، سادہ زندگی بسر کرنے والے، ان کی زندگی سے تکلّف و تصنّع برطرف، ان کی سرشت عشق و محبت سے مالا مال۔ اسی لیے عشق و محبت کی داستانیں وہاں خوب پھلیں پھولیں۔ مومل رانو، سسی پنھوں اور عمر ماروی وغیرہ داستانیں راجستھان اور تھر کے علاقے کی مشہور ہوئیں۔ خود پرتھوی راج کی داستانِ عشق اسی علاقے کی پروردہ ہے۔ مستثنیات تو ہر جگہ ہوتے ہیں، البتہ راجستھان کے لوگ خلوص و محبت کا پیکر ہیں۔ میرا بھی تعلق راجستھان کے شہر جے پور سے ہے۔

عبدالرحیم قریشی صورت کے ساتھ اعلیٰ سیرت کے بھی حامل تھے۔ وہ ہمّت و استقلال کا پیکر، صبر و ضبط کا مجسّمہ، سعی و عمل کی تصویر، ان کی شخصیت میں رحمت و رافت گھلی ملی، ان کا جسدِ

خاکی بادِ سموم کے تھپیڑے برداشت کرنے کا عادی، ان کی فکر کا شہباز سدرہ نشیں، ان کا دل ہمدردی کے جذبات سے لب ریز، ان کی زبان شیریں بیان، بھلا ایسے لوگوں کو ہم زندہ تصور نہ کریں تو پھر کس کو کریں۔ زندگی تہہ دار معنوں کی حامل ہے اس کو سمجھنے کے لیے تربیت یافتہ شعور درکار ہوتا ہے۔ ایسا شعور جو حوادثات کے مُنہ زور طوفانوں سے کھیلنے والا ہو۔ مصائب و آلام کے ہجوم میں اس کے پائے استقامت میں کسی صورت کسی حال میں بھی لرزش نہ آنے پائے۔ اس کی تیز نگاہیں پے در پے کوندتی ہوئی بجلیوں کے درمیان اپنے مقصود کو دیکھ لینے والی ہوں، اس کے قلب کی حرارت لہو کو گرما کر پورے وجود کو متحرک کر دیتی ہو۔ ایسا ہی شعور انسان کو زندۂ و جاوید بناتا ہے۔

بابو سے میرا تعلق اس وقت ہوا جب وہ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے، مختلف عوارض نے انھیں گھیر لیا تھا، مختلف النوع مسائل کی گرہ کشائی کرتے کرتے جسمانی طور پر کمزور ہو گئے تھے، مگر ہمّت تھی کہ اب بھی جوان تھی، جوانوں سے زیادہ جوان، ہر کام میں مستعد، ہر معاملے میں پیش پیش۔ ماشاء اللہ سے سات بیٹیوں اور چار نہیں بلکہ پانچ بیٹوں کے باپ تھے۔ پانچ یوں کہ اپنے مرحوم چھوٹے بھائی کے بیٹے کو بھی اپنے ہی ساتھ رکھا۔ آدم جی ہاؤس میں اکاؤنٹ کے شعبے سے متعلّق تھے۔ قلیل آمدنی میں ایمان داری و دیانت داری سے بڑے کنبے کی پرورش کرنا جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ بڑے بڑے پارسا بھی ایسے میں احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع اختیار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، مگر بابو مرحوم نے رات دن محنتِ شاقہ سے کام لیا اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ دو بڑے بیٹوں کو انجینیئر بنایا۔ پھر ایک کو مزید تعلیم کے لیے امریکا بھیجا، امریکا کے مصارف برداشت کیے۔

تعلیم کے تو وہ دل دادہ تھے، ان کی کوشش یہی تھی کہ ساری اولاد اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہو اس میں ان کی بیگم برابر کی شریک رہیں بلکہ جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے تھے انھوں نے پورا کیا یعنی دو چھوٹے بیٹے انھیں کی کاوش سے انجینیئر اور ڈاکٹر بنے۔ معاشرے کے خدوخال سنوارنے اور بنانے میں تعلیم کو ہمیشہ ہی اہمیت رہی ہے۔ دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق

جن لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے وہ اپنے درمیان موجود لوگوں میں ممتاز ہو کر ابھرتے ہیں، میری اہلیہ منجھلی بیٹی تھیں یعنی سات میں سے چوتھے نمبر پر۔ جب میری شادی ہوئی تو وہ ایم اے کر چکی تھیں اور بی ایڈ کر رہی تھیں بابو نے مجھ سے کہا، ان کے بی ایڈ کی تکمیل میں شادی مانع نہ ہو۔ وہ تعلیمی ضرورتوں کو ہر قیمت پر پورا کرتے تھے۔ لڑکوں کو ہی نہیں لڑکیوں کو بھی سائنسی تعلیم کے حصول پر آمادہ کرتے تھے چناں چہ بعد کی لڑکیوں میں ایک ڈاکٹر ہوئی اور ایک نے بی ایس سی کیا۔

بابو بڑے متحمل مزاج آدمی تھے، زمانے کے نرم گرم چشیدہ لوگوں میں تو حالات کے تھپیڑے کھا کھا کر ویسے بھی قوتِ برداشت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ تحمل و بردباری سے ہی وہ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہیں، عجلت و بے صبری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وقت کا تیز رفتار دھارا اسی وقت بے قابو ہوتا ہے جب بے ضرورت بند باندھا جاتا ہے، لیکن اگر وقتی طور پر اس دھارے کو چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب و فراز سے گزر کر دم توڑ دیتا ہے اب اس کا سارا زور، ساری شوخی اور سارا غصہ ختم ہو جاتا ہے اور تھکے ماندے مسافر کی طرح پرسکون نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ تحمل و بردباری ہی ایسی چیز ہے جو بے قابو اور بپھری ہوئی موجوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور بابو میں یہ چیز حد درجہ کمال پر تھی۔ کیسی ہی سخت بات کیوں نہ ہو وہ آپے سے باہر ہونا جانتے ہی نہیں تھے بہت کبھی خلاف طبع بات ہوتی تو دو چار جملوں میں اپنی ناراضی ظاہر کر دیتے اور اِدھر اُدھر ٹہل جاتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ بہادر وہ ہے جو غصے میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کی محفل میں شریک ہونے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ شگفتہ و شاداب وہاں سے اٹھیں اور اپنی گرہ میں ایسے جواہر سمیٹ لیں جو آپ کو بھی قیمتی بنا کر اَن مول کر دے۔ حافظ:

ہر گلِ نو کہ شد چمن آرا ہے
اثرِ رنگ و بُوئے صحبتِ اوست

مجھے یاد ہے، میری بیٹی سمیہ آپریشن سے پیدا ہوئی۔ نہ معلوم کیا ہوا کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے، [illegible] لوگ مختلف انداز سے صبر و ضبط کی تلقین کر

رہے تھے، مگر مجھے کسی طرح قرار ہی نہیں تھا۔ بابو نے مجھ سے فرمایا، ناحق آپ فکر کرتے ہیں قطعاً گھبرائیں نہیں جانتے نہیں بیٹی ہے اور بیٹیاں خالی ہاتھ نہیں جایا کرتیں، ہمیشہ اپنا حصّہ لے کر جاتی ہیں جوان کے مقدر میں ہے۔ اس جملے میں ایسے حقیقت پسندانہ رویّے کا اظہار تھا کہ میری ساری پریشانی کافور ہوگئی اور میں اپنے اندر ایک گونا ہمّت اور ولولہ محسوس کرنے لگا۔ آج وہ نہیں ہیں، مگر میری بیٹی ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کی ماں ہے۔

بابو بڑے مخیّر آدمی تھے۔ حدیث شریف میں خرچ کرنے کی بڑی ترغیب ملتی ہے۔ حضرت بلالؓ ایک غلام، ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا ایک مرتبہ افطار کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے لیے بچا کر رکھ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

أَنْفِقْ بِلَالُ، وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالا (برازعن ابن مسعود والی ہریرہؓ)

اے بلالؓ! خرچ کرو اور عرش والے سے مفلسی کا خوف نہ کرو۔

بلاشبہ محنت سے کمائی ہوئی دولت خرچ کرنے کے لیے بڑی ہمّت چاہیے۔ یہ تو صرف اہل اللہ اور بزرگوں ہی کا کام ہے ہم جیسے مادّہ پرستوں کا کام نہیں، ہم تو صرف روپیہ پیسا کو ہی حاجت روائی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہی روپیہ پیسا اگر دوسروں کے کام نہیں آسکتا تو ہمارے کب کام آئے گا۔ عقل مند لوگ نفس کی چالوں کو خوب سمجھتے ہیں ان کا ضمیر انھیں آمادہ رکھتا ہے کہ یہی دولت تو ہے جس سے وقت پڑنے پر کام نہیں لیا گیا تو پھر یہ فتنہ وفساد کا پیش خیمہ بن جائے گی اور ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ بابو کو اس بات کا شعور تھا۔ اسی کے پیش نظر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، اولاد پر اور نہ معلوم کن کن پر یہ تو اس وقت پتا چلا جب وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وہ اپنی ذات پر ایک پیسا بھی خرچ کرنے کے روادار نہ تھے، ہماری خوش دامن بیمار تھیں، سول ہسپتال میں داخل، ہم انھیں دیکھنے گئے۔ واپسی میں بابو اور میں ساتھ ساتھ تھے۔ رات کے دس بجے تھے میں ٹیکسی کر کے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا، مگر بابو نے ٹیکسی لینے کو منع کر دیا اور بس کے انتظار میں کھڑے رہے میں نے ہر ممکن کوشش کی، مگر وہ آمادہ نہیں ہوئے، یہ ان کے نزدیک اسراف تھا یہی پیسا وہ مستحقین پر خرچ کر کے طمانیت محسوس کرتے تھے۔ عورتیں عام طور پر اس قسم کے کاموں

میں مانع ہوتی ہیں، لیکن اللہ بھلا کرے ہماری خوش دامن کا کہ وہ ان سے زیادہ مخیّر ہیں۔ پہلے اس باب میں شوہر کی معاون تھیں اب بیٹے کو ترغیب نہیں بلکہ بسا اوقات حکم دیتی ہیں اور سعادت مند بیٹا (محمد شریف قریشی) حکم کی تعمیل میں سرِ خم کیے رہتا ہے۔ گھر تو اسی وقت جنّت کا نمونہ بنتا ہے جب مرد عورت دونوں یکساں فکر اور سوچ کے حامل ہوں، دونوں میں کامل توافق و ہم آہنگی ہو۔

دنیا میں بہت سے لوگ اب بھی ایسے ہوں گے جن کی تعمیر کردہ روشن و منوّر شاہراہ پر گام زن ہو کر آنے والی نسلیں اپنے مقصود تک پہنچتی ہوں گی، لیکن میں بالیقین کہتا ہوں کہ ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے۔ نفسا نفسی کا دور ہے کوئی کسی کا نہیں ہر شخص اپنے مفاد کے لیے کوشاں ہے، اس سعی و کوشش میں نہ تو اخلاقیات کا کچھ حصّہ ہے اور نہ حلال وحرام کی تمیز، مگر بابو جیسی شخصیتوں کے حالات کا مطالعہ کر کے یقین ہونے لگتا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی ہم صبر و قناعت اور ہمّت و استقلال سے زندگی گزار سکتے ہیں اور بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں اَللّٰھُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الأُمُوْرِ كُلِّهَا، وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الآخِرَةِ۔

ان کا انتقال ۵؍دسمبر ۱۹۸۰ء بروز جمعۃ المبارک ہوا، والد صاحب قبلہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ دنیوی محنت و مشقت اور صبر و تحمل کا بہتر صلہ عطا فرمائے جو انھوں نے اپنی ذات کے لیے نہیں اپنے لواحقین کے لیے ہر لحہ روا رکھا۔ آمین

احسان دانش

(۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء)

۱۹۶۹ء کی بات ہے میرے پاس بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ از فیضی، جوگ بشست اور مکاتیبِ نواب سعد اللہ خاں کے مخطوطات تھے اور میں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چھان پھٹک کر آ رہا تھا کہ ان کے نسخے کن کن کتب خانوں میں ہیں۔ انارکلی میں موتی چور ہاؤس کے پاس لسّی پینے کھڑا ہو گیا۔ وہیں محسن بھوپالی مل گئے، انھوں نے کہا، چلو احسان دانش صاحب سے ملتے ہیں۔ سامنے ہی لمبی سیڑھیاں چڑھ کر احسان دانش کے پاس پہنچے۔ احسان صاحب کو پڑھا تو تھا، مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ان سے مل رہے تھے۔ بھاری بھرکم جسم، موٹے موٹے نقوش، چہرے پر اعتماد کی جھلک نمایاں، کھدر کا لباس پہنے ہوئے بیٹھے تھے، بڑی محبت سے ملے۔ چھوٹا سا کمرہ، سفید چاندنی بچھی ہوئی، گاؤ تکیے لگے ہوئے، اردگرد الماری میں کتابیں سجی ہوئی نہیں بلکہ دھری ہوئی تھیں، قدیم زمانے کے منشیوں اور بہی کھاتا نویسوں کی سی ایک ڈیسک رکھی ہوئی تھی۔ احسان صاحب وہیں بیٹھے ہوئے غالباً کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم خاموش بیٹھ گئے۔

میرے ہاتھ میں قدیم حنائی کاغذ کے مخطوطات کو دیکھ کر احسان صاحب نے بڑے تجسّس سے پوچھا، کیا یہ قلمی کتابیں ہیں، میں نے کہا، جی ہاں اور ان کو دیکھنے کے لیے دے دیں۔ مجھے اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ احسان صاحب کو قلمی نسخوں سے بڑی دلچسپی ہے اور یہ کہ ان کی کتابوں کی دکان بھی ہوا کرتی تھی۔ وہ بدستور ان نسخوں کو دیکھتے رہے اور سوال پر سوال کرتے رہے۔ یہ کب کے ہیں؟ کاتب کون ہے؟ چھپے بھی ہیں یا نہیں؟ ان کے نسخے اور کن کن کتب خانوں میں ہیں؟ وغیرہ۔ میں حیران تھا کہ ایک نرا شاعر اور وہ بھی کچھ زیادہ

پڑھا لکھا نہیں، اس قدر گہری دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور ایسے ٹھوس علمی سوالات کر رہا ہے جیسے اسے مخطوطات کی خوب پرکھ ہو۔ پھر فرمانے لگے، ہمارے پاس بھی قلمی نوادرات ہیں اور ڈیبک کا ڈھکنا اٹھا کر ایک کتاب نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ یہ قرآنِ پاک کا قلمی نسخہ نہایت خوش خط مطلّا و مذہّب تھا۔ حاشیے پر نقاش نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ابتدائی دو صفحوں کو تو گلکاریوں سے بھر دیا تھا۔ میں نے ترقیمہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ یاقوت مستعصمی کا تحریر کردہ ہے۔

یاقوت مستعصمی ساتویں صدی ہجری کا مشہور خطّاط تھا۔ اصل نام جمال الدّین اور قبلۃُ الکتاب لقب تھا۔ بنو عبّاس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کے غلاموں میں تھا، اسی نسبت سے مستعصمی کہلاتا تھا۔ یہ اپنے فن کے باعث دربارِ خلافت میں بڑی عزّت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عبدالمومن اصفہانی کا شاگرد تھا اور ابن بوّاب کے خط کا مقلّد تھا۔ قرآنِ مجید لکھا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی عمر میں ایک ہزار قرآنِ مجید لکھے ہیں۔ یہ تو خیر نرا مبالغہ ہے۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآنِ مجید ترکی اور مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور متعدّد وصلیاں بھی مختلف جگہ پائی جاتی ہیں۔ ۶۹۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء کو انتقال کیا (خط و خطّاطان از حبیب آفندی و دائرۃ المعارف، پنجاب)

کیسی نادر و نایاب چیز دکھائی تھی کہ دل و دماغ روشن ہو گیا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور اوراق الٹتا رہا۔ شاعری میں جس طرح شعراء مختلف صنعتیں پیدا کرتے ہیں اسی طرح خطّاط بھی لکھتے وقت مختلف صنعتیں پیدا کرتے ہیں کہیں مدّات سے، کہیں نقطوں سے اور کہیں دوائر سے۔ میں اسی کھوج میں تھا کہ میری نظر حرف واؤ پر پڑی جہاں جہاں جس جس جگہ پر واؤ آیا تھا ہر صفحے پر یکساں ایک دوسرے کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ آج کے جدید آلات سے اس کو اگر ناپا جائے تو ایک ملی میٹر کا بھی فرق نہیں نکلے گا۔ میں نے احسان صاحب سے کہا کہ آپ مجھے ایک پن دیں اور اجازت دیں کہ میں اس میں کہیں گاڑ دوں، میں ایک نئی چیز آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا، میں خاموش ہو گیا اور دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی ہی دیر گزر[illegible] ایک پن میرے حوالے کی،

اس تاکید کے ساتھ کہ کوئی بھی ورق خراب نہ ہو۔ میں نے بڑی احتیاط سے وہ پن حرف واؤ پر گاڑ دی نیچے جتنے اوراق پر اس کا اثر ہوا سب حرف واؤ ہی تھے۔ یعنی کتابت کے ساتھ جز بندی کا بھی کمال تھا۔ یہ دیکھ کر احسان صاحب کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر فرمایا، اچھا یاقوت کے حالات بھی معلوم کرو، میں دوسرے روز جامعۂ پنجاب کے کتب خانے گیا اور یاقوت کے حالات لادیے۔

یہ پہلی ملاقات تھی، احسان دانش صاحب ہم سے بڑے متأثر ہوئے۔ فرمانے لگے، میرے کتب خانے میں ہزار سے زیادہ مخطوطات ہیں اس کی ایک توضیحی فہرست مرتب کردو۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ چھٹیوں میں آ کر ان شاء اللہ یہ کام کروں گا۔ وہ مجھے حیدر آباد مسلسل خط لکھتے رہے۔ ہر خط میں یہی تقاضا تھا کہ آ کر فہرست مرتب کردو۔

۱۹۷۰ء میں لاہور گیا۔ احسان دانش کے ہاں ہی قیام کیا۔ انارکلی میں پہلی منزل پر ایک بڑا سا ہال تھا اور دو چھوٹے کمرے۔ اس سے اوپر والی منزل پر ان کی فیملی رہتی تھی۔ پہلے ہی روز جب دوپہر کھانے کے لیے بیٹھے تو روٹی سالن کے ساتھ ایک پلیٹ میں پیاز کے بڑے بڑے ٹکڑے اور پودینے کی ٹوٹی ہوئی پتّیاں تھیں۔ ہم لوگ سلاد کھاتے ہیں تو بھی بڑے اہتمام سے، ٹماٹر، ہری مرچ وغیرہ سب ہی کچھ تو ہوتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے سلاد کہوں یا کیا کہوں۔ احسان صاحب نے شاید میرے تجسّس کو بھانپ لیا۔ فرمانے لگے، شاکر صاحب میرے دسترخوان پر اگر پیاز اور پودینہ نہ ہو تو میں کھانا نہیں کھاتا، میں بڑا متعجب ہوا پھر مزید کہنے لگے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے یہیں لاہور میں ہم قلی گیری کیا کرتے تھے، قلیوں کے گلے میں سامان ڈھونے کے لیے ایک جھولا بھی پڑا ہوتا ہے۔ ہمارے جھولے میں روٹی اور پیاز کے کچھ گنڈے پڑے ہوتے تھے، بھوک لگتی تو لاہور اسٹیشن کے پیچھے جو کھیت تھے وہاں سے پودینے کی کچھ پتّیاں توڑ لاتے اور روٹی کھا لیتے تھے۔ میں اس یاد کو ہمیشہ تازہ رکھتا ہوں۔

مجھے یہ سن کر ایاز کا واقعہ یاد آ گیا۔ ایاز محمود غزنوی کا غلام تھا اور سب سے قریب تھا اس کے باوجود وہ اپنے گذشتہ زمانے کا پھٹا پرانا لباس اور گڈریے والی لکڑی کو دیکھ کر اپنے

آپ کو تنبیہ کرتا تھا کہ ''ایاز اگرچہ آج تو بادشاہ کے سب سے زیادہ قریب ہے، مگر تیری حقیقت وہی گڈریے کی ہے۔ اسے نہ بھولنا۔''

بہر حال، میں نے قلمی کتابوں کی فہرست بنانا شروع کی پندرہ دن کے عرصے میں تقریباً دو سو نسخوں کی فہرست مرتب کر سکا۔ ان میں سے اکثر کتابیں طبع ہو چکی تھیں، مگر اسّی کے قریب بہت اہم تھیں ان میں بعض نسخے تو مصنف کی وفات کے بہت قریب کے تھے، بعض فنِ خوشنویسی کے اعتبار سے قابلِ دید تھے جو مطلّا و مذہّب ہونے کے ساتھ ساتھ گلکاری سے مزیّن تھے۔ ناصر علی سرہندی کی ایک مثنوی نہایت خوش خط تھی۔ شیخ علی حزیں کے دیوان کا انتخاب جلی قلم سے لکھا ہوا تھا اور بعض نسخے غیر مطبوعہ تھے ان کے علاوہ شیخ محی الدّین ابنِ عربی کی تصانیف کی نقلیں تھیں۔ جنگِ آزادی (غدرِ دہلی) سے متعلق خطوط کی نقلیں تھیں جو حکومتِ ہند کے قائم مقام سیکرٹری کی جانب سے نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کو لکھے گئے تھے، گورنمنٹ آف انڈیا کے ریکارڈ کی نقلوں پر مشتمل دو رجسٹر بھی تھے، جن میں ہمارے نام نہاد سر، شمس العلماء، اور خان بہادر وغیرہ خطاب یافتہ شخصیتوں کے وہ تمام کارنامے درج تھے جو انھوں نے حکومتِ ہند کے مفاد میں انجام دیے تھے اور جن کے صلے میں خطابات اور جائداد وغیرہ سے نوازا گیا تھا۔ میں نے اس پر ایک مضمون بھی تحریر کر دیا تھا، مگر احسان دانش صاحب نے یہ کہہ کر پھاڑ دیا کہ ''ہمارے لیے ماضی کی رسوائی بھی ناقابلِ برداشت ہے تو مستقبل سے غفلت بھی۔'' یہ توضیحی فہرست احسان دانش صاحب نے ''قومی زبان'' میں اشاعت کے لیے افسر امروہوی مرحوم کو بھیج دی تھی۔ جب افسر امروہوی صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے فرمایا، میں نے مشفق خواجہ صاحب کو دے دی تھی، مشفق خواجہ کہتے تھے، مجھے علم ہی نہیں۔ غرض وہ فہرست ضائع ہو گئی، کچھ پتا ہی نہیں چلا اور فہرست پر کیا منحصر، دانش صاحب کا کتب خانہ بھی ضائع ہو گیا۔ کچھ کتابیں تو خود انھوں نے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کو بیچ دی تھیں، وہ یقیناً محفوظ ہوں گی۔ میں نے ان کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر فیضان دانش صاحب سے معلوم کیا کہ وہ قرآنِ مجید، رجسٹر اور خطوط کہاں گئے۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کر دی۔ صرف ایک نہایت مختصر سا مضمون اردو مخطوطات پر اپنی یادداشت سے لکھ کر ''کاوش''

رسالے میں چھاپ دیا تھا۔اس رسالے کو میں بسلسلہ وار حیدرآباد سے نکالا کرتا تھا۔

احسان دانش صاحب کے ہاں اس عرصے میں بڑے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ان کے پاس بڑے باکمال لوگ آیا کرتے تھے۔ایک صاحب سے انھوں نے ملایا جنھیں پیر صاحب کہہ کر مخاطب کرر ہے تھے وہ پتھر کو رنگنے میں مہارت رکھتے تھے انھوں نے کہا کہ میں پتھر اس طرح رنگ دیتا ہوں کہ رنگ اس کے جگر تک اتر جاتا ہے توڑو تو اندر بھی وہی رنگ ہوگا۔ پرانی مسلیں، فرامین اور خطوط کی اصل کے مطابق اس طرح نقل کرتا ہوں کہ جدید آلات سے بھی اس کو نقلی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف میرا شوق ہے، کبھی ان سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔واللہ اعلم۔ایک صاحب کے پاس عبدالمجید پرویں رقم کی ایک وصلی تھی، دو سو روپے مانگتے تھے، میں سو روپے دے رہا تھا،نہیں مانے۔ پرانی کتابوں کے مشہور تاجر شمس الدّین صاحب سے اوّل وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ایک دن شورش کاشمیری پھٹے حال اوپر چڑھتے آئے، انارکلی میں کوثر نیازی سے ان کی ہاتھا پائی ہوئی تھی۔احسان صاحب انھیں 'جن' کہتے تھے۔پورے ایک دن اور ایک رات وہاں رہے، خوب ملاقات رہی۔ میں نے ان سے سرسکندر حیات کے زمانے سے ذوالفقار علی بھٹو صاحب تک کے زمانے کے سیاسی حالات معلوم کیے اور اس زمانے سے اب تک ان پر کیا کیا گزری، انھوں نے تفصیل سے بتایا۔ایک صاحب آئے، وہ سفارش کے لیے احسان صاحب کو گورنر صاحب کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔احسان صاحب نے مجھ سے کہا، شاکر صاحب میں ایک زمانے میں ان کے پاس چپراسی تھا۔وہ صاحب شرمندہ سے ہوئے، کہنے لگے کہ دیکھیے، آج میں ان سے سفارش کرانے آیا ہوں۔اللہ جس کو چاہتا ہے عزّت دیتا ہے۔

احسان دانش صاحب نے فرمایا، ایک زمانے میں مجھے پنجاب یونیورسٹی نے ادیب کا ممتحن مقرر کیا۔اس پر سنڈیکیٹ میں زبردست ہنگامہ ہوگیا بعض لوگوں کو اعتراض تھا کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔وائس چانسلر نے مجھے بلایا میں نے پوری مجلس کے سامنے کہا کہ میرے پاس ایسی ڈگری ہے جو آپ میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔جس دیوار کے پہلو میں آپ بیٹھے ہیں اس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے چنا ہے۔فرمانے لگے، پھر مجھے خیال

آیا کہ کیوں نہ میں امتحان پاس کرلوں، چناں چہ ادیب کے امتحان کی تیاری کی۔ امتحان دینے پہنچا جب پرچہ میرے ہاتھ میں آیا تو اس میں ایک سوال تھا کہ شاعرِ مزدور احسان دانش کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تفصیل سے لکھیے، میں نے وہیں کاپی دی اور گھر چلا آیا۔

احسان دانش صاحب بڑے سادہ، خلیق، متواضع اور بے انتہا شفقت و محبت کرنے والے انسان تھے آخر عمر تک انھیں کھدر کا لباس ہی پہنے دیکھا۔ ایک مرتبہ کراچی آتے ہوئے حیدرآباد میں غریب خانے پر قیام کیا۔ میری بہنوں نے چارپائی پر گدّے وغیرہ بچھا دیے تھے، احسان صاحب کی نظر پڑی تو فرمانے لگے، یہ کیا تمھیں معلوم ہے میں تو کھرّی چارپائی پر سونے کا عادی ہوں، ان آرام دہ چیزوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان کی آمد کیا تھی حیدرآباد میں جیسے بہار آگئی ہو، مرحوم منظر اکبر، آغا قزلباش اور اشتیاق اظہر وغیرہ صاحبان نے بڑا تعاون کیا، ان کے اعزاز میں کئی نشستیں ہوئیں۔ تین دن قیام رہا۔ ایک روز استاد محترم جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے سندھ یونیورسٹی جام شورو میں شعبۂ اردو کے تحت ایک نشست کا اہتمام کیا۔ طلبہ نے فرمائش کی کہ ہم ۱۹۴۰ء سے پہلے کے شاعرِ مزدور کو سننا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا، میں پچھلے گناہوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ ان کی مراد غالباً اشتراکی نظریات سے تھی جن کا اس زمانے میں ان پر غلبہ تھا۔ پھر کچھ معروف نظمیں سنائیں، مگر زیادہ تر نیا کلام ہی سنایا۔

ان کے کلام میں زندگی کے دکھ درد کی جھلکیاں ہیں، وہ ہمیشہ آلام و مصائب سے دو چار رہے، زندگی نے ہمیشہ انھیں محبوب و مرغوب چیزوں سے دور رکھا اور پیہم رنج و غم کے شکنجے میں جکڑے رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام زندگی کے تلخ تریں تجربات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

وہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں نرمی و ملائمت کے انداز میں، شائستگی سے، مگر وہ جذبات کی تیز آنچ سے لفظوں میں ایسی حرارت پیدا کر دیتے ہیں کہ حساس وجود اس کی تپش کو اپنے اندر محسوس کرنے لگتے ہیں، وہ مزدور طبقے کی غم ناک تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ قاری یا سامع تڑپ اٹھتا ہے اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

وہ دلوں کی ترجمانی کے ساتھ فطرت کے حسین مناظر کو بھی اسی طرح اپنے تخیل کے احاطے میں سمیٹ کر لفظوں کے فطری حسن اور رعنائی کے ساتھ دوسروں تک منتقل کر دیتے ہیں۔اس میں ان کو بڑا کمال حاصل ہے۔ان کی زبان بھی سادہ ولطیف، ان کا بیان بھی سادہ ولطیف جس میں اثر وتاثیر کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔

احسان دانش صاحب نے اپنی زندگی کے تمام تلخ اور خوشگوار واقعات بلا کم و کاست ''جہانِ دانش'' میں بیان کر دیے ہیں۔جس کے مطالعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ حوادثات بھی کسی کسی کو خاص طور پر منتخب کر لیتے ہیں اور مسلسل اس پر ہجوم کرتے رہتے ہیں، اب جس میں جتنی ہمت اور استقلال کی قوت ہوتی ہے وہ اسی قدر اس کو برداشت کرتا ہے۔حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ ہمت کے معنی مخالف قوتوں کے مقابلے میں استقلال واستقامت سے استادہ رہنا۔بلاشبہہ یہ بڑا ہی مشکل کام ہے اور مشکل امور سے نبرد آزما ہو کر ہی آدمی باہمت ہوتا ہے پھر زمانے کی مسدود ونا ہموار راہیں بھی اسے منزل مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتیں۔وہ اکثر یہی کہا کرتے تھے کہ جب بھی میں بڑے لوگوں کو دیکھتا تھا یہی خیال کرتا تھا کہ میں بھی کبھی اس طرح کا ہو جاؤں گا، سو زمانے نے دیکھ لیا۔اقبال حیاتِ جاوید کے لیے ''پیامِ مشرق'' میں یہ پیغام دیتے ہیں۔احسان دانش صاحب نے اس پیغام کو خوب سمجھا ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست
قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگہی، مجوئے دگر
دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز وشعلہ بے باک است

[یہ مت خیال کرو کہ پیرِ مغاں کو جس قدر شراب کشید کرنی تھی کر چکا، انگور کی بیل میں ابھی تک ہزاروں قسم کی شراب موجود ہے جسے ابھی تک چکھا بھی نہیں گیا۔ یہ چمن (دنیا) بہت دلکش مقام ہے، لیکن تم غنچے کی طرح زندگی بسر مت کرو کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کی زندگی کو منتشر کر دیتا ہے۔ اگر تم زندگی کے رموز سے آشنا ہو تو ایسا دل تلاش کرو جو آرزو کی خلش کے کانٹے سے پاک ہو (یعنی دل آرزو سے مالا مال ہو کہ آرزو ہی عمل کا محرک بنتی ہے) حیات جاوید کی آرزو رکھتے ہو تو اپنے آپ کو پہاڑوں کی طرح مضبوط بناؤ (جنھیں کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا) خس و خاشاک کی طرح نہیں کہ ہوا تیز اور شعلہ بے باک ہے (طوفانوں سے گھری ہوئی زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے ثابت قدمی کے ساتھ بلند ہمتی اور مضبوط حوصلہ ہی درکار ہوتا ہے۔)]

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

(۱۹۲۹ء — حیات ہیں)

یہ بھی کیسا انحطاط کا دور آیا ہے کہ علم کی بساط ہی الٹ گئی ہے۔ جدیدیت کے ہاتھوں قدیم ڈگر پر قائم ایک ایک مہرہ مات کھا چکا ہے وہ علماء دنیا سے اٹھ گئے جو علم و عمل کا معیار تھے، جن کی زندگی زہد و تقویٰ سے عبارت تھی، جو اپنی پوری پوری زندگی علوم کی نذر کر چکے تھے، جن کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا اور جن کی سیرت و کردار میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ ہر طبقے کا فرد کھنچا کھنچا ان کی طرف چلا آتا تھا۔ اب ایسے لوگ مفقود ہوئے۔ باقیات الصالحات میں دو چار اگر باقی ہیں تو ان کے دم سے علم و عمل اور زہد و ورع کا باب کھلا ہوا ہے۔ ایسے ہی بقیۃ السلف میں میرے چچا محترم مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

چچا میاں کشیدہ قامت، گندم گوں، دراز ریش۔ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔ سفید لباس پہنتے ہیں۔ سہارے کے لیے ہاتھ میں مضبوط بید نما لاٹھی رکھتے ہیں۔ ابتدا میں جے پور میں مولانا قدیر بخش صاحب بدایونیؒ سے پڑھا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے وہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ انھیں سے بیعت بھی ہوئے۔ پاکستان آنے کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، جامعہ کراچی سے اسلامیات و لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ ذریعۂ معاش کے لیے مختلف لائبریریوں میں پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دیں۔ اسٹیٹ بینک کی لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری، جامعہ کراچی کی لائبریری اور کانوں یونیورسٹی نائجیریا کی لائبریریوں میں مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ اسی دوران ''اسلامی کتب خانے'' پر جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی

کیا، لیکن تدریس سے، جس سے علماء ہمیشہ وابستہ رہے ہیں، ابھی تک دور تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں پہلے تو التخصص فی الفقہ الاسلامیہ میں طلبہ کی نگرانی پر معمور کیے گئے۔ اب التخصص فی العلوم الحدیث النبوی الشریف کے شعبے میں طلبہ کی نگرانی کے فرائض بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔ پہلے اس منصب پر مولانا نعمانی ہوا کرتے تھے۔

چچا میاں ہمیشہ لائبریوں میں رہے۔ محنتی بھی ہیں، حافظہ بھی قوی پایا ہے۔ علوم اسلامیہ سے متعلق آپ کسی بھی موضوع کے بارے میں ماخذات کی تلاش میں ہوں تو چچا میاں بے تکلف بہت سے بنیادی مآخذ کی نشاندہی فرمادیں گے۔ ایک مرتبہ میں کراچی آیا، جونا مارکیٹ میں عبدالواحد کتب فروش سے کچھ پرانی کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سے دواوین، کچھ تذکرے غرض مختلف موضوعات پر سو ڈیڑھ سو کتابیں نکال لیں کہ چچا میاں آ گئے۔ فرمانے لگے، اتنی کتابیں کس کام آئیں گی۔ ایک مرتبہ پڑھیں اور پھر ہمیشہ کے لیے الماری کی زینت بن گئیں۔ یہ کتابیں تو بڑی لائبریریوں کے لیے ہیں جہاں سے ہر کوئی استفادہ کرسکتا ہے۔ نجی لائبریریوں کے لیے تو ایسی کتابیں ہوں جو ہر وقت کام آئیں۔ چناں چہ انھوں نے ان میں سے پچیس تیس کتابیں الگ کر دیں کہ یہ لے لو باقی میں سے اگر کوئی زیادہ ہی پسند آئی ہو تو لے لو۔ یہ کتابیں ہمیشہ تمھارے کام آئیں گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پتا چلا کہ وہی کتابیں آج تک کام آ رہی ہیں۔ چچا میاں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بہت ہی مختصر سے رسالے ''عجالہ نافعہ'' کا ترجمہ کیا اور اس پر پانسو صفحات پر مشتمل ''فوائد الجامع'' کے نام سے حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیے جس سے صدہا محدثین و رجال اسلام کا تعارف ہوتا ہے اور نہایت ہی قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں اور یہ کتاب ان کے وسیع مطالعہ اور تحقیقی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چچا میاں نے مختلف علماء کی سوانح حیات بھی لکھی ہیں، ان میں حیات امام ابن الجزری، حیات وحید الزماں، علامہ جلال الدین سیوطی، حسن صغانی لاہوری، ابوداؤد الطیالیسی، مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا خرم علی بلہوری، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہ ہیں۔ ان میں زیادہ تر معارف اعظم گڑھ میں طبع ہوئی ہیں۔

صحتِ حدیث کے تعین کے ذیل میں لاکھوں محدثین کرام کے حالات جمع کرنے کا کام تدوین حدیث کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے مثلاً صداقت و امانت، دیانت و عدالت اور حافظہ وغیرہ کا بطور خاص جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ اسماء الرجال کا فن کہلاتا ہے۔ صدیوں یہ عمل جاری رہا اور جدید تحقیق کے بنیادی اصول اسی سے منضبط ہوئے۔ پھر اردو فارسی میں آتے آتے یہ تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری میں ڈھل گیا۔ اردو میں سوانح نگاری کے باب میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں: حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید۔ ان میں ''حیاتِ سعدی'' کو پہلی باضابطہ سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے اور اس کا دیباچہ بقول ڈاکٹر عبدالقیوم ''اردو میں سوانح نگاری کا منشور کہا جا سکتا ہے۔'' علامہ شبلی نعمانی نے بھی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ سیرۃ النعمان، الغزالی، سوانح مولانا روم، الفاروق اور المامون وغیرہ۔ سیرۃ النبیؐ ان سب سے بالا ہے۔ شبلی نعمانی پر تو یہ الزام ہے کہ ان کی سوانح مدلل مداحی کا نمونہ ہیں۔ چچا میاں نے جو سوانح لکھی ہیں اس کی غایت شخصیت کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تمام پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنا مقصود ہے جو سیرت و کردار کی تعمیر و ترقی میں معاون بن سکیں۔ یہ بات تو میرے حلق سے قطعاً نہیں اترتی کہ ہیرو کی بائیوگرافی میں اس کے محاسن کے ساتھ اس کے معائب کو بھی ضرور بیان کرنا چاہیے۔ شخصیت بے داغ ہو تو کیا زبردستی معائب بیان کریں گے؟ یا وقت کے ہاتھوں اگر معائب پر پردہ پڑ گیا ہو تو کیا اپنی طرف سے کُرید کُرید کر زبردستی بیان کر دینا چاہیے؟ شخصیت تو اسی وقت ہیرو بنتی ہے جب معائب سے پاک ہو اور محاسن کا مجموعہ ہو۔ یا معائب اس کے محاسن میں اس طرح دب گئے ہوں کہ نکالے نہیں نکلیں۔ چچا میاں نے نہایت سلیقے سے، علمی پس منظر میں، مستند حوالوں سے شخصیت کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ وہ تحقیق کے آدمی ہیں اس لیے سوانح کی تحقیق میں انھوں نے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بالکل باک نہیں ہے کہ دیوبند کے تعلیم یافتہ اصحاب کا قلم جدید علمی موضوعات میں اتنا رواں، اتنا با سلیقہ نہیں جتنا چچا میاں کا ہے۔ یہ تو اہلِ ندوہ کی خصوصیت ہے اور چچا میاں کے ہاں یہ صفت

وہیں کہیں سے آئی ہے۔

حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سیّد غلام رسول مہر نے بڑا وقیع کام کیا ہے۔ مولانا مہر نے تو تحقیق کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، لیکن تحقیق کا میدان تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ بعض پہلو جو اِن دونوں کے ہاں تشنہ رہ گئے تھے، اُن پر چچا میاںؒ نے قلم اٹھایا۔ اردو ادب کے تاریخ نگار شعر و شاعری، داستان، ناول، افسانہ یا معاشرتی و اخلاقی موضوعات پر مشتمل تحریری سرمائے کو تو اردو ادب میں شمار کرتے ہیں، لیکن علماء کی تحریروں کو اس باب میں شمار نہیں کرتے۔ سر سیّد احمد خاں کی نثری خدمات کو بڑی شدّ و مد سے سراہتے ہیں، مگر خانوادۂ شاہ ولی اللہ کی اس باب میں خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چچا میاں نے ''اردو ادب پر سیّد احمد شہید کی تحریک کا اثر'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس سے اردو نثر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے استادِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰؒ کو جنت فردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ انھوں نے خود بھی اور اپنے شاگردوں سے بھی دین کے حوالے سے بہت کام کرایا ہے اگر وہ سارا کام منظر عام پر آجائے تو اردو ادب کی تاریخ میں نئے گوشوں کا اضافہ ہو اور اردو ادب کی تاریخ میں علماء کے کردار پر بھی روشنی پڑے۔

بچپن میں چچا میاں اور ہم سب ساتھ رہتے تھے، پہلے رام سوامی میں، پھر بعد میں پی ای ٹی کالونی گزری میں۔ چچا میاں اس وقت پڑھتے تھے۔ چھوٹے چچا مظفر لطیف صاحب ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ دادا بھی ساتھ تھے۔ تنہا والدہ ہی سارے گھر کی ذمّے دار تھیں۔ انھوں نے چچاؤں کی بڑی خدمت کی۔ چچا میاں یکسوئی کی خاطر بندر روڈ پر عین بندو کباب والے کے سامنے بنگلے میں آکر رہنے لگے تھے۔ یہ غالباً سیّد علی صاحب کا بنگلہ تھا۔ والدہ افطار اور سحر کا انتظام کر کے میرے ہاتھ بھیجتیں۔ میں نے اسی زمانے میں جیکب لائن کی مسجد میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ کے پیچھے تراویح پڑھی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا کو قرآن زیادہ یاد نہیں تھا۔ متشابہ بہت لگتے تھے۔ بعد میں انھوں نے پختہ کرلیا تھا۔ والدہ ہی نے دونوں چچاؤں کی شادی کرائی۔ حیدر آباد بیاہنے گئے تھے۔ چچا میاں دولھا بنے ہوئے تھے۔

نکاح خواں نے خطبہ پڑھا، ان کو خطبے میں متشابہ لگا، چچا میاں نے متشابہ دیا، قاضی صاحب تو خاموش ہو گئے اور چچا میاں نے خود ہی اپنا خطبہ پڑھ لیا، پھر قاضی صاحب سے کہنے لگے، ایجاب تو کرائیے۔ نکاح عصر کے بعد ہوا تھا، مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا، تفریحِ طبع کے لیے جوتا چرائی ہونی تھی، ہم نے چچا میاں سے کہا، آپ جوتا ہرگز نہیں اتاریں اور جوتے کی حفاظت کے لیے ساتھ ہی بیٹھے تھے کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔ وہیں جماعت کا اہتمام ہونے لگا۔ مظفر لطیف صاحب نے جوتے اتار دیے۔ والد صاحب نے چچا میاں سے کہا، نماز تم ہی پڑھاؤ۔ تکبیر شروع ہوگئی اور چچا میاں نے بمع جوتے مصلے پر پہنچ کر نیت باندھ لی۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد والد صاحب کے کہنے پر جوتا اتارا۔

اس وقت بچوں میں مَیں ہی کچھ نہ کچھ سمجھ اور شعور رکھتا تھا، اس قابل بھی ہو گیا تھا کہ اپنے نوجوان چچاؤں کی سختیاں برداشت کر سکتا تھا۔ جوانی بڑے طمطراق سے آتی ہے۔ رعب، دبدبہ، تمکنت جیسے باجے گاجوں کے جلو میں رقص کناں فیلِ مست بے زنجیر چلی آتی ہے، جوانوں کو بڑوں کے زیرِ اثر زندگی گزارنے کے بعد اب موقع ملتا ہے کہ چھوٹوں پر حکم چلایا جائے۔ ان سے اپنی بات منوائی جائے، ان کی بات کو رد کیا جائے، ان کو جھڑکا جائے، ان سے محبت کا اظہار کیا جائے، ان کی ننھی منی خواہشوں کو پورا کر کے بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ شفقت و محبت کے ساتھ چچا میاں میرے لیے خاصے سخت تھے۔ وہ دادا کی طرح ہی چٹکی بھرتے تھے کہ جان ہی تو نکل جاتی اور نیل پڑ جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ سختی بھی میری تربیت کے ذیل میں تھی۔ میں یہ شکوے شکایت کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ مزاج اور افتادِ طبع بیان کرنا مقصود ہے۔ چچاؤں کی شادی کے کچھ عرصے بعد والد صاحب حیدرآباد منتقل ہو گئے اور میں کسی حد تک ان کی سختیوں سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اب ان کی تمام تر سختی سمٹ کر زبان میں آ گئی تھی۔ اب میں بڑا بھی ہو گیا تھا۔ ان کے طنز کے تیروں کا نشانہ نہیں بن سکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ نوک جھونک ہو جاتی تھی، مگر اب تو چچا میاں سراپا محبت ہو گئے ہیں، نہایت محبت سے ملتے ہیں اور ہم بھی زیادہ ہی عقیدت مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بڑے اب اٹھ گئے۔ وہی ہمارے بڑے ہیں، ہم انھیں کو خوشی و غم میں پیش پیش رکھتے ہیں، انھیں

کے پاس دعاؤں کی درخواست لے کر جاتے ہیں۔ حافظ:

شکستہ وار بدرگاہت آمدم کہ طبیب
بموميائی لطفِ تو ام نشاں دارد

اللہ تعالیٰ انھیں قائم و دائم رکھے، ان کے مرتبے کو بلند کرے اور ان کو ہر طرح اپنی عافیت میں رکھے۔ آمین۔

ہمارے گھرانے پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور انعام ہے کہ سب ہی دین دار اور عبارت گزار ہیں۔ چچا میاں کو ہم نے ہمیشہ دین دار ہی پایا۔ یہ تو خیر عالم ہیں، لیکن ان سے چھوٹے چچا مظفر لطیف صاحب عالم نہیں تھے پھر بھی وہ تہجد گزار، نیک و صالح تھے، میں یہ لکھ چکا تھا کہ ان کا ۲ر فروری ۲۰۰۷ء کو انتقال ہو گیا۔ عشاء کی نماز کے لیے وضوع کیا ہی تھا کہ بارگاہِ خداوندی سے بلاوا آ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ بزرگوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ استاد محترم ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب کے شیخ طریقت حضرت شاہ زوار شاہ صاحب سے بیعت تھے۔ مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب بھی ہمیشہ بزرگوں کی صحبت میں رہے ہیں۔ جانتے ہیں مردِ کامل کی صحبت میں ہی ہر قسم کے خطرات سے عافیت ہے۔

حافظ از دست مدہ صحبتِ آں کشتیِ نوح
ورنہ طوفانِ حوادث ببرد بنیادت

ابتدا میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا ہاتھ تھاما اور اب حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے خلیفہ نفیس شاہ صاحب کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رمضان کا پورا مہینہ انھیں کے پاس لاہور میں گزارتے ہیں۔

خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہوتی ہے۔ انفس و آفاق کی صداقتوں کا محل نفس انسانی ہے۔ ہمارے جملہ افعال و اعمال، ہماری سیرت و کردار میں حق و صداقت، صبر و استقامت، تسلیم و رضا، استغنا و قناعت، توکل و بے نیازی یا پھر کجی و ناہمواری اور عدم توافق، کبر و عُجب کی جھلکیاں ہر ذرۂ کائنات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی سے قوموں کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس کو یوں سمجھیے کہ انفرادیت نہ صرف اجتماعیت کا پیش خیمہ ہے

بلکہ آفاق کے تغیر و تبدل کا سبب بھی ہے۔ جہاں تک خارجی زندگی کے تغیرات کا سوال ہے تو یہ تغیرات تادیب و تزکیہ نفس کے لیے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جوان تغیرات و تحولات کی غایت سمجھ جاتا ہے وہ اپنی زندگی کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کرتا ہے اور دونوں عالم اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ چچا میاں اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں اسی لیے انھوں نے اپنی زندگی کو اس نمونے پر ڈھالا کہ آج عزت و تکریم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں ہیں کہ ان سے فیض پا رہے ہیں۔

چچا میاں بڑے خلیق، متواضع، عابدِ مرتاض ہیں، ان کی ذات خاندان کے افراد کے لیے ہی مرجع و مامن نہیں بلکہ تاریخ و سیر اور حدیث و فقہ کے طالبِ علموں کے لیے بھی ہے۔ وہ نہایت ذوق و شوق سے تشنگان علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ انھیں قدیم و جدید فن تحقیق سے خوب واقفیت ہے۔ اس باب میں انھوں نے قدیم علماء کی کتابوں کے ساتھ ساتھ مستشرقین کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ خود بھی اپنی تحریروں میں اس مسلمہ اصولوں کو اختیار کیا ہے اور طلبہ کی بھی اسی راہ سے رہنمائی کرتے ہیں۔ انھیں ترغیب دیتے ہیں کہ ماڈرن اصول تحقیق کے مطابق اپنے مقالے تحریر کریں۔ ان کے وسیع علمی و فکری ذوق کے سبب دور دور سے اہلِ علم ان کے پاس آتے ہیں اور اپنا مقصود پاتے ہیں۔

چچا میاں بہت اعلیٰ ذوق کے حامل ہیں، کھانے میں بھی ان کا بہت اچھا مذاق ہے۔ چائے سے تو وہ گریزاں ہی رہتے ہیں، میٹھا پسند کرتے ہیں۔ وہ جب بھی میرے گھر آتے ہیں اہلیہ ان کی تواضع میں مٹھائی رکھتی ہے۔ مٹھائیوں میں بھی وہ خاص طور پر انڈے کا حلوہ پسند کرتے ہیں، وہ بھی گھر کا بنا ہوا۔ ان کی بیٹیاں بہت عمدہ حلوہ بناتی ہیں یوں کہیے کہ اس معاملے میں ان کا گھر منفرد ہے۔ پی این ٹی کالونی میں جب ہم تھے تو والدہ چھوٹے چچا مظفر لطیف صاحب کے لیے روزانہ انڈے کا حلوہ بنایا کرتی تھیں۔ چچا میاں کا لباس بھی سادہ، مگر نفیس ہوتا ہے۔ سفید لباس ہی پسند کرتے ہیں۔ غیر ضروری بوجھ تو وہ اپنے اوپر لادنے کے قائل نہیں ہیں۔ صرف کرتا شلوار پہنتے ہیں، شلوار بھی ٹخنوں سے اوپر ہوتی ہے۔ مولانا نعمانی اور والد صاحب تو شیروانی پہنا کرتے تھے۔ چچا میاں کو ہم نے اس وقت

شیروانی میں دیکھا تھا جب وہ دولھا بنے تھے اس کے بعد کبھی کبھار پہن لیتے تھے، مگر اب بالکل بھی نہیں پہنتے اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کا بیٹا حافظ ڈاکٹر محمد ثانی اردو یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ ماشاء اللہ خوب لکھتا ہے، سیرت پر اس کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، حکومت پاکستان سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ یہ چچا میاں کی بہترین تربیت کا اثر ہے۔ جب اس بیٹے کی تعلیمی وتحریری صلاحیتوں کا ذکر کرو تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں تاحیات اسی طرح خوش وخرم رکھے۔ آمین۔ بصیرتِ باطن ہو تو گوشہ نشیں ہوتے ہوئے بھی ان کا تحریری سرمایہ ضرور سائر ودائر ہوتا ہے۔

حدیثِ اہلِ دل مشہورِ عالم می شود بیدلؔ
ز دریا چوں بروں آید گہر پنہاں نمی ماند



ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

(المتوفی: ۱۹۷۷ء)

ہم ایم اے میں تھے سال اوّل میں ایک پرچہ افسانے، ناول اور ڈرامے پر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی کتاب ''ناول کیا ہے'' کو نصاب میں معاون کتب کے ذیل میں درج کیا گیا تھا، چناں چہ ہم نے وہ کتاب پڑھی تھی، مگر ابھی تک صاحبِ کتاب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو معلوم تھا کہ وہ یہیں یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ شعبۂ انگریزی اور شعبۂ اردو برابر برابر تھے۔ سامنے ہی سینٹ ہال تھا اس میں بھی انگریزی کی کلاس ہوتی تھی۔ ہم دیکھتے تھے کہ ایک پروفیسر صاحب کشیدہ قامت، سفید رنگ، سفید بال، لمبی اور ستواں ناک، کلین شیو، پان کی سرخی ہونٹوں پر نمایاں، بوشرٹ اور پتلون میں ملبوس، بوشرٹ پر پان کی پیک کے باریک باریک دھبّے، اچھے خاصے نمبر کے شیشوں کی عینک لگائے انگریزی کی کلاس لے کر نکلتے کہ لڑکے پھر انھیں گھیر کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک روز معلوم ہوا کہ یہی ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب ہیں۔ عجیب حولے خولے قسم کے آدمی تھے، نہ لباس کا ہوش نہ اپنی سدھ بدھ، نہ یہ احساس کہ وہ پروفیسر ہیں، کلاس میں لڑکے لڑکیاں سب ہی ہوں گے۔ صبح اٹھے، مُنہ میں پان دبایا، سگریٹ سلگائی اور ٹہلتے ٹہلتے آ گئے کلاس میں۔ پتلون کے بٹن کھلے ہیں تو کھلے ہیں، انھیں کچھ خبر ہی نہیں جو شاگرد قریب ہوتا وہی بٹن لگا دیتا اور وہ بے نیازی سے کھڑے رہتے۔ ادب کے تعلّق سے تو ہم ان سے متاثر تھے ہی۔ کالرج (Colridge) پر ایک بہترین مقالہ ''نقوش'' لاہور میں پڑھ چکے تھے، ورنہ شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو متاثر کرتی۔

ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی ہی کے ایک حصّے میں، جہاں بینک تھا، اس کے اوپر کمرے

میں رہتے تھے۔ یاد نہیں کہ ہماری ان سے کیسے ملاقات ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں میں ملاقات گہری ہوگئی تھی۔ ایک روز میں کلاس کے باہر ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کلاس سے نکل آئے میرا ہاتھ پکڑا اور باتیں کرتے کرتے اپنے کمرے میں لے آئے۔ کمرے کا حال کیا بتاؤں کیا تھا کباڑیے کی دکان بھی اس سے اچھی ہوگی۔ ہسپتال والا اسپرنگ کا بیڈ اس پر بستر نہیں گوڈر پڑے ہوئے، یہی زیادہ مناسب لفظ ہے۔ اردگرد سیکڑوں کتابیں بکھری پڑی تھی۔ بمشکل تمام کتابوں کو سمیٹ کر میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ ڈاکٹر صاحب نے پان دان اٹھایا اور پان لگانے لگے مجھ سے بھی پوچھا، مگر میں نے منع کر دیا۔ انھوں نے پان مُنہ میں رکھا اور راو کے برانڈ کی سگریٹ سلگائی۔ یہ اس دور میں بہت سستی سگریٹ ہوتی تھی اور بہت تیز بھی تھی، نئے سگریٹ پینے والے اگر اس کا ہلکا سا کش بھی لگا لیں تو کھانسی کا دورہ پڑنے لگے۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے۔ موضوع وہی ناول اور افسانے کا۔ انگریزی کے تو وہ استاد تھے ہی اردو ناول وافسانے کی تاریخ، اس کے ارتقا اور فنی لوازم پر بھی محققانہ نظر رکھتے تھے خود بھی بہت اچھے افسانہ نگار تھے، کئی ناول بھی لکھے تھے۔ پاک و ہند کے اکثر مقتدر رسائل میں ان کے افسانے چھپے ہیں۔ فرماتے تھے، مَیں نے شروع میں ایک افسانہ لکھ کر ''نقوش'' لاہور کے لیے محمد طفیل صاحب کو بھیجا۔ چھاپنا کو کجا انھوں نے ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ اس بات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا۔ پھر تو میں نے ہر چھوٹے بڑے، اہم وغیر اہم رسالے میں افسانے بھیجنا شروع کیے اور اس قدر لکھا کہ کوئی رسالہ میرے افسانے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک روز محمد طفیل صاحب کا خط آیا کہ آپ ہمیں افسانہ بھیجیں، آپ کے افسانے سے ہمارے رسالے کا معیار بڑھے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ خط مجھے دکھایا۔

ڈاکٹر صاحب کے علم وفضل کا ہر کوئی معترف تھا وہ انگریزی ادب پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ کلاسیکی ادب سے اپنے دور تک پورے ادب پر انھیں عبور تھا۔ جیوفری چاسر (Geoffry Chaucir)، ولیم شیکسپیئر (WilliamShakespear)، شیلے (Shalley)، کیٹس (John Keats)، کالرج (Coleridge)، بائرن (Byron)، اور ٹی ایس ایلیٹ (T. S. Eliot)

وغیرہ کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کلاس میں وہ جب لیکچر دیتے تو طلبہ نہایت خاموشی سے ان کا لیکچر سنتے تھے۔ ان کا لیکچر ان کی وسعت معلومات کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ ہم تو خیر چند مرتبہ ہی ان کے لیکچر میں شریک ہوئے ہیں، وہ نہایت سادہ و شگفتہ زبان میں لیکچر دیتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا غنچہ نو دمیدہ اپنی تمام رعنائی و شگفتگی کو سمیٹ کر گوش و ہوش کے پردوں پر اپنا عکس منتقل کر رہا ہے جس سے ایک سرخوشی کی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ وہ موضوع کے تمام جزئیات کی اس طرح تفہیم کر دیتے تھے کہ اب کسی کتاب کے پڑھنے کی حاجت نہیں رہتی تھی۔ ہم اس زمانے میں علامہ اقبال کے تعلق سے نٹشے (Friedrich Wilhelm Neitzsche)، گوئٹے (Goeth) اور دانتے (Danthe) وغیرہ کو پڑھنے کی کوشش میں تھے چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے کئی نشستوں میں ان پر ہمیں لیکچر دیے، دانتے کی ''طربیۂ خداوندی'' (Divine Comedy) کو اِس وضاحت سے سمجھایا کہ ان کی قابلیت کا سکہ ہمارے دل و دماغ پر بیٹھ گیا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ پروفیسر احمد علی صاحب ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ شاید اس تعلق سے وہ ترقّی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اشتراکیت کا رنگ ان پر بہت گہرا تھا۔ دین دار طبقے سے تو بیزار ہی نہیں تھے نفرت کرتے تھے۔ ناول نگار ہونے کے سبب کردار نگاری کا بڑا سلیقہ تھا۔ زبان و بیان پر ایسی قدرت تھی کہ کرداروں میں جیسا چاہیں رنگ بھر دیں۔ انھوں نے بعض شخصیتوں کے بڑے ہی مؤثر انداز میں خاکے اڑائے ہیں اور مخالفین پر دشنام طرازی سے بھی باز نہیں آئے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب سے تو غالباً مجبوری کے درجے میں ملتے تھے اور یوں بھی احتیاط برتتے ہوں گے کہ یونیورسٹی کا ہر چھوٹا بڑا ڈاکٹر صاحب قبلہ کی بہت تکریم و تعظیم کرتا تھا۔ مجھ ناچیز کو پتا نہیں کیسے برداشت کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں نے پہلے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا تھا۔ بعد میں شعبۂ اردو میں منتقل ہو کر آ گیا تو صرف اتنا ہی کہا کہ کام کا بچہ خراب ہو گیا۔ ان کی ساری توجہ اور کوشش یہ تھی کہ میں بھی انھیں کے نظریات کا حامل ہو جاؤں۔

میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی خاص نظریہ تھا ان کے نام کے آگے فاروقی کی نسبت لگی ہوئی تھی۔ ان کے جدِ اعلیٰ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں قاضی القضاۃ کے

عہدے پر مامور تھے۔ اورنگ زیب نے خود ایک مکتوب میں ان کے بارے میں لکھا ہے: "یارِ دیرینہ ماست۔" لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو کبھی اثنا عشری کہتے تھے، کبھی کمیونسٹ ہو جاتے تھے۔ ان کا کوئی دین ایمان نہیں تھا۔ آدمی مگر بڑے خلیق تھے۔ سادہ اور سچے، کھری بات کہنے والے بغیر کسی کی رُو رعایت کیے، مصلحت پسندی کا یوں سمجھیے انھیں ادراک ہی نہیں تھا۔ جو تھے جیسے تھے سب کے سامنے تھے۔ سندھ یونیورسٹی سے ناراض ہو کر سکھر چلے گئے بعد میں پروفیسر کرّار حسین صاحب کے بلانے پر بلوچستان یونیورسٹی چلے گئے۔

میں نے ۱۹۷۱ء میں حیدر آباد سے ایک سلسلے وار ادبی رسالہ "کاوش" نکالا۔ اس میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب و شعراء کو، جو اشتراکی نظریات کے حامل تھے، تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ رسالہ میں اکثر اہلِ علم کو بھیجا کرتا تھا، مگر کبھی ڈاکٹر صاحب کو نہیں بھیجا اس خیال سے کہ انھیں میرے نظریات جان کر دکھ ہوگا۔ یہ محض میرا خیال تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو گیا، اور انھوں نے شکوہ کیا فرمانے لگے، آپ نے ہمیں پرچہ نہیں بھیجا تو کیا ہمیں معلوم نہیں ہوا۔ آپ نے ہمیں بہت غلط سمجھا۔ ہم آپ کی کاوشوں کو دیکھ کر خوش ہی ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کی حرکتیں عجیب عجیب تھیں۔ ایک روز ہم یونیورسٹی کے مین گیٹ پر کھڑے تھے۔ دور سے ایک گدھا گاڑی پر ڈاکٹر صاحب جیسی شکل کے ایک صاحب بیٹھے نظر آئے، میں نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا ہی تھا کہ اتنے میں گدھا گاڑی آ کر ہمارے سامنے رک گئی۔ دیکھا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ ہم سب لپکے۔ ڈاکٹر صاحب کو اتارا۔ گدھا گاڑی والے نے ہم سب کو ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کہتے سنا تو اس کی گردن اکڑ گئی، سینہ پھول گیا۔ وہ بھی شاید اپنے عظیم تر ہونے پر ناز کرنے لگا۔ ہم نے پیسے دیے تو نہیں لیے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پورے شہر میں بلیک آؤٹ رہتا، لیکن ڈاکٹر صاحب لالٹین کی روشنی میں لکھنے میں مصروف رہتے۔ روشن دان سے چھنتی ہوئی روشنی محلّے کے بچّوں نے جو دیکھی، بے محابا پتھراؤ کر دیا۔ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب نے لالٹین بجھا دی۔ بعد میں پھر وہی سلسلہ شروع، مگر اس اہتمام سے کہ کوئی کرن باہر نہ جائے۔

ایک مرتبہ مجھے دیوانِ حافظ کا ایک عمدہ نسخہ مکتبہ نظامی کانپور کا چھپا ہوا مل گیا۔ میں خرید

کر یونیورسٹی آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا، ''دیوانِ حافظ۔'' فرمانے لگے، ''ہم نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے کہا کہ ہمیں دیوانِ حافظ لا دیجیے۔ کہتے ہیں کہ اس کو پڑھنے والا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ بھائی صاحب نے فرمایا، تمھیں پڑھنے کی کیا ضرورت۔ تم تو پہلے ہی سے دیوانے ہو۔''

ڈاکٹر صاحب سے ہمارا تعلق آخر تک رہا۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں لیکچرر ہو کر گیا، اس وقت ڈاکٹر صاحب بلوچستان یونیورسٹی ہی میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب میرے تقرّر سے بہت خوش ہوئے۔ جب کبھی وہ کراچی سے کوئٹہ جاتے تو مجھے خط کے ذریعے اپنا پروگرام بتا دیتے۔ میں اور پروفیسر عزیز الدّین صاحب جوان کے پرانے شاگرد تھے اسٹیشن پر پہنچ جاتے اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات رہتی۔ ڈاکٹر صاحب وہی اپنے برانڈ اوکے کی سگریٹ آفر کرتے۔ پہلے تو عزیز بھائی جھجکے، مگر ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر پینے لگے۔ یاد آتے ہیں۔ بہت ہی اچھے، بہت ہی صاحبِ علم آدمی تھے۔ پڑھانے والے تو اب بھی مل جائیں گے، مگر ویسے لوگ نہیں مل سکتے۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی طلبہ کے نام کر دی تھی۔ وہ وسیع العلم، کثیر الحلم، خلوص کا پیکر اور ہمدردی کے جذبات سے لب ریز تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں رہے، ختم ہوئے۔

یا الٰہی عاقبت محمود باد

☆☆☆

پروفیسر عزیز الدّین

(۱۹۹۵ء۔۱۹۲۹ء)

ٹہنی سے ایک پھول کی پتّی بھی جب گری
اُس کے قدم کی چاپ کا دھوکا ہوا مجھے

وہ پھول ہی تو تھے رنگ، خوشبو اور لطافت کا مجموعہ کہ جس کی خوشبو فضا کو معطر رکھتی ہے، جس کا رنگ ڈھنگ نظروں میں ایسا سما جاتا ہے کہ اس کے آگے ہر رنگ پھیکا نظر آتا ہے۔ اس کی لطافت لطیف احساسات کو مہمیز دیتی ہے۔ یہ تھے پروفیسر عزیز الدّین صاحب۔ سرخ و سپید، موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، موٹے بہت، بجنور یو پی کے رہنے تھے، لڑکپن بھوپال میں گزرا، بعد میں اندور آ گئے اور وہاں ہلکر کالج سے بی اے کیا، قیام پاکستان کے بعد اردو کالج کراچی سے فارسی میں ایم اے اوّل بدرجہ اوّل پاس کیا، اس کے بعد انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے کہ ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہو گیا ۱۹۷۳ء میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی، خوش قسمتی سے میں بھی اسی محلّے میں قیام پذیر ہوا جس میں وہ رہتے تھے۔

عزیز بھائی روزانہ سائیکل پر کالج جایا کرتے تھے، واپسی پر میں ان کے ساتھ پیدل ہوتا، اکثر پروفیسر شریف صاحب بھی ساتھ ہوتے؛ اس طرح ہم باتیں کرتے کرتے گھر آ جاتے۔ پہلے تو میں قاری اسعد حسن خاں صاحب کے پاس رہتا تھا بعد میں جب الگ جا کر رہ گیا تو اکثر دوپہر میں بھی عزیز بھائی آ جاتے اور شام چار بجے اپنے گھر جاتے۔ پھر رات دس بجے آ جاتے اور پھر یہ محفل ایک دو بجے اختتام کو پہنچتی۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے:

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھا

کہتے تھے، اداسائیں! جتنا وقت ہم دونوں ساتھ گزارتے ہیں، بیوی کے ساتھ بھی اتنا وقت نہیں گزرتا۔ دنیا جہان کے قصے، کہیں زندگی کے مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں تو کہیں لوگوں کے رویّوں پر اظہارِ خیال ہو رہا ہے، کبھی سیاست موضوعِ بحث ہے تو کبھی اخبارات کی نت نئی چونکا دینے والی سرخیوں پر دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں، شاعری کا قصہ چھڑ گیا ہے تو اب فارسی و اردو شاعری کے تناظر میں جدید دور کی آزاد شاعری پر تنقید ہو رہی ہے، قدیم شاعری کو سراہا جا رہا ہے۔ سعدی و حافظ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو فیضی و عرفی کے بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں، میر و مرزا ہوں کہ غالب و مومن سب ہی پر بے محابا گفتگو ہوتی تھی اور اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے ہمارا علمی مذاق نہیں ہے بس سطحی سا علم رکھتے ہیں، اگر کبھی علمی ذوق تھا بھی تو یہاں لاڑکانہ آ کر وہ بھی ختم ہو گیا۔ بس محنت کر کے پڑھا دیتے ہیں اللہ عزّت رکھ لیتا ہے۔ یہ ان کی کثرِ نفسی تھی۔ ایک مرتبہ میں مثنوی مولانا روم کی شرحِ ملاّ بحر العلوم حیدرآباد سے لے آیا۔ عزیز بھائی کو جوش چڑھا، کہنے لگے، ساتھ ہی بیٹھ کر پڑھیں گے۔ ایک دن پڑھنے بیٹھے بمشکل تمام پہلا ہی صفحہ پڑھا ہوگا کہ عزیز بھائی نے کتاب بند کر دی کہنے لگے، ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے اس قسم کی کتابیں تو علماء ہی پڑھا سکتے ہیں ہمارے بس کی بات نہیں۔ ریاضؔ خیرآبادی کے شعر کو یہاں میں ذرا سے تصرّف سے پڑھتا ہوں:

بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن
ریاضؔ آپ کو بس ہمیں جانتے ہیں

عزیز بھائی بڑے ہمدرد، بڑے مخلص، بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن آدمی تھے، جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا تھا، منافقانہ رویّوں سے سخت نفرت کرتے تھے، زندگی کی تلخیوں سے بہت سابقہ پڑا تھا اس لیے اچھے برے کی خوب تمیز پیدا ہو گئی تھی، دوست دشمن کے رویّوں کو خوب پہچانتے تھے، مگر اکثر جانتے ہوئے بھی ان باتوں کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ جس سے تعلّق پیدا ہو جاتا ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرتے بس شرافت کا پتلا تھے، مذہبی غیرت و حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس میں وہ کسی بھی قسم کا سمجھوتا نہیں

کرتے تھے، کبھی تو شدّتِ جذبات سے مغلوب ہوکر حدود وقیود سے تجاوز کر جاتے، سب کچھ کہہ گزرتے، طبعی شرافت مانع آجاتی ورنہ وہ تو ہاتھا پائی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لوگ ان کی اس ذہنی کیفیت سے واقف تھے اس لیے ان کے سامنے مذہبی موضوعات پر سنبھل کر گفتگو کرتے تھے، وہ قیام پاکستان کے وقت مختلف دفاتر میں ملازمت کر چکے تھے اس لیے انگریزی زبان میں ہر قسم کی خط و کتابت کا انھیں گہرا شعور تھا، چناں چہ پرنسپل سے لے کر مجھ ناچیز تک ہر ایک کے لیے وہی دفتری خطوط لکھتے، ان کے جوابات دیتے۔ ان کی اس صلاحیت کا ہر کوئی معترف اور ان کے خلوص ومحبت کا ہر کوئی گرویدہ تھا۔

عزیز بھائی سے تعلّق اس قدر گہرا ہو گیا کہ بھائیوں کے سے رویّے میں ڈھل گیا۔ عمر میں تو وہ مجھ سے بہت بڑے تھے اس لیے میں ان کا ہمیشہ احترام ہی کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ کہتے بھی ہم دوست ہیں بھائی ہیں، ہمارے درمیان تکلّف روا نہیں۔ وہ جیسے باہر تھے گھر میں بھی ویسے ہی تھے بھابی صاحبہ بھی نباتیات کی لیکچرر تھیں۔ ان سے بہت محبت کرتے تھے، ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کے سامنے محبت کا اظہار کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں ہمارے سامنے ضرور اس کا اظہار کرتے تھے۔ بھابی صاحبہ کو سگریٹ کا دھواں ناگوار ہوتا تھا اس لیے ان کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ وہ اوّل رات نو دس بجے سونے کی عادی تھیں اس کا بھی انھیں خیال رہتا، اس وقت وہ کسی قسم کا شور پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی چار بچّیاں تھیں: صالحہ صدیقہ، فوزیہ صدیقہ، شاذیہ صدیقہ اور فاطمہ صدیقہ۔ صالحہ، فوزیہ تو بہت ہی چھوٹی تھیں، شازیہ اور فاطمہ تو میرے سامنے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ یہ بچّیاں میری گودوں میں کھیلی ہیں۔ میں عصر کے بعد ان کے گھر جاتا بچّیاں ''چچّا جان، چچّا جان'' کہتی ہوئی مرے گرد جمع ہو جاتیں اور اپنی عقل و شعور کے مطابق طرح طرح کے سوالات کرتیں، طرح طرح کی فرمائشیں۔ یہ ہم دونوں کا تعلّق ہی تو تھا کہ گھر کے ناسمجھ بچّے بھی مجھ سے محبت کرتے تھے بلکہ مجھ کو حقیقی معنی میں اپنا چچا ہی جانتے تھے۔

عزیز بھائی نے ایک طویل عرصہ لاڑکانے میں گزارا وہاں پرنسپل بھی رہے۔ پھر وہاں سے منتقل ہوکر اسلامیہ کالج کراچی آ گئے، پروفیسر حفیظ خاں صاحب ان کے ہندوستان کے

ساتھی تھے وہ بھی کراچی منتقل ہو گئے تھے، اب میں رہ گیا تھا۔ میں لاڑکانے سے حیدرآباد آ گیا تھا، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جلد ہی میں بھی کراچی آ گیا، دستگیر کالونی میں رہائش پذیر ہوا، عزیز بھائی روزانہ میرے یہاں آتے، وہ گلشن اقبال میں رہتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ ہم تینوں قریب قریب ہو جائیں، یہ ان کی غیر معمولی کشش تھی کہ حفیظ صاحب اور میں ان کے قریب ہی گلشن اقبال میں آ کر آباد ہو گئے، میں نے ان کے قریب ہی فلیٹ لے لیا صرف دو گلیوں کا فاصلہ تھا۔ اب پھر وہی محفلیں جمنے لگیں۔ میں روزانہ رات کو جاتا اور دیر تک محفل جمتی۔ اگر کبھی دو ر چار دن نہ جاتا تو ان کی طبیعت مکدر ہو جاتی، گھر میں چڑ چڑے پن کا مظاہرہ کرتے۔ بھابی صاحبہ ایک روز مجھ سے کہنے لگیں کہ آپ ضرور تشریف لایا کریں۔ آپ جب نہیں آتے ہیں تو ان کا موڈ خراب رہتا ہے اور جب تک نہیں آتے یہی کیفیت برقرار رہتی ہے جب آ جاتے ہیں تو مزاج شگفتہ و شاداں ہو جاتا ہے۔ جب ہم دونوں تنہا ہوتے تو اور باتوں کے ساتھ خاندانی حالات پر بھی بات نکل آتی شاید میں وہ واحد آدمی تھا جس کو تمام باتیں کھل کر بتاتے تھے:

دل کے قصّے کہاں نہیں ہوتے
ہاں، وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

ان کے حالات سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بلا کا تحمل تھا، قوت برداشت ایسی تھی کہ ہر صفت اس کے آگے ماند تھی۔ لوگوں نے کیسے کیسے چرکے لگائے، کیسی کیسی ذہنی اذیتوں میں مبتلا رکھا، جس کے ساتھ بھلائی کی وہی دشمن ہوا، مگر وہ صبر و ضبط سے کام لیتے رہے، ایسا صبر ایسا تحمل تو صرف اللہ کے خاص بندوں کے ہاں ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ شخصیت کے یہی پہلو تو ہوتے ہیں جن کے مطالعے سے کردار سازی میں مدد ملتی ہے۔ عربی کی یہ مثل الاقارب کا لعقارب (عزیز و اقارب بچھوؤں کی طرح ہیں) بڑی معنیٰ خیز ہے۔ ہر جانور، جو بھی حملہ آور ہوتا ہے، اس میں اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی حملے کے خوف سے حملہ آور ہوتا ہے، کبھی اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے، کبھی حصولِ لذّت کے لیے کاٹتا ہے، مگر بچھو کو ڈنک مارنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ عادتاً ڈنک مارتا ہے اسی لیے نیشِ عقرب مشہور ہے:

نیشِ عقرب نہ از پئے کینست
مقتضائے طبیعتش اینست

مجھ پر وہ بہت اعتماد کرتے تھے، ہر قدم مجھ ہی سے مشورہ لیتے تھے۔ اچھی بری، ہر بات مجھے بتاتے تھے۔ اپنی بچیوں سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ دنیا میں سوائے چچا جان کے کسی پر اعتماد نہ کرنا۔ میں بھی ہر مسئلہ انھیں کے سامنے پیش کرتا، وہ اس کا نہایت شریفانہ اور قابل عمل حل بتاتے۔ فراست ایسی تھی کہ ہر موقع پر ان کے مشورے کے مطابق عمل کر کے فائدہ ہی ہوا۔ ایسا شخص جس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہوں، اپنے پرائے سب کے رویوں کا ادراک رکھتا ہو، چھوٹے بڑے سب کی نفسی کیفیات سے واقف ہو پھر مخلص و ہمدرد بھی ہو تو یقیناً اس کے مشورے سود مند ثابت ہوں گے، مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، ملتے کہاں ہیں اور جن کو مل جائیں تو وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کریں۔

عزیز بھائی کی شخصیت کا ایک ہی رخ تھا، وہ سب کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ ان کو اللہ نے صرف بیٹیاں ہی دی تھیں، بیٹوں کی کیسے آرزو نہیں ہوتی۔ انبیا علیہم السلام نے بیٹوں ہی کے لیے دعا مانگی تھی۔ عزیز بھائی تو بس راضی برضائے الٰہی تھے۔ انھوں نے کبھی اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بیٹیوں پر جان چھڑکتے تھے، انھوں نے ان کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ الحمد للہ ان میں تین تو ڈاکٹر ہیں ایک ایم ایس سی اور کمپیوٹر انجینیئر کی ڈگری لیے ہوئے ہے۔ بچیاں جوان ہو جائیں تو ہر ماں باپ کو شادی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اس فکر میں وہ ایسے بے صبرے ہو جاتے ہیں کہ ہر ایک کے سامنے نہایت شد و مد سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ سننے والا بیزار ہونے لگتا ہے، مگر عزیز بھائی کو اللہ کی ذات پر ایسا کامل بھروسا تھا کہ وہ اس کا کسی سے اظہار نہیں کرتے تھے مجھے ہی فکر تھی، میں ہی کبھی کبھی دعائیہ کلمات سے اس کا اظہار کرتا تو فرماتے، ادا سائیں! جب اللہ کو منظور ہوگا ہو جائے گا۔ یہ اس کا کام ہے ہم کیوں فکر کریں۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ بڑی بچی ڈاکٹر صالحہ صدیقہ کے لیے پیغام آیا۔ مجھ سے فرمانے لگے، آپ ہی کو کرنا ہے آپ خوب اچھی طرح سے [illegible] کروں گا جو آپ کہیں گے۔ میں نے کہا، آپ اپنے عزیز و

اقارب سے مشورہ کرلیں۔ فرمانے لگے، آپ سے بڑھ کر میرا کوئی عزیز نہیں ہے البتہ آپ فضل اللہ کاظمی صاحب سے مشورہ کرلیں۔ فضل اللہ کاظمی نیشنل بینک میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔ عزیز بھائی کے پرانے دوست تھے ہم دونوں نے مل کر باہم مشورے سے شادی طے کردی۔ بعد میں دوسری بیٹی ڈاکٹر فوزیہ کا نکاح اپنی زندگی میں کر گئے تھے۔ رخصتی باقی تھی، میں نے اور بھابی صاحبہ نے مل کر یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کے بعد بھابی صاحبہ نے مجھ پر بڑا اعتماد کیا اور ہم دونوں نے مل کر بقیہ دونوں بچیوں کی شادی کردی۔ عزیز بھائی اکثر فرماتے تھے: اداسائیں! آپ کی ایک بیٹی نہیں پانچ بیٹیاں ہیں۔ اللہ گواہ ہے کہ میں ان کو اپنی حقیقی بیٹیاں ہی سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی صلبی بیٹی سمیہ سے کہہ رکھا ہے کہ یہ چاروں میرے لیے تجھ سے مقدم ہیں، تُو جب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی یہ اس وقت میری گود میں تھیں۔ یہ چاروں بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہیں، امریکا چلی گئی ہیں، بہت دور ہوگئی ہیں، مگر دل میں اب تک سمائی ہوئی ہیں۔ میں ان کے ٹیلی فون کا انتظار کرتا ہوں اور جب بات ہو جاتی ہے تو دل یک گونہ فرحت و انبساط کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں جاتا کہ میں ان کے لیے دعا نہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر بلا، ہر مصیبت، ہر آفت سے محفوظ رکھے، ان کے شوہروں کے دلوں میں ان کی محبت کو فراواں کردے۔ ان کے بچوں کو صحت و سلامتی سے پروان چڑھائے، ان کو ہر نعمت سے سرفراز فرمائے، دنیا آخرت دونوں جہانوں میں سرخرو فرمائے اور انھیں توفیق دے کہ وہ اپنے علم سے انسانیت کی خدمت کریں۔ آمین۔

عزیز بھائی کوئی بہت دین دار آدمی نہیں تھے، لیکن دین سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور دینی امور کو انجام دینے کی ہر ممکن سعی فرماتے تھے۔ لاڑکانے سے لے کر یہاں کراچی تک جمعے کی نماز ہم دونوں ساتھ ہی پڑھتے تھے، حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو بھی جاتی تھی، مگر حقوق العباد کی ادائیگی کا بڑا خیال رکھتے تھے، مجھے یاد ہے کسی کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے حسن خلق سے پیش آتے۔ کالج کے چپراسی سے لے کر ہر ایک کو سلام کرتے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے یہ تمام باتیں دین کی نہیں ہیں تو پھر اور کس کی ہیں۔ آخر میں کلمۂ طیبہ اور درود شریف کا کثرت سے ورد کرنے لگے تھے۔

وقت جب آخر ہونے لگتا ہے تو یا ک باز لوگوں کو احساس ہونے لگتا ہے ان سے ایسے اعمال صادر ہونے لگتے ہیں کہ گویا انھیں علم ہے کہ اب ان کا آخری وقت آیا چاہتا ہے۔ ایسے صدہا واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔ عزیز بھائی کو بھی غالباً احساس ہو گیا تھا کہ اب وقت موعود آ پہنچا ہے۔ سمیہ اس وقت انٹر میں پڑھتی تھی عزیز بھائی اسے انگریزی پڑھاتے تھے ایک روز کہنے لگے، میں جلد از جلد اس کا کورس ختم کرا دینا چاہتا ہوں۔ اب زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ میں نے کہا، ایسی بھی کیا بات ہے اللہ تعالیٰ آپ کو قائم دائم رکھے۔ ابھی تو بچیوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں اللہ آپ کو ان کی خوشیاں دکھائے۔ میں کہے جارہا تھا اور ان کی کیفیت بدلتی جارہی تھی یہاں تک کہ میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ عزیز بھائی کی آنکھوں میں آنسو تو میں نہ دیکھ سکا البتہ ان کی کیفیت دیکھ کر ان کے کرب کا اندازہ لگا لیا۔

آخری زمانے میں ان کا معمول تھا روزانہ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کی کلینک پر آتے باتیں کرتے رہتے جب کلینک بند ہو جاتی تو گھر چلے جاتے۔ دس گیارہ بجے میں اپنے کام سے فارغ ہو کر ان کے ہاں چلا جاتا رات گئے تک محفل جمی رہتی مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ زندگی کی آخری ملاقاتیں ثابت ہوں گی۔ ذیابیطس کے مریض تو تھے ہی، لیکن خطرناک حد تک نہیں، پرہیز بھی خوب کرتے تھے۔ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی چلے جائیں گے ایک دن پہلے ملاقات ہوئی تھی۔

۱۸ رنومبر ۱۹۹۵ء کو بعد عصر طبیعت خراب ہوئی بھابی صاحبہ اور ڈاکٹر فوزیہ رب میڈیکل ہسپتال لے گئیں ڈاکٹروں نے آکسیجن لگائی، لیکن وقت تو آ چکا تھا، موت کو تو بہانہ چاہیے۔ ڈاکٹروں نے دوسری منزل پر منتقل کرنے کے لیے آکسیجن ہٹائی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں پڑھانے گیا ہوا تھا میرے بیٹے کی سالگرہ کا دن تھا خیال تھا کہ گھر آ کر بیٹے کو لے جاؤں گا اور کیک وغیرہ دلوا لاؤں گا، مگر جب گھر آیا تو اہلیہ نے نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیغام دیا کہ بھابی صاحبہ نے فوراً بلایا ہے اور خود بھی میرے ساتھ ہو لیں۔ بس کیا تھا پہنچا تو عزیز بھائی کا جسد خاکی رکھا ہوا تھا اور باطن میں مجھ سے کہہ رہے تھے اداسائیں! آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعون، اَللّٰھُمَّ

اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ۔

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ! ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

اے کہ تُو نظروں سے غائب ہے، مگر دل کا ہم نشیں ہے میں تجھے دعا دیتا ہوں اور تیری تعریف بیان کرتا ہوں۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

(حافظ)



پروفیسر محمد شریف

(۱۹۲۵ء۔۲۰۰۶ء)

شریف الشرفاء، سیّد الاشراف، ابواشرف، پروفیسر محمد شریف صدر شعبۂ تاریخ اسلامی و غیر اسلامی۔ گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں رہے، وہیں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ درمیانہ قد، کہتے ہیں کہ بہت موٹے تھے، ہم نے جب دیکھا تو مٹاپا کم ہوگیا تھا۔ جسم قدرے ڈھیلا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی موٹے تھے۔ ایک مرتبہ سخاوت کا جوش چڑھا ایک بوڑھے فقیر کو جیب سے نکال کر ایک روپیہ دیا۔ اس نے سندھی میں دعا دی، ''اللہ تو کھے گنج ڈے''، یعنی اللہ تجھے خزانہ عطا کرے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، کہنے لگے، اللہ نے اِتنی تو گنج دے رکھی ہے کہ بس جھالر ہی رہ گئی ہے اور تُو دعا بھی یہی دے رہا ہے اللہ تیرا بھلا کرے۔ بڑے مرنجان و مرنج قسم کے آدمی تھے۔ طبیعت میں حد درجے مزاح تھا جس میں طنز کی کاٹ بھی ہوتی تھی اور کوئی موقع مزاح کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اس لیے ذرا سی بھی کمزوری ہوتو لوگ کترا کر نکل جانے میں عافیت سمجھتے تھے۔

۱۹۷۳ء میں جب پہلی مرتبہ میں گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں پروانۂ تقرّری لے کر پہنچا تو پرنسپل ڈاکٹر شبیہ حیدر رضوی صاحب کے ساتھ یہ بھی بیٹھے تھے، ہیئت کذائی سے تو مجھے قطعاً پروفیسر نہیں معلوم ہوئے، البتہ گفتگو سے میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی پروفیسر ہی ہیں۔ میں جتنی دیر ڈاکٹر رضوی صاحب سے گفتگو کرتا رہا۔ بڑے غور سے مجھے دیکھتے رہے اور اوپر سے نیچے تک جائزہ لیتے رہے شاید اندازہ کررہے تھے کہ یہ نیا دانہ کس مزاج اور کس قبیل کا ہے۔ یہ الفاظ بھی اور یہ اندازِ گفتگو بھی انھیں کی صحبت میں ہم نے سیکھا تھا۔ چناں چہ بے ساختہ قلم سے نکل گیا۔ وہ بھی مجھ سے کچھ نہ بولے اور میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ جب دفتری کارروائی مکمل ہوگئی

،حاضری کے رجسٹر پر میرا نام لکھ دیا گیا تو پروفیسر صاحب نے میری طرف رجسٹر بڑھا کر نہایت بے اعتنائی سے نیم وا آنکھوں میں مزاح آمیز مسکراہٹ پیدا کر کے مجھ سے کہا، لو دستخط کرو اور گورنمنٹ کی دامادی میں داخل ہو جاؤ۔ بس کالج میں یہی ایک کام ہے جو پابندی سے کرنا ہے۔ پھر میرا پورا حسب نسب دریافت کر ڈالا۔ مجھے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ صاحب بہت ہی ہوشیار ہیں، چٹکی میں اڑانے والے۔

شریف صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان پر علی گڑھ کی ایسی چھاپ تھی کہ چھپائے نہیں چھپتی تھی، وہی شوخی و شرارت، وہی طبیعت کا چلبلا پن، وہی ذہانت و ذکاوت ان میں تھی جو علی گڑھ کا طرۂ امتیاز تھا، لیکن اپنی ساری ذہانت وذکاوت، ہنسی مذاق کی نظر کر دی۔ کسی تعمیری مقصد میں استعمال نہیں کی سوائے اس کے کہ لسانی تعصب کے دور میں کالج کی یونین کو سنبھالے رکھا۔ ان کا ذہن ایسا تیز اور حاضر تھا کہ کب کیا وار کر جائیں پتا ہی نہیں چلتا تھا اور کب کس کا مضحکہ اڑادیں اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ محفل میں بھی جب کبھی ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی بے دھڑک ہو جاتے اور ایسے جملے تراشتے کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی اور خود ان پر مسلسل سنجیدگی طاری رہتی۔ اس طرح ہنسنے والا برا بن جاتا۔ اسی لیے میں سنجیدہ محفلوں میں ان سے دور ہی بیٹھتا تھا۔ خاص طور پر اسٹاف میٹنگ یا مذہبی تقریبات میں۔ کتنی ہی بڑی شخصیت ہو قطعاً مرعوب نہیں ہوتے۔ انھیں شخصیت کو اپنے ٹرانس میں لے لینے کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جو ان سے ملتا گرویدہ ہو جاتا۔ کسی کے ساتھ کیسا ہی تضحیک آمیز رویہ اختیار کریں، کیسے ہی کسی پر طنز کے تیرونشتر برسائیں وہ ان کا گرویدہ ہی رہتا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ افراد میں اگر کوئی ان سے سینئر مل جاتا تو اس کا ایسا احترام کرتے جیسے استاد کا احترام کرتے ہیں یا اپنے بڑے بھائی سے جو احترام کا رشتہ ہوتا ہے وہی ان سے ہوتا، لیکن اگر کوئی جونیئر مل جائے تو پھر اپنے سینئر ہونے کا رعب اس پر مسلط کر دیتے۔ اسی کو علی گڑھ یونیورسٹی کی روایت بتلاتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم علی گڑھ میں ہوسٹل میں رہتے تھے، ہمارا سینئر، ہماری ایک ایک حرکات پر نظر رکھتا تھا۔ کہیں بھی جائیں خفیہ آنکھیں ہم پر نگراں رہتیں۔ وہ باپ کی طرح شفیق، بڑے بھائی کی طرح ہمدرد ہوتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر جب ہم اس کی مدد کے طالب ہوتے تو وہ کسی نہ کسی طور

ر ورمد کرتا۔ اس ماحول میں رہ کر یہی مزاج ہمارا بھی ہو گیا۔ اپنے جونیئر سے وہی معاملہ ہوتا
ہمارے سنیئر کا ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر اویس صالح صدیقی فارسی
پروفیسر تھے، وحشی یزدی پر ایران سے ڈی لٹ کیا تھا اب تو مرحوم ہو گئے۔ بڑے سنجیدہ
ج تھے۔ اپنے آپ کو لیے دیے رکھتے تھے۔ ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاڑکانہ میں ہو گیا۔
نے انھیں پروفیسر عزیز الدّین صاحب اور شریف صاحب سے ملایا۔ دونوں اویس صاحب
ہم منصب تھے۔ سینئر جونیئر کا بھی کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ دونوں صاحبان بڑی محبت سے
۔ ڈاکٹر اویس نے فخریہ کہا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں یہ
ہی شریف بھائی کے اس طرح کان کھڑے ہو گئے جیسے نئی آواز پر گائے اپنے کان کھڑے
لیتی ہے۔ شریف بھائی نے نہایت سنجیدگی سے نظریں نیچی کیے پوچھا، آپ کون سے سن میں
گڑھ میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، ۱۹۵۲ء میں مَیں نے ایم اے کیا۔ بس اب کیا تھا
یف بھائی کا تو لب ولہجہ اور انداز ہی بدل گیا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ کبھی آنکھیں
اگلتی نظر آتیں تو کبھی اپنے اندر ساری محبت وشفقت سمیٹے دکھائی دیتیں۔ انھوں نے سنتے
ورا ڈاکٹر اویس صاحب کو اپنی رعب دار آواز میں حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور عزیز بھائی کے
ں پکڑو، ہم تمھارے سینئر ہیں۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر اویس صاحب غیر ارادی طور پر کھڑے ہو
اور عزیز بھائی کے پاؤں پکڑنے کے لیے جھک گئے۔ شریف بھائی کھڑے ہو گئے
ٹر اویس صاحب کو گلے لگایا اور بالکل اس طرح تھپ تھپایا جیسا کوئی اپنے چھوٹے کو شاباشی
ہے بعد میں یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر اویس صالح صدیقی کا لب ولہجہ سعادت مند شاگرد کا سا ہو گیا۔

لاڑکانے کے اطراف و جوانب میں سب ہی شریف بھائی کو جانتے تھے اور ان کا
رام کرتے تھے۔ وہ کالج میں آنے سے پہلے وہاں اسکول میں ٹیچر تھے۔ ریاضی پڑھاتے
۔ ریاضی میں انھیں بہت دعویٰ تھا۔ بعد میں کالج میں آ گئے۔ اس زمانے میں گورنمنٹ
لج لاڑکانہ میں مخلوط تعلیم تھی۔ لڑکے لڑکیاں سب ہی ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ان میں خداداد
احیت تھی کہ جو کوئی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا چناں چہ لڑکے لڑکیوں میں یکساں
ول تھے اور لاڑکانے کے ہر گھر میں ان کی رسائی تھی۔ کھانے کے بہت شوقین، کھانا دیکھتے

ہی ہر قسم کے آداب و قیود سے بے نیاز بس ٹوٹ پڑتے تھے اور کھانے سے پورا پورا انصاف کر کے میزبان کے بڑے ممنون ہوتے، تعریفی جملوں میں آئندہ کی دعوت پر شکر گزاری کے جملے بھی شامل ہوتے گویا میزبان کو مزید ایک دعوت کرنے کا عندیہ بھی دے دیتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک صاحب کی شامت اعمال نے دکھا کھایا شریف بھائی سے میرے متعلق پوچھ بیٹھے۔ شریف بھائی کے کان کھڑے ہوئے وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے ایک دوست کی والدہ نے ہمارے رشتے کے لیے ان سے کہا تھا۔ بس کیا تھا شریف بھائی نے ہماری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ وہ صاحب کہنے لگے، ہماری ان سے ملاقات کرا دیں۔ یہاں ہوٹل میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پی لیں گے اور ملاقات بھی ہو جائے گی۔ شریف بھائی کو اپنی ساری محنت برباد ہوتی نظر آئی تو کہنے لگے، تم پاگل ہو گئے ہو، اتنے اچھے لڑکے کو ہاتھ سے کھوؤ گے۔ چائے نہیں، دعوت کرو۔ تم یہیں ہوٹل میں میرا انتظار کرنا میں انھیں لے کر آتا ہوں۔ اس کو پکا کر کے شریف بھائی میرے پاس آئے۔ مجھ سے کہنے لگے، ایک ادبی دانے سے تمھیں ملوانا ہے۔ جب میں تیار ہو کر نکلنے لگا تو پوچھا، رات کا کھانا کھایا؟ میں نے کہا، ابھی نہیں۔ کہنے لگے، پھر ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا کہ آج پھر شریف بھائی نے کسی کو پھانس لیا۔ غرض ہم ہوٹل پہنچے، وہ صاحب انتظار ہی کر رہے تھے، سلام دعا ہوئی۔ وہ صاحب غالباً ہاتھ دھونے کے لیے اٹھے، شریف بھائی نے بیرے کو اشارے سے بلایا۔ اس سے کہنے لگے، دیکھ میں تکلّف کروں گا، مگر تو کسی قسم کا تکلّف نہ کرنا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ آڈر دینے کا وقت آیا تو ان صاحب نے شریف بھائی سے کہا، آپ ہی بتا دیں۔ شریف بھائی بیرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے، یہ اپنا ہی بچہ ہے۔ جو مناسب سمجھے لے آ! وہ مرغ مسلّم اور الا بلا سب ہی لے آیا۔ شریف بھائی نے خوب ڈٹ کر کھایا اور بار بار مجھے ٹھونکا مارتے تھے اور کہتے جاتے۔ ''دبیں''، یعنی خوب دباؤ۔ بس اب شریف بھائی کو نہ اس سے کوئی مطلب تھا اور نہ مجھ سے۔ اب اسے ان کی کمزوری کہہ لیں یا طبیعت کی شوخی و چلبلا پن، لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں شوخی و شرارت کا عنصر زیادہ تھا۔ ورنہ وہ اتنے گئے

گزرے بھی نہیں تھے۔
شریف بھائی اس دور کے لوگوں میں سے تھے جنھوں نے نئی اسلامی مملکت پاکستان کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ گھر بار سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کی تھی۔ بڑی کسمپرسی کا عالم تھا۔ پورے گھر کا بار اکثر ایک ہی فرد پر تھا۔ یہ بھی اپنے گھر کے بڑے تھے۔ چھوٹے بہن بھائی سب ہی کی کفالت ان کے ذمے تھی اور بلاشبہ انھوں نے اپنی ذمے داری کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ جب ذمے داریوں سے کچھ فارغ ہوئے تو شادی کی۔ اسی لیے اولاد بہت چھوٹی تھی، مگر اللہ نے آج ان کی اولاد کو بھی قابل بنادیا۔ ان میں ڈاکٹر، انجینئر اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ أَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ۔ طلبہ سے بھی ان کا معاملہ بہت اچھا تھا، سندھی ہو یا مہاجر، سب کے ہمدرد تھے، سب کے لیے خطرات مول لینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے، لیکن ان کا معاملہ فہم اور چاق چوبند ذہن ہر خطرے کو بحسن وخوبی ٹال دیا کرتا تھا۔

عشق کو حوصلہ ہے شرط اَرنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

ساری زندگی لاڑکانے میں گزاردی۔ ریٹائر ہونے کے بعد کراچی منتقل ہوئے اور تبلیغ سے وابستہ ہوگئے، اکثر نہایت ذوق وشوق سے تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، تبلیغی جماعت میں باہر جایا کرتے تھے۔ اب کہاں وہ شوخی اور چلبلا پن، کیسی ظرافت، کہاں کا طنز، احباب جن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، جن کو دیکھتے ہی شرارتیں سوجھتی تھیں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، عوارض نے گھیر لیا۔ اب سب ختم ہوگیا:

پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

لیکن خوش مزاجی آخر عمر تک قائم رہی۔ جب بھی ملتے ہلکے پھلکے جملے ہو ہی جاتے تھے۔ ابھی حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ، خلوص ومحبت کا رشتہ آخر آخر تک قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

☆☆☆

پروفیسر محمد عبدالمغنی

(۱۹۰۱ء — ۱۹۸۷ء)

میرے دادا تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے محمد عبدالغنی صاحب، پھر حافظ محمد عبدالکریم صاحب اور پھر محمد عبدالرحیم خاطرؔ (دادا) تھے۔ پروفیسر محمد عبدالمغنی صاحب، محمد عبدالغنی صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے، میری بڑی پھوپھی عائشہ کے شوہر تھے اور میری والدہ کے حقیقی ماموں بھی تھے۔ گورے چٹے، چھریرا بدن، درمیانہ قد، ستواں ناک، مجموعی حیثیت سے جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں ایم اے کیا اور مہاراجا کالج جے پور میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ جب کالج یونیورسٹی بن گیا تو وہ شعبۂ فارسی کے سربراہ ہو گئے اور مدّتوں اسی عہدے پر فائز رہ کر ریٹائر ہوئے۔

ابتدائے جوانی میں تو انگریزی تہذیب و معاشرت کے زیرِ اثر بڑے سوٹڈ بوٹڈ رہتے تھے، سر پر ہیٹ لگاتے، انگریزی بولتے غرض پوری طرح انگریزی تہذیب کا نمائندہ نظر آتے تھے، معلوم ہوتا تھا گویا تازہ تازہ لندن سے آئے ہیں، لیکن بہت جلد یہ رنگ اتر گیا اور اسلام کا ایسا رنگ غالب آیا کہ عابد و زاہد اور شب زندہ دار ہو گئے، اب عبادت و ریاضت میں ان کی زندگی بسر ہونے لگی۔

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی، شرمندگی

اب یہی ان کی زندگی کا منشور ہو گیا کوئی کام ہو، کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو ہر ایک میں عبادت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اب وہ اہل اللہ کی صحبت کو بڑی اہمیت دینے لگے۔ تبلیغ سے خاص شغف ہو گیا۔ خود بھی تبلیغ میں پابندی سے جاتے اور کالج کے طالبِ علموں کو بھی گھیر گھار کر لے جاتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ طالبِ علم دین کا مکمل نمونہ بن جائیں کہ ملّت کا مستقبل

انھیں سے وابستہ ہے۔ پروفیسر کمال الدّین صاحب فزکس کے استاد تھے، باڈی بلڈر بھی تھے، مسٹر حیدرآباد کا انھیں ٹائٹل بھی ملا ہوا تھا۔ گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں ہم نے ان سے بی ایس سی میں فزکس پڑھی تھی۔ آخر میں ڈی جے کالج میں پرنسپل ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ امتحان لینے ایس ایم کالج آئے۔ میں ان سے ملا، تعارف کرایا کہ آپ ہمارے استاد ہیں اور یہ بھی کہ پروفیسر محمد عبدالمغنی صاحب میرے پھوپھا تھے۔ یہ سنتے ہی انھوں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، پہلے ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے، کہنے لگے، یہ سب پروفیسر صاحب کی وجہ سے ہے۔ ہم بھاگتے تھے اور وہ پکڑ پکڑ کر دین کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بحمداللہ آج جو شکل وصورت میں تغیر آیا ہے وہ سب انھیں کی وجہ سے ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

پروفیسر صاحب تہجد گزار آدمی تھے، ہماری پھوپھی بھی ان کی شریک رہتیں۔ دونوں کو ہم نے روزانہ فجر کے بعد اشراق تک وظائف میں مصروف دیکھا ہے۔ اس دوران وہ کسی سے بات تک نہیں کرتے تھے، اگر خلاف معمول کوئی بات نظر آجاتی تو ہوں ہوں کر کے انگلی کے اشارے سے اس کو سمجھاتے، گھر کے افراد تو ان کے اشاروں کو خوب سمجھتے تھے، مگر ہم کہاں ان کے اشاروں کو سمجھ پاتے۔ جب وظائف سے فارغ ہوتے تو فرماتے، میاں تم سے ذراسی بات نہیں سمجھی جاتی۔ شام کو عصر کے بعد یا مغرب کے بعد اسمِ ذات اور کلمۂ طیبہ کا بالجہر ذکر کرتے۔ بڑے دین دار آدمی تھے۔ اسلام کی بے پناہ محبت ان کے دل میں جاگزیں تھی۔ اپنی بڑی لڑکی زہرا کو اس زمانے میں قرآن حفظ کرایا، نتیجہ یہ ہوا کہ زہرا آپا کے بچّے، ڈاکٹر انجینیئر بھی ہوئے اور قرآن حافظ بھی اور اب الحمدللہ ان کے شوہر محمد عبدالتواب صاحب نے جو میری دوسری پھوپھی کے بیٹے ہیں بڑھاپے میں قرآنِ مجید حفظ کرلیا اور زہرا آپا کو قرآن سناتے ہیں، آپا کو اب تک قرآن یاد ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے پروفیسر صاحب اور پھوپھی صاحبہ حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرّف ہوئے، اس زمانے کا حج بڑی مشقت کا ہوتا تھا۔ تمبو ڈیرے، کھانے پینے کا سامان سب ہی ساتھ لے کر جاتے تھے اور پھر بعض جگہ اونٹوں پر سفر کرنا جہاد سے کم نہ تھا اور عورتوں کے لیے جہاد ہی تھا جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

پروفیسر صاحب خاندان میں سب سے بڑے تھے، مگر انھیں عبادت و ریاضت اور پڑھنے پڑھانے کے اور کوئی سروکار ہی نہ تھا اپنے چھوٹے بھائی محمد عبدالخالق سے نالاں تھے کہ ان کا دین سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ والد صاحب ندوہ سے فارغ ہوکر آئے تو ایک مرتبہ پروفیسر صاحب سے کہا، میاں بھائی! ہمیں مثنوی مولانا روم پڑھا دیں، بڑے خوش ہوئے اور پڑھانے لگے، مثنوی میں عربی اشعار بھی ہیں پروفیسر صاحب نے عربی کے اشعار کی تشریح کی تو اس میں عربی قواعد کے اعتبار سے تنقید کی گنجائش نکلتی تھی، والد صاحب نے اس کی نشاندہی کی تو فرمانے لگے، نالائق تو ہماری غلطیاں نکالتا ہے۔ ہمیں ساری زندگی پڑھاتے گزر گیا۔ والد صاحب نے کہا، میاں بھائی! کچھ بھی ہو، غلطی اپنی جگہ ہے۔ دوسرے روز والد صاحب سے کہنے لگے، آغا! تو مجھے عربی پڑھا دے اور انھوں نے مثنوی کے تمام عربی اشعار از سرِ نو پڑھے۔ کیسے اچھے لوگ تھے، ان کے نزدیک حصول علم میں چھوٹے بڑے کی تفریق کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔

وہ بڑے اصول پسند آدمی تھے، اصولوں پر کسی صورت سودا نہیں کرتے تھے اور یہ انھیں گوارا نہیں تھا کہ کسی کی حق تلفی ہو۔ بے جا اسراف کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بہار کالونی میں ایک بہت بڑا مکان بنایا تھا، اپنی زندگی میں تمام اولاد میں تقسیم کر دیا تھا۔ اپنے بڑے لڑکے محمد عبدالقدوس صاحب کی شادی چھوٹے بھائی کی بیٹی سے کی۔ تقسیم کے بعد عرصہ تک یہاں کراچی میں بہت زیادہ موٹر کاریں وغیرہ نہیں تھیں، اور نہ ''رینٹ اے کار'' کا سلسلہ تھا کہ شادی بیاہ کے موقع پر کار کرائے پر حاصل کر لی جاتی، لہٰذا دلہن کو رام سوامی سے ٹیکسی میں لے کر گھر بہار کالونی پہنچے۔ ڈرائیور ایسے میں کچھ زیادہ ہی منہ پھاڑنے لگتے ہیں۔ بھائی محمد عبدالقدوس نے خوشی کے موقع کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ زیادہ ہی پیسے دیے، مگر وہ نہ مانا۔ پروفیسر صاحب شیروانی پہنے بید ہاتھ میں لیے گھر سے نکلے دیکھا کہ تکرار ہو رہی ہے فوراً ہی بید سے دولھا میاں کی پٹائی شروع کر دی، مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ابے تو مردود! تو نے پہلے سے معاملہ کیوں طے نہیں کیا۔ ہم چھوٹے تھے اور حیرت و استعجاب میں کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آخرِ کار ٹیکسی ڈرائیور بھی گھبرا گیا اس نے کاہے کو کبھی دولھا میاں کو پٹتے دیکھا

تھا، کہنے لگا کہ صاحب، جو دینا ہو دے دو آج کے دن تو دولھا کو مت مارو بدشگنی ہے اور پیسے لے کر چپ چاپ چلا گیا۔

ایک مرتبہ ہمارے گھر حیدرآباد تشریف لائے، پھوپھی صاحبہ بھی ساتھ تھیں۔ والد صاحب نے بڑا اکرام کیا۔ دو تین روز قیام کر کے جب واپس ہونے لگے تو والد صاحب نے خاص طور پر قلاقند بنوا کر دیا۔ تانگے میں سوار کرا کے میں اسٹیشن چھوڑنے آیا اتفاقاً قلاقند کا ڈبا تانگے ہی میں رہ گیا، ٹرین کا انتظار تھا کہ انھیں یاد آ گیا اور مارنے کے لیے مجھ پر بید اٹھالی۔ فرمانے لگے، ابے تو مردود! تمھارے ساتھ آنے کا فائدہ کیا ہوا۔ میں نے اسٹیشن سے نکل کر ہر چند اس تانگے والے کو تلاش کیا، مگر وہ نہ ملا۔ بالآخر واپس آ گیا دیکھا وہ اناللہ پڑھتے جاتے تھے اور پلیٹ فارم پر ٹہلتے جاتے تھے۔ خیر ٹرین آ گئی، بیٹھ گئے، فرمانے لگے، اللہ تعالیٰ نے اس کا کھانا تانگے والے کے مقدر میں لکھ رکھا تھا، بھلا ہمیں کیسے نصیب ہوتا۔

پروفیسر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کشادہ دست کیا تھا۔ اس کا وہ اظہار بھی کرتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ نعمت دے تو اس کا اظہار بھی کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس زمانے میں انھوں نے گھوڑا گاڑی رکھ رکھی تھی۔ بہت ہی متواضع تھے۔ چھٹی ہو، کوئی تہوار ہو، خاندان کے افراد کو جمع کرتے اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے ضیافت فرماتے۔ دل کھول کر خرچ کرتے تھے اور خفیہ طور پر نہ معلوم کتنوں کی پرورش کرتے تھے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھوپھی صاحبہ اس خصوصیت میں کچھ زیادہ ہی ان سے آگے تھیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت تھے، خلافت بھی حاصل تھی۔ اکثر وقت ان کی صحبت میں گزارنا چاہتے تھے۔ خاص طور سے رمضان المبارک انھیں کے ساتھ گزارتے تھے اور حضرت کو روزانہ کسی کتاب سے صحابہ یا بزرگانِ دین کے واقعات سناتے تھے۔ حضرت بھی انھیں بہت پسند فرماتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت کے جانشین مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری سے تعلق ہو گیا، مولانا عبدالعزیز صاحب ان کا بہت احترام فرماتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے جب مولانا جامعہ بنوریہ نیوٹاؤن میں قیام پذیر تھے، دسترخوان پر حضرت کی توجہ پروفیسر صاحب کی طرف بہت تھی، بار بار انھیں

کے آگے چیزیں بڑھاتے جاتے تھے۔

ہم عمر کے ہر حصے میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے بڑی شفقت و محبت سے ملے، چھوٹے تھے تو ہماری سمجھ اور دلچسپیوں سے متعلق مزے مزے کی باتیں کرتے، قصے سناتے، حکایتیں بیان کرتے۔ بڑے ہوئے تو علم و ادب سے متعلق گفتگو کرتے۔ میں جب پی ایچ ڈی کر رہا تھا تو بڑی دلچسپی سے میرے مقالے کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی، مآخذات میں کئی کتابوں کی نشان دہی فرمائی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں انھوں نے خاصا مطالعہ کیا تھا اور وہ ابھی تک تازہ تھا۔ انھیں تصنیف و تالیف سے کچھ زیادہ شغف نہیں تھا۔ تاہم انھوں نے ''امدادالسلوک'' کا ترجمہ کیا تھا، نظیری نیشاپوری پر ایک زبردست مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقدہ ایک کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ سنتے ہیں کہ انھیں اپنے مضمون پر بڑا عبور حاصل تھا اور اس طرح پڑھاتے تھے کہ طلبہ کے ذہن میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ میں ادب کا طالبِ علم ہوں جانتا ہوں کہ ادب میں ہر لمحہ لب کشائی کی گنجائش رہتی ہے، کسی بھی عنوان تنقید کا موقع نکالا جا سکتا ہے، لیکن ایک کامل اور ماہرِ فن استاد کے پڑھانے کے بعد اس ادب پارے پر تنقید کی گنجائش نہیں رہتی۔ بلکہ اس پر تنقید کا شافی و وافی جواب دینا آسان ہو جاتا ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات اور ہے۔ ہمارے استاد پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب جب کسی شعر کا مفہوم بتلاتے تو اس کے ایک ایک لفظ کی تحلیل کرتے اور سمجھاتے کہ یہ لفظ ہی شاعر نے کیوں اختیار کیا ہے اس کا اور کوئی مترادف لفظ شاعر کیوں نہیں لایا۔ اس طرح پڑھنے کے بعد تنقید کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

سرھانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

''سخنِ شعراء'' میں مصرعِ اولیٰ اسی طرح ہے۔ جب کہ ''کلیاتِ میرؔ'' اور ''گلشنِ بے خار'' وغیرہ میں شعر اس طرح ہے:

سرھانے میرؔ کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

لیکن پہلا مصرع اس طرح زباں زدِ خاص و عام ہو گیا ہے:

سرھانے میر کے آہستہ بولو

ذرا اِس کی تحلیل کر کے دیکھیے۔ میر کی حالتِ زار کو دیکھ کر ایک غیر شخص درخواست کر رہا ہے اور درخواست بھی کیسے، دبے لفظوں میں کہ بھائی اِس پر رحم کھاؤ، آہستہ بولو، وہ حکم نہیں دے سکتا کہ بے ساختہ کہہ دے، ''کوئی نہ بولو،'' حکم دینے والے کو ایسے مظلومانہ لب و لہجے کی کیا ضرورت اور اپنے حکم کی وضاحت میں کیوں کر کہے: ''ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے'' اور اگر کہا جائے کہ یہ مشورہ ہے تو مشورہ دینے والے کا بھی یہ لب و لہجہ نہیں ہو سکتا۔

انداز ہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''آہستہ بولو'' سے شعر میں رنج و الم اور بے چارگی کی جو صورت مصور ہوتی ہے، وہ میر کی شاعری کا جزوِ لازم ہے۔ خارجی شواہد بے شک اس کے خلاف ہوں، مگر داخلی شہادت اِسی کی مؤید ہے۔

رعب، دبدبہ اور تمکنت تو مرزا رفیع سودا کی شاعری کا مزاج ہے چناں چہ اسی مفہوم کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

اس انداز سے پڑھانا پرانے لوگوں کا ہی کام تھا۔ اب وہ لوگ مفقود ہوئے۔ پروفیسر صاحب بھی اسی طرح پڑھاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں الیاس عشقی بہت معروف ہوئے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی صاحب کی نیکی و شرافت دیدنی تھی۔ ان کا جس وقت انتقال ہوا اس وقت بھی وہ ذکر میں مشغول تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

پروفیسر حشمت اللہ لودھی

(۱۹۲۹ء۔حیات ہیں)

پروفیسر حشمت اللہ لودھی بھاری بھرکم جسم کے ساتھ بھاری بھرکم شخصیت کے بھی مالک ہیں۔ چوڑا چکلا سرخ سپید چہرہ، بال بالکل سفید، سیاہ بال کا نام ونشان تک نہیں، یعنی یک رنگی نمایاں۔ بھلا اس دور میں یک رنگی کہاں۔

اس پر سنہرے فریم کی عینک ان کی شخصیت کو اور بھی زیادہ جاذبِ نظر بنا دیتی ہے۔ رہنے والے تو لکھنؤ کے ہیں، مگر لکھنؤ کے تصنّع اور نزاکت بھرے اطوار ان کو چھو کر بھی نہیں گزرے۔ کھلاڑی رہے اور وہ بھی ہاکی کے، اس لیے اب تک کھلنڈری طبیعت کا کہیں نہ کہیں اظہار ضرور ہوتا رہتا ہے۔ ویسے وہ زندگی کے اَور معاملات میں بڑے سنجیدہ ہیں۔ زندگی کے گھمبیر معاملات کو تو سنجیدگی ہی سے بطریقِ احسن نبٹایا جاسکتا ہے۔ سنجیدگی ہی تو ہے جو نامساعد حالات اور خام و ناپختہ معاملات کو عقل کی لگام لگا کر اپنے مقصود میں ڈھال لیتی ہے۔ اسی کے سہارے غم و اندوہ اور درد و مصیبت کی متکبرانہ شوخیوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ کھلاڑی ہونے کی وجہ سے جسم ان کا تربیت یافتہ تو تھا ہی ذہن بھی ان کا بڑا تربیت یافتہ ہے۔ ذہین ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، ذہن تو اللہ تعالیٰ نے سب کو عطا کیا ہے۔ ذہنی اعمال کی ترتیب وتہذیب کا نام اصل میں ذہانت ہے۔ جو جس قدر اپنے ذہنی اعمال کو منظم و مرتب کرے گا اسی قدر اس کی فکر وتخیل کے دائرے وسیع تر ہوتے جائیں گے اور زندگی کے کُل معاملات میں وہ ان سے استفادہ کر کے اپنے دور کی ممتاز شخصیت بن کر ابھرے گا، البتہ قدرت بعض کو مرتب و منظم ذہن دے کر بھیجتی ہے، لیکن ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں اور ان کا عرصہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر تو کسب ومحنت اور علم و مشاہدے سے ذہن کی تربیت کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ لودھی صاحب نے انھیں ذرائع سے اپنے ذہن کو مرتب و

منظم کیا ہے۔ ہمت و استقلال سے جس کام کو انجام دیا جائے وہ اگر کانٹوں سے پُر ہو تو بھی گل دستہ بن جاتا ہے:

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود، گل دستہ گردد

لودھی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات پروفیسر عزیز الدّین صاحب اور پروفیسر لطیف الزماں خاں کے ذریعے ہوئی، یہ ملاقات غائبانہ تھی۔ لطیف الزماں خاں صاحب ملتان میں انگریزی کے پروفیسر تھے، غالب سے متعلق چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتابیں انھوں نے اپنے کتب خانے کی زینت بنا رکھی ہیں۔ اسی عنوان سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان دونوں حضرات سے لودھی صاحب کا اتنا تذکرہ رہا کہ وہ تعارف کی حد سے آگے نکل کر دوستی کی حدود میں داخل ہوتا چلا گیا۔ سب سے پہلی بالمشافہہ ملاقات ان سے ہماری ۱۹۸۰ء میں ایس ایم سائنس کالج میں ہوئی۔ مجھے ان کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی وہ کالج کے وسیع و عریض میدان میں چند لیکچروں اور پروفیسروں کے درمیان کھڑے تھے۔ میں ان کو پہچان گیا اور کمال یہ ہے کہ وہ مجھے بغیر تعارف کے پہچان گئے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کی ذہانت کی یہ ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج حیدرآباد میں تھا اور کراچی منتقل ہونا چاہتا تھا چناں چہ لودھی صاحب نے اس سلسلے میں میری بڑی مدد کی اور بالآخر میں ایس ایم سائنس کالج میں آ گیا۔ اب لودھی صاحب کا ہمارا روزانہ کا ساتھ، افسری اور ماتحتی کا معاملہ، اب یوں کہیے کہ لودھی صاحب کے جوہر کھلنے والے تھے۔ کھوٹا کھرا سب سامنے آنے والا تھا۔ کہتے ہیں کہ سفر کے دوران آدمی کی شرافت و نجابت کا اندازہ ہوتا ہے اور سفر کر کے ہی آدمی پختہ کار ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

بسیار سفر باید، تا پختہ شود خامے

میں اس میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ اگر شخصیت کو پرکھنا ہو تو اسے ماتحتی کے زمانے میں دیکھو یا افسری کے زمانے میں۔ سارے حسن و قبح کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ظاہر میں نظر آنے والا اپنے تمام باطنی خدوخال کے ابھر کر سامنے آجاتا ہے حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی

سے بچو۔ گویا اب ہم دونوں کا ہی امتحان تھا۔ ہماری خاندانی شرافت ہمارے ذاتی اخلاق و معاملات کھل کر سامنے آنے والے تھے۔ میں لودھی صاحب کے ساتھ محتاط تھا، اس عنوان سے کہ درمیان میں دو بزرگ دوست لطیف الزماں خان اور عزیز بھائی تھے، دوسرے لودھی صاحب کا مجھ پر احسان بھی تھا کہ میرے کراچی تبادلے میں انھوں نے بہت مدد کی تھی، مگر لودھی صاحب کیوں محتاط ہونے لگے۔ لطیف بھائی اور عزیز بھائی ان کے ہم عمر دوست تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بارہ پندرہ سال کی طویل رفاقت میں لودھی صاحب کی شرافت و نجابت دیدنی تھی۔ وہ افسری جتاتے تھے، لیکن افسری کے انداز میں نہیں دوستی کے انداز میں۔ انھوں نے کبھی ہمیں ماتحت نہیں سمجھا، ہمیشہ دوست ہی جانا۔ وہ کام لیتے تھے، کام لینا جانتے تھے، مگر اس طرح کہ کام کرنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے بلکہ اس طرح کہ یہ کام مجھے کرنا ہی ہے، ماتحت کے طور پر نہیں دوست کے طور پر۔ وہ سخت وسست بھی کہتے تھے، مگر ان کے انداز اور لب و لہجے کی مٹھاس ہی تو تھی کہ کبھی ناگوار نہیں ہوا۔ حافظ شیرازی کی زبان میں سنیے:

بدم گفتی و خرسندم، عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکرخا را

اسلامیہ کالج کے ایک پروفیسر لطیف احمد خاں مرحوم میرے استاد ڈاکٹر خان رشید صاحب کے چھوٹے بھائی تھے وہ اکثر لودھی صاحب کی شخصیت کو اس طرح بیان کرتے تھے: He walks like a principal, he talks like a principal اور واقعی پوری شخصیت کا خاکہ اس مختصر سے جملے میں ہے۔

ہم نے لودھی صاحب کو پرنسپل ہی دیکھا ہے۔ اساتذہ، طلبہ، طلبہ کے والدین اور شعبۂ تعلیم کے ادنیٰ ملازم سے لے کر اعلیٰ افسران تک سب سے ان کا واسطہ تھا۔ نت نئے لوگ، نت نئی باتیں، طرح طرح کی موشگافیاں، سب ہی کچھ تو ہوتا تھا، لودھی صاحب نہایت سلیقے سے ہر ایک سے ملتے، ان کے مسائل حل کرتے اور ان کو مطمئن کر دیتے۔ ایک اچھے منتظم کی جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ لودھی صاحب میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ ہم ان کے آفس میں

جاتے۔ کلاس نہیں ہوتی تو اکثر بٹھا لیا کرتے تھے، چائے سے تواضع ہوتی۔ اس دوران دیکھا ہے کہ لوگ آتے اپنے مسائل پیش کرتے لودھی صاحب نہایت خندہ پیشانی سے اس کے مسائل سنتے، حتیٰ المقدور کوشش تو ان کی یہی ہوتی تھی کہ اس کے مسئلے کو حل کر دیں، لیکن اگر ان کے بس کے باہر ہوتا تو نہایت خوب صورت انداز اور خوب صورت الفاظ میں واضح کر دیتے کہ یہ کام وہ نہیں کر سکیں گے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو ٹالا نہیں اور نہ ہی دھوکے میں رکھا۔ جو بات ہوئی صاف صاف بیان کر دی، مگر شیریں و نرم انداز میں، شائستہ و مہذب طریقے سے۔ ممکن ہے میری اس بات سے کسی کو اختلاف ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنے معاملات میں بہت زیادہ جارحانہ رویہ رکھتے ہیں۔ خواہش مند ہوتے ہیں کہ ہمارے کاموں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ بس کام ہوتے ہی چلے جائیں خواہ وہ کام حدود و قیودِ متعینہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور جو کوئی کسی بھی وجہ سے نہ کر سکے تو سب کچھ بھول جاتے ہیں، اختلافات نمایاں ہو جاتے ہیں پھر ہم کسی بھی صورت اسے معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ذہن تو ماؤف ہو جاتا ہے، مگر زبان تیزی سے رواں ہو جاتی ہے طرح طرح کی خامیاں تلاش کر کے ساری عمر انھیں پیٹتے رہتے ہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ لودھی صاحب کے سلسلے میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے۔ ان کی شیریں گفتاری اور شائستہ مزاجی کے سب ہی قائل نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً۔'' (اور لوگوں سے اچھی طرح بات کرو۔) یہ خصوصیت لودھی صاحب نے اپنا رکھی ہے اس طرح ہم ان کے درس میں شریک ہو کر لوگوں کی نفسیات، ان کے معاملات، ان کے مسائل، ان کی ترجیحات وغیرہ سے واقف ہوتے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے جن ہتھیاروں اور اوزار کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی ہمیں ادراک ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی رنگ میں ہوں ان کی ذہانت و ذکاوت چھپی نہیں رہتی اور تاڑنے والے تو یوں بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من اندازِ قدت را می شناسم

عربی کی ایک مثل ہے: ''اِنَّ خَیرُ الفِقۃُ مَاحَضَرَبِہ۔'' (بہترین علم وہ ہے جس کو تو

وقت پر حاضر کر سکے۔) لودھی صاحب اس صفت سے مملو ہیں۔ میں بلاتامّل کہتا ہوں کہ لودھی صاحب کا کمرہ ہم مبتدیوں کے لیے کلاس روم کا درجہ رکھتا تھا۔ زندگی کے عملی رویّوں کا جیسا گہرا شعور ہمیں لودھی صاحب کی صحبت میں حاصل ہوا اور کہیں نہیں ہوا تھا۔ جَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء۔

لودھی صاحب کو ہم نے پڑھاتے ہوئے تو نہیں دیکھا، لیکن جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ بہت عمدہ پڑھاتے تھے۔ اپنے مضمون پر پورا عبور تھا اور مضمون بھی بڑا خوب صورت تھا، نباتیات، یعنی گل بوٹوں کا علم۔ گل بوٹوں کی طرف کس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ قدرت کا سارا حسن تو ان میں سمٹ آیا ہے۔ لطافت ونزاکت، رنگ ونور۔ کون کم بخت ہوگا جس کی طبیعت اس طرف نہ کھنچتی ہوگی۔ جوانی کے زمانے میں یوں بھی شخصیت کا ہر رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہر صفت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ہم نے تو انھیں بڑھاپے میں دیکھا ہے، جب بال سفید ہوگئے تھے۔ اُس وقت بھی کہنے والے کہتے تھے کہ: ''معشوق ملا بھی تو سفید بالوں والا۔''

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عمر کے ہر حصے میں لوگوں کی طبیعت کا میلان ان کی طرف تھا۔ ان کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں سے ان کا تعلّق ہے اور تعلّق بھی رسمی سا نہیں جیسا کہ آج کل ہوتا ہے بلکہ محبت ومودت کا تعلّق کہ روز بروز گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب وہ اس کے ہر غم، ہر خوشی میں برابر کے شریک ہیں اپنے ماتحتوں سے لے کر شہر کے بڑے سے بڑے معزّز لوگ ان کی نظر میں برابر ہیں۔ جو عزّت وہ بڑوں کو دیتے ہیں چھوٹوں کو بھی اسی عزّت وتکریم کا مستحق سمجھتے ہیں۔ وہ انسان ہیں انسانوں کا دکھ درد جانتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ اب جو کچھ ان سے بن پڑتا ہے کرتے ہیں۔ سدا کرتے رہیں، تاحیات اسی طرح لوگوں کے کام آتے رہیں کہ یہی آخرت میں کام آنے والا ہے۔

☆☆☆

تراب گوالیاری

(المتوفی: ۱۹۹۰ء)

''وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلاً ۔'' اور اللہ مدد کے لیے کافی ہے۔ یہ تکیۂ کلام کے طور پر نہیں، البتہ بات بات پر اس کثرت سے تراب گوالیاری صاحب کی زبان پر جاری رہتا تھا کہ تکیۂ کلام کا قائم مقام ہی ہو گیا تھا۔ ہماری ان سے ملاقات مشہود انور صاحب کے توسط سے ہوئی تھی۔ پرانی وضع کے سادہ مزاج، سادہ طبیعت، مسکین صورت انسان تھے۔ حیدر آباد میں ڈپٹی پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے، عربی فارسی اور انگریزی سے خوب واقف تھے۔ مطالعہ بھی وسیع تھا۔ قرآنِ مجید اور تصوف سے گہرا شغف رکھتے تھے، مختلف تفاسیر کا مطالعہ بھی کیا تھا ان میں ابن کثیر اور جلالین کو پسند کرتے تھے۔ مولانا تھانویؒ کی تفسیر اور کلید مثنوی کے بڑے قائل تھے اور دوران گفتگو ان کے مضامین کو اکثر بیان فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ مولانا تھانویؒ بہت بڑے آدمی گزرے ہیں، علم الاسرار سے خوب واقف تھے، بہت ہی لطیف نکتے بیان کرتے تھے۔ ہم کوتاہ علم، آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ علم الاسرار ہے کیا بلا، اور نہ اپنے اکابرین کو اس جھمیلے میں پڑتے ہوئے دیکھا، از قسم علم الاسرار ان سے کوئی بات نہیں سنی۔ وہ تو اس شعر کے مصداق تھے:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو حضرت تھانوی کے عقیدت مند اور دوسری طرف شیخ احمد سرہندی حضرت مجدّد الفِ ثانی کے مخالف، ہم نے کئی مرتبہ اس بحث کو چھیڑنے کی کوشش کی، مگر وہ ہر مرتبہ طرح دے جاتے۔ شاید حضرت مجدّد صاحب سے ہماری عقیدت و محبت کو

دیکھ کر ایسا کرتے ہوں گے۔

تراب صاحب تصوّف کے مداری سلسلے سے وابستہ تھے۔ جس کی نسبت شاہ بدیع الدّین مدار سے ہے۔ حضرت شاہ بدیع الدّین مدار نیرنجات یعنی سحر وافسوں وغیرہ اور کیمیا کے بڑے ماہر تھے۔ جون پور کا سلطان ابراہیم شاہ ان کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ ان کا طریقہ جذب خلائق تھا، عوام النّاس میں ان کی بڑی مقبولیت تھی، لیکن ان کی بے قاعدگیوں کے سبب خواص قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، قاضی شہاب الدّین دولت آبادی سے ان کے بڑے مناظرے ہوئے ہیں۔ عُرس کے موقع پر مکن پور ضلع قنوج میں ہندوستان کے ہر حصّے سے عقیدت مند کثیر تعداد میں لمبے لمبے بانسوں پر رنگا رنگ کپڑے باندھے پا پیادہ مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔ انھیں شاہ مدار کی چھڑیا کہتے ہیں۔ مداری سلسلے میں بعد میں بہت سی غلط غلط باتیں رائج ہوگئیں تھیں مثلاً اس سلسلے کے لوگ خوراک اور پوشاک سے دست کش ہو گئے، لباس کی جگہ بدن پر راکھ ملنے لگے۔ عہد جہاں گیری کے ایک تذکرہ نگار محمد غوثی نے ''گلزارِ ابرار'' میں لکھا ہے:

> برہنگی اور بے حجابی اس گروہ کے مشرب میں دسویں صدی کے آخر نصف میں جوش کے ساتھ پیدا ہوگئی ہے ورنہ بدیع الدّین شاہ مدار کے پُر معرفت زمانے میں رازِ وحدت کے ظاہر کرنے سے نہایت روک ٹوک تھی اور ظاہری شریعت کی مخالفت سے غایت درجے کا خوف دل میں سمایا ہوا تھا۔

شاہ مدار کے سلسلے میں اتنا لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ لوگ مداری سلسلے سے وابستہ افراد کو شعبدہ باز سمجھتے ہیں جن کا شریعت کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تراب صاحب بے شک مداری تھے، جس کا وہ برملا اظہار کرتے تھے، مگر نماز روزے کے پابند تھے۔ کتنے متبع شریعت تھے یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے البتہ کوئی ایسی بات ہم نے نہیں دیکھی جو خلاف شریعت ہو یا مداری سلسلے سے متعلق جو بے قاعدگیاں ہم نے سنی اور پڑھی تھیں وہ بھی دیکھنے میں نہیں آئیں اور نہ کسی نے ان کی طرف اشارہ کیا، اس طرح تراب

صاحب کو دیکھ کر مداری سلسلے کی سنی سنائی باتوں کی از خود نفی ہو جاتی ہے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں گیا نہ معلوم مجھے کیوں خاص طور پر یہ احساس ہوا کہ وہ جذب و سرمستی کی کیفیت میں رہتے ہیں، وہ اپنے عقیدت مندوں کے درمیان ہوش مندانہ گفتگو میں مصروف نظر آ رہے ہیں، مگر بہ باطن ایک بے خودی ہے جس کی حصار میں وہ مقید ہیں اور ہم سے کہہ رہے ہیں۔

دل میں احساسِ جنونِ معتبر رکھتا ہوں میں
بے خبر رہ کر دو عالم کی خبر رکھتا ہوں میں

تراب صاحب کے حلقۂ ارادت میں بہت زیادہ لوگ شامل نہیں تھے، جب بھی ہم ان سے ملنے گئے یہی گنے چنے دس بارہ افراد ان کے گرد نظر آئے، وہ کوئی بہت لمبی چوڑی معرفت آگین تقریر بھی نہیں کرتے تھے اور نہ ذکر و مراقبہ کرتے، البتہ باتوں باتوں میں صوفیانہ نکات کی وضاحت فرما دیتے تھے۔ شاعر تھے سخن سنجی و سخن فہمی کا بہت اعلیٰ ذوق پایا تھا۔ فارسی و اردو کے کثرت سے اشعار یاد تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے فی الفور زبان پر آ جاتے تھے۔ چائے کے بڑے رسیا تھے ایک ہی نشست میں کئی کئی کپ چائے پی لیا کرتے تھے۔ پہلے تو ان کی مجلس جھونپڑی نما چائے خانے میں ہوتی تھی۔ بعد میں وہ ان کے گھر پر منتقل ہو گئی۔

ایک روز میں ان کی خدمت میں گیا دیکھتے ہی یہ مصرع پڑھا:

تو بیا بیا عراقی کہ ز خاصگانِ مائی

پھر فرمانے لگے، ہم ایک جامعۂ عشقیہ قائم کر رہے ہیں۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے اور بڑا انوکھا خیال ہے، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس کا نصاب کیا ہوگا۔ فرمانے لگے، پہلے تو قرآنِ کریم کی تعلیم ہوگی با قاعدہ صرف و نحو کے ساتھ، پھر مثنوی مولانا روم کا درس ہوگا اور اس کے بعد عشق و عاشقی۔ میں نے کہا، حضرت بیچ میں سے حدیث کہاں غائب ہو گئی؟ فرمانے لگے، حدیث پڑھ لی تو پھر عاشقی نہیں کر سکتے، حاضرین سبحان اللہ، الحمد للہ کے نعرے بلند کرنے لگے اور میں صورتِ سوال بنا ان کو دیکھتا رہا۔ میں تو اس زمانے میں کراچی آ گیا اور انھوں نے وہاں جامعۂ عشقیہ کی بنیاد رکھ دی۔ چناں چہ ارتضیٰ عزمی،

مشہود انور اور کئی لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور قرآن سے ان کو خاص شغف پیدا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا انھیں اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

''مرے کو مارے شاہ مدار'' یہ ضرب المثل تو سنی تھی۔ اس کا پس منظر کیا ہے آج تک معلوم نہ ہو سکا، البتہ اس کا ایک عملی مظاہرہ ضرور دیکھنے میں آیا۔ مشہود انور صاحب کے پاؤں میں پھوڑا نکل آیا۔ تراب صاحب نے کوئی پلٹس یا مرہم بنا کر دیا اسی کو مشہود صاحب لگاتے رہے۔ وہ اچھا ہونے کی بجائے اور زیادہ تکلیف دینے لگا۔ ہر چندان کے گھر والوں نے اور دوست احباب نے کہا بھی کہ زخم بڑھ رہا ہے ڈاکٹر کو دکھایئے کہیں ناسور نہ بن جائے، مگر وہ یہی کہتے، وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلاً (اللہ مدد کے لیے کافی ہے۔) ڈپٹی صاحب نے علاج بتا دیا ہے، اب کسی اور علاج کی کیا ضرورت ہے، ان کی تکلیف بڑھتی رہی اور ہم سوچتے رہے کہ مرے کو مارے شاہ مدار کا مطلب اور کیا ہے، مگر اللہ کو تو صحت منظور تھی، زخم مندمل ہو گیا، اور وہ چاق چوبند۔ یہ کرامت تراب صاحب کی تھی یا مشہود صاحب کا یقین۔ واللہ اعلم۔

اللہ اکبر عزاسمہ

توکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا

رسمہ ذرہ بے مقدار محمد عبدالعلیم ندوی غفرلہ تلمیذ والد ماجد محمد عبدالرحیم خاطر

☆☆☆

اَجّا بھیّا

(المتوفیٰ: ۱۹۷۴ء)

بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ خصوصی صلاحیتوں سے نوازا کر بھیجتا ہے پھر وہ کسب و محنت سے ان صلاحیتوں میں جلا بخشتے ہیں اور امر ہو جاتے ہیں۔ فن کوئی بھی ہو بڑی محنت چاہتا ہے، فن کے مبادیات کو سمجھنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے، ساری ساری زندگی فن کی نظر کر دی جاتی ہے تب کہیں جا کر اس میں نکھار آتا ہے اور فن کار پھر بھی اپنے آپ کو مبتدی ہی خیال کرتا ہے اور یہی نکتہ فن کی ترقّی کا باعث ہوتا ہے۔ فن کار جب کوئی فن پارا تخلیق کرتا ہے تو اس کی نوک پلک سنوارنے میں ایک طویل عرصہ مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اپنے خونِ جگر سے فن پارے کو کھیتی کی طرح سینچتا ہے پھر لطف کی بات یہ ہے کہ بعض کو تو شہرت نصیب ہو جاتی ہے اور بعض گمنامی کی زندگی گزار کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

حافظ اَجّا بھیّا نام تو معلوم نہیں البتہ اسی سے مشہور ہوئے، جے پور کے رہنے والے تھے۔ جے پور ''گلابی شہر'' یا ''بھارت کا پیرس'' مشہور تھا اور ساتھ ہی ساتھ جواہرات کے کام کے لیے بھی پورے ہندوستان میں پہچانا جاتا تھا۔ حافظ اَجّا بھیّا جواہرات کا کام کرتے تھے اور اس فن کے پورے جے پور میں استاد مانے جاتے تھے۔ جے پور سے باہر بھی ان کی شہرت تھی۔ جواہرات میں لعل، زمرد، نیلم، پکھراج اور ہیرا وغیرہ بہت سی قسمیں ہیں جو اپنے رنگ، چمک دمک کے سبب بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ جب وہ کانوں سے نکلتے ہیں تو ان کی کوئی شکل و ہیئت نہیں ہوتی یہاں تک کہ رنگ پر بھی مٹیالا پن غالب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان کہیں کہیں ہوتا ہے اردگرد کے مٹّی آمیز پتھر کو الگ کر دیا جاتا ہے اور جو بالکل شفاف ہوتا ہے اسے تراش خراش کر اس قابل بنایا جاتا ہے کہ اس کا اصل حسن اور رنگ

نکھر آئے اس میں بڑی مہارت درکار ہوتی ہے۔لمحوں میں ذراسی بے توجہی سے لاکھوں کی چیز کوڑیوں کی ہو جاتی ہے۔ ہیرے جواہرات اپنے وزن اور چمک دمک کے سبب قیمتی ہوتے ہیں جتنا وزن زیادہ ہوگا، جتنی زیادہ چمک ہوگی، شفاف ہوگا، اسی قدر قیمتی ہوگا۔ کوہِ نور اسی لیے مشہور ہوا کہ وہ معلوم ہیروں میں سب سے زیادہ وزنی اور سب سے زیادہ چمک دار تھا۔ ایک جواہرات کے کاری گر کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ نگینہ تراشتے وقت، نگینے کو سان پر گھاٹ کرنے، دانے لگانے اور جلا کرنے کے مراحل سے اِس طرح گزارے کہ وزن میں بہت معمولی کمی آئے اور ہر ہر زاویے سے انعکاس نور اپنی پوری تابانی سے ایسا ہو کہ دیکھنے والے کی نگاہیں چکاچوند ہو جائیں۔ اَجا بھیّا اسی سبب سے دوسروں سے ممتاز اور گراں ترین کاری گر تھے کہ وہ خام پتھروں کے جگر میں رنگ و نور کے عناصر کو ابھارنے اور اس کے زاویوں کو اس انداز میں مرتب کرنے کا ہنر جانتے تھے کہ پتھر بیش قیمت ہو جاتا تھا۔

والد صاحبؒ تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا محمود حسن خان ٹونکیؒ کے ساتھ دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ''معجم المصنفین'' کی تدوین میں مصروف رہے۔ تین سال کے بعد واپس جے پور آ گئے۔ یہاں معاش کی سبیل کے لیے یا تو وہ مدرسے میں مدرّس ہو کر چلے جاتے جو آسان نہ تھا اور گھر سے بھی دور رہنا پڑتا یا پھر کسی مسجد میں پیش امام ہو کر بیٹھ رہتے، محلّے کی روٹیاں کھاتے اور یہ انھوں نے پسند نہیں کیا، چناں چہ جواہرات کے کام کی طرف متوجہ ہوئے اور اَجا بھیّا سے اس فن کو بہت ہی قلیل مدّت میں حاصل کیا، اس میں مہارت پیدا کی، یہاں تک کہ دور دور تک ان کے ہاتھ کا بنایا ہوا نگینہ پہچانا جانے لگا۔ اس تعلّق سے ہم اَجا بھیّا کا نام سنتے آئے تھے۔ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ ہندوستان میں، ہم پاکستان میں، بچپن میں دیکھا تھا، وہ یاد نہیں۔

ایک رات حیدرآباد سندھ میں سخت بارش ہو رہی تھی اس بارش میں گھر کے آگے ایک تانگا آ کر رکا۔ دو تین صاحبان تشریف لائے۔ ان میں ایک اَجا بھیّا بھی تھے، مناسب قد، چھریرا بدن، گورے چٹے، سفید لباس زیب تن کیے ہوئے، مُنہ میں پان دبا ہوا۔ ہونٹوں پر پان کی سرخی نمایاں، ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور تہہ دار گوٹے کناری سے مزیّن بٹوا۔ والد صاحب سے بڑی ہی محبت سے ملے، دونوں کی گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ دونوں کے درمیان احترام کا

رشتہ ہے، احترام کیسا شاگرد کو استاد کا احترام کرتے تو دیکھا تھا یہاں معاملہ ہی الٹا تھا استاد شاگرد کا احترام کر رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں میں استادی وشاگردی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے احترام میں سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ والد صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ انھوں نے رات ہمارے یہاں ہی گزاری اس لیے خوب باتیں کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے ان کی زندگی کے حالات اور اس فن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کیوں کہ میں بھی اس زمانے میں معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر والد صاحب کی معاونت کے لیے جواہرات کی کٹائی کا کام کرتا تھا۔ فرمانے لگے، میاں تمھارے والد نے تو عالم ہونے کے بعد یہ کام سیکھا ہے۔ یہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں، یہ علم ہی کا کرشمہ ہے کہ برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد بھی جو کام پوری طرح نہیں آتا وہ چند برسوں میں انھوں نے سیکھ لیا۔ ہم نے بچپن میں یہ کام سیکھا تھا، بڑی محنت و مشقت کی تھی، اس وقت ہمارے حالات بھی صحیح نہیں تھے۔ ہمارے بڑے بھائی مستقیم صاحب ہمیں یہ کام سکھاتے تھے، وہ بہت سخت آدمی تھے۔ ایک دو پیسے کی کھڑ (خام ایمیٹیشن) لاتے دن بھر محنت کر کے نگینہ بناتے اس امید پر کہ ایک دو آنے کا بک جائے گا اور ایک دو روز کا گھر خرچ چل جائے گا۔ جب نگینہ بنا کر بھائی صاحب کو دکھاتے تو وہ اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتے اور پتھر سے کچل کر پھینک دیتے۔ محنت گئی سو گئی پونجی بھی ساتھ گئی۔ اب پھر فاقے۔ بس فاقے پر فاقے کرتے اور کام کرتے۔ محلّے کا سقّہ، ہم پر رحم کھا کر جو روٹی اسے گھروں سے ملتی تھی، اس میں سے ہمیں بھی دے دیتا تھا۔ اس طرح ہم نے یہ کام سیکھا ہے۔ اس زمانے میں چھوٹا موٹا کام کرنے والوں کو گھروں سے روٹی وغیرہ ملتی تھی۔ یہ عام بات تھی، سادگی اور خلوص ومحبت کا یہ عالم تھا کہ محلّہ پڑوس سے بے تکلف سالن وغیرہ مانگ لیا کرتے تھے اس میں کسی کو کوئی شرم نہیں آتی تھی، کوئی بھی اس کو کسرِ شان نہیں سمجھتا تھا اور تو اور آگ مانگنے کا بھی بڑا رواج تھا، شام ہوئی چولھا جلانے کے لیے بچے کو کرچھا لے کر روانہ کیا کہ پڑوس سے آگ مانگ لا اور وہ جلتے ہوئے دو کوئلے لے آتا اس سے آگ جلائی جاتی۔ بہر حال سقّے کی مہربانی سے فاقوں [illegible] خیر دے

ان کی سختیوں کی وجہ سے آج ہم اس قابل ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرحد کے علاقے سوات میں زمرّد کی کان دریافت ہوئی تھی، دنیا بھر سے جوہری آ کر خام مال لے جارہے تھے۔ اَجا بھیّا بھی جے پور سے اسی لیے آئے تھے۔ والد صاحب سے فرمانے لگے، مولانا مجھے کچھ مال خریدنا ہے میری نظر کم زور ہوگئی ہے آپ میرے ساتھ سوات چلیں آپ کو بھی کچھ فائدہ ہو جائے گا۔ والد صاحب نے فرمایا، استاد ساری زندگی محنت کر کے کمایا کھایا اب کمیشن کھاؤں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اَجا بھیّا نے کہا، دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں، آپ تو میرے اپنے ہیں جتنا اعتماد میں آپ پر کروں گا اتنا کسی اور پر نہیں کرسکتا۔ والد صاحب نے فرمایا، ویسے ہی آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔ اجا بھیّا سے ہماری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی ان کی شخصیت کا اثر جو پہلے تھا وہ اور گہرا ہوگیا۔ وہ تو نرے کاری گر تھے۔ نہ عالم نہ فاضل، ہاں قرآن حافظ تھے، متقی پرہیزگار اور تہجد گزار تھے۔ والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ علم تو تقوے کا نام ہے۔ پہلے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اب سمجھ میں آنے لگی ہے۔ بلاشبہ تقویٰ علم وفن ہی نہیں زندگی کے کل معاملات کی اساس ہے، خیالات پاکیزہ، اعمال میں پاکیزگی، تخریبی نہیں تعمیری مقاصد کے زیر اثر افعال میں ترتیب و تنظیم ہی ایسی چیز ہے جو زندگی کو صحیح سمت پر ڈال دیتی ہے اور کُل کاموں کو سنوار دیتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

أُوصِیکَ بِتَقْوَی اللّٰه فَاِنَّهُ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّهٖ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا، ''میں تم کو تقوے کی وصیّت کرتا ہوں کیوں کہ یہ تمھارے تمام کاموں کو سنوارنے اور آراستہ کرنے والا ہے۔''

اجا بھیّا اپنے فن کے کامل استاد تھے۔ نگینہ سازی کے کُل مراحل پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہیرے کا ایک نگینہ بنایا، کنول کے پھول کی شکل کا، اور اس زمانے کے ایک مشہور جوہری بدری چند کو بلا کر نگینہ دکھایا، بدری چند نگینے کو دیکھ کر جھوم اٹھا کہنے لگا استاد اسے بیچیں تو میں خود اپنے لیے خریدلوں گا۔ آپ کی یادگار میرے پاس رہ جائے گی۔ اجا بھیّا نے کہا، مگر ایک شرط پر کہ تم کسی بھی حال میں اس نگینے کو فروخت نہیں کروگے اگر فروخت کرنا ہی

پڑے تو میرے ہی ہاتھوں فروخت کرنا۔ اس نے یہ شرط منظور کر لی اور ایک بڑی رقم حوالے کر دی۔ اچا بھیا کو اس وقت رقم کی ضرورت تھی چناں چہ وہ رقم انھوں نے کام میں لے لی۔ کئی مہینے یا سال گزرنے کے بعد ایک دن اچا بھیا بدری چند کے ہاں گئے اور پوچھا، وہ نگینہ کہاں ہے، ذرا لے کر تو آؤ۔ بدری چند نے انکار کر دیا کہ میں دوں گا نہیں۔ اچا بھیا نے کہا، لے کر تو آؤ اور ایک پیالے میں پانی بھی لیتے آنا۔ چناں چہ وہ لے آیا۔ اچا بھیا نے کہا، اس نگینے کو پانی میں ڈال دو۔ بدری چند نے بے خوف و خطر نگینہ پانی میں ڈال دیا، ذرا سا ہلایا تو نگینہ غائب، وہ تو پانی میں گھل گیا۔ بدری چند کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ فوراً ہی اچا بھیا نے رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی اور کہنے لگے، تعجب کیوں ہے میں نے وہ نگینہ لاہوری نمک کا بنایا تھا۔ یہ سن کر تو بدری چند نے سر پیٹ لیا، کہنے لگا، استاد یہ کیا غضب کیا ایسی نادر چیز آپ نے ضائع کر دی۔ آپ اس کے مجھ سے دگنے تگنے پیسے لے لیتے، مگر بتا تو دیتے۔

نگینہ جب بناتے ہیں تو اُسے تین مختلف مراحل سے گزارنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے گھاٹ کرتے ہیں یعنی نگینے کی آڑی ترچھی نوکوں کو گھس کر مخصوص شکل دیتے ہیں، پھر سان پر پانی کے ذریعے مسالے کی تہیں چڑھاتے ہیں اور نگینے کو اس سے لگا کر زاویے بناتے ہیں اس کو اصطلاحِ نگینہ سازی میں ''داسے لگانا'' کہتے ہیں پھر نگینے پر کانسی یا رانگ کی سان سے جلا کی جاتی ہے۔ فرض کیجیے، پہلے دو مرحلوں میں پانی استعمال نہیں بھی کیا تو یہ ممکن ہے، مگر آخری مرحلے میں تو پانی کا استعمال ناگزیر ہے۔ بغیر پانی لگائے نگینہ تیار ہو ہی نہیں سکتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس حکمت و ترکیب سے نگینہ بنایا ہوگا کہ اتنے بڑے جوہری کو بھی شک تک نہیں ہوا۔ ایسے صاحب نظر اور ماہر، کامل فن کار اب کہاں۔ وہ اپنی پوری زندگیاں وقف کرتے تھے جب فن آتا تھا۔

اچا بھیا استاد تھے۔ وہ خود صاحب کمال تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی درجے پر فائز دیکھنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ اصلی جواہرات کو نقلی نگینوں میں ملا دیتے اور پھر تلاش کراتے۔ فرماتے تھے، جواہرات میں تو سارا کھیل ہی نظر بازی کا ہے۔ ذرا نظر چوکی اور آدمی برباد ہوا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کا اصل راز تو نظر بازی میں پوشیدہ ہے

☆☆☆

محمد سعید

(المتوفی: ۱۹۸۵ء)

مختلف لوگوں کو مختلف شوق ہوتے ہیں۔ بانک پٹا، بنوٹ، تیراندازی، شمشیر زنی اور گھڑ سواری وغیرہ تو فنونِ حرب میں آتے ہیں، لہٰذا ان کی ناپسندیدگی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ رہ گیا مرغ بازی، کبوتر بازی وغیرہ کے شوق تو شرفا کے ہاں ان کو پسند نہیں کیا جاتا، تاہم کبوتر بازی کا شوق تو بڑے بڑے شرفاء کو رہا ہے۔ اکبر بادشاہ، خانِ اعظم کوکلتاش، نوابوں، راجاؤں کے علاوہ آخری دور میں اردو کے مشہور شاعر منشی امیر احمد مینائی، ریاست ٹونک کے مشہور خطّاط، فخر الشعراء، معتمد الملک، سیّد اصغر علی آبرو، بیخود دہلوی، علاّمہ سر محمد اقبال اور ناصر کاظمی وغیرہ اس سے شوق رکھتے تھے۔ خان محمد نیاز الدّین خان کے نام ۴ر ستمبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں علاّمہ اقبال لکھتے ہیں:

> کبوتروں کے دو جوڑے آپ نے بکمال عنایت عطا فرمائے تھے۔ ان میں ایک جوڑ بچے نہیں دیتا۔ انڈے دیتا ہے اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے۔ دوسرے جوڑ نے بچے دیے، مگر ان میں سے دو جو بہت اچھے اڑتے تھے شکاری جانور کا شکار ہو گئے۔ ایک باقی ہے جوڑے میں نر ضعیف اور کمزور ہے امید نہیں دیر تک زندہ رہے، بہتر یہ ہے کہ چند بچوں کے جوڑے بھجوا دیجیے، اگر ممکن ہو تو۔ میں نے لدھیانے بھی لکھا ہے اور شاہ جہاں پور سے بھی ان شاء اللہ کبوتر آئیں گے۔
>
> آپ کے صاحب زادے نے ذکر کیا تھا کہ فیروز پور میں کوئی شخص

ہے، جو کبوتروں کو مستقل رنگ دے سکتا ہے جو اس کے بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے مہربانی کر کے صاحب زادے سے دریافت کیجیے کہ اس آدمی کا پتا کیا ہے۔ کل کرنل اسٹیفنسن (Col. Stephenson) صاحب سے کبوتروں کے رنگ کے متعلق بہت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے چند کتابوں کے نام لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گرامی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہو۔

غرض اس دور میں شرفاء میں یہ شوق بہت تھا۔ والد صاحب کو بچپن میں یہ شوق ہوا تھا۔ دادا حضرت نے جب دیکھا کہ اس میں انھیں زیادہ انہماک ہو گیا ہے تو ایک روز فرمانے لگے، "تجھے ہم اپنا بیٹا اس وقت مانیں گے جب تُو مولوی فاضل کر کے دکھائے گا اور سارے کبوتر والد صاحب کے ایک دوست گلاب خاں کو دے دیے، والد صاحب کو ڈابھیل (سورت) کے مدرسے میں پڑھنے بھیج دیا۔ شوق بھی کیا چیز ہے ایک دفعہ ہو جاتا ہے ساری زندگی نہیں چھوٹتا۔ بہانے بہانے سے آدمی شوق کو پورا کرنے کے درپے رہتا ہے۔ کبوتر بازی کو شوق نہیں لت کہنا چاہیے۔ ایک دفعہ پڑ جائے تو پھر نہیں چھوٹتی۔

اے ذوقؔ! دیکھ، دخترِ رز کو نہ مُنہ لگا!
چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھے یاد ہے، میں بہت چھوٹا تھا، ایک جنگلی کبوتر کا بچہ آ گیا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ سارا دن اس کے ساتھ کھیلتے رہے۔ شام ہوئی تو ہمارے ایک بھائی ظہیر الدّین صاحب وہ کبوتر کہیں چھوڑ آئے۔ اس کا ہمیں بہت افسوس ہوا۔ والدہ نے جب ہمارے شوق کو دیکھا ہماری افسردگی کا خیال کیا تو والد صاحب سے کہا کہ اس کے لیے کبوتر لا دیں۔ ہر چند والد صاحب نے منع کیا یہاں تک کہا کہ دیکھو، تم زندگی بھر پچھتاؤ گی، مگر وہ یہی کہتی رہیں کہ میں خود ان کی دیکھ بھال کر لوں گی۔ آپ بس لا دیں۔ مثل مشہور ہے: راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ۔ بھلا عورت کی ضد کے آگے کبھی کسی کی چلی ہے۔ اللہ بھلا کرے ہماری امّاں جان کا جن کی ضد نے ہمیں [illegible] کی نعمتوں سے ہم

مستفید ہو رہے ہوتے اور عیش و عشرت میں بسر ہو رہی ہوتی۔ ایک طرف والدہ کی ضد اور دوسری طرف شوق، معاملہ دو آتشہ ہو گیا۔ دو تین دن نہیں گزرے تھے کہ دو بڑی بڑی کابکیں آ گئیں، ان میں ہرے، سفید، کل سرے، کل ڈمے، باجرے، موتی کاغذی، غرض رنگ برنگے کبوتر تھے۔ دادی نے سر پیٹ لیا اور والدہ پر برس پڑیں۔ یہ کبوتر بڑی مشکل سے تو گھر سے نکلے تھے، اب پھر آ گئے۔ والدہ صاحبہ کو کیا معلوم کہ اس کے پس منظر میں کیا کہانی پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد تو کبوتر عرصے تک رہے۔ جب گھر سے کبوتر ختم ہو گئے تو والد صاحب شاگردوں کے ہاں جا کر اپنے شوق کو پورا کر لیا کرتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں ہم جب پاکستان آئے تو کبوتر ساتھ تھے۔ وہ بھی واقعہ عجیب ہے مونا باؤ کھوکھرا پار میں سخت گرمی تھی۔ دھوپ کی تمازت ایسی تھی کہ سائے میں بھی چین نہیں تھا۔ ریت ایسی گرم کہ پاؤں جھلسے جاتے تھے میں اور میری نانی سر پر چادر تانے کبوتروں کو لیے بیٹھے تھے۔ کسٹم کا ایک افسر کبوتروں کا شوقین معلوم ہوتا تھا وہ کبوتر ہتھیانا چاہتا تھا۔ نانی نے بڑی معصومیت سے کہا، بھائی ہم تو مزدور ہیں ایک آدمی ان کی نگرانی کے لیے ہمیں بٹھا گیا ہے وہ دو چار آنے دے گا ہمارا کام چل جائے گا جب وہ آئیں تو انھیں سے بات کرنا۔ خیر سے ٹرین آ گئی اس طرح وہ کبوتر ہمارے ساتھ آ گئے۔ والد صاحب حیدر آباد منتقل ہو گئے تو وہاں سعید صاحب ڈھونڈتے ہوئے پہنچے، کبوتر دیکھنا چاہتے تھے۔ والد صاحب کسی کو کبوتر نہیں دکھاتے تھے ان کو بھی نہیں دکھائے۔ انھوں نے بہتیرا کہا کہ آپ کے استاد حکیم معظم علی صاحب سے ہمارا تعلق ہے ہم وہاں جے پور میں ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان کے کبوتر بھی ہم نے دیکھے ہیں، مگر والد صاحب نے ایک نہیں سنی۔ آخر کار سعید صاحب نے حکیم صاحب سے والد صاحب کے نام جے پور سے خط منگوایا تو پھر ان سے تعلق پیدا ہو گیا اور روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب ہم دوبارہ کراچی منتقل ہوئے تو تمام کبوتر ان ہی کے پاس چھوڑ دیے تھے۔

سعید بھائی ریواڑی کے رہنے والے تھے، نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ، ہاتھ پیروں سے مضبوط، پہلے شیو کرتے تھے بڑھاپے میں خشخشی، مگر گھمبیر ڈاڑھی رکھ لی تھی اس پر گھنی اور موٹی

مونچھیں۔ جیسی پیر پگاڑا کی ہیں اسی سے ملتی جلتی۔ موٹے شیشوں کی عینک لگایا کرتے تھے۔ نہایت ہی خوش مزاج وخوش اخلاق تھے۔ کبوتروں کے بے حد شوقین۔ جہاں کبوتر نظر آئے، ان کی رال ٹپکی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کبوتروں میں لگ جاتے۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ کہیں سے گزر رہے ہیں اور کسی چھت پر کبوتر نظر آئے تو فوراً اس کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اس شوق کی نذر کر دی۔ ہم والد صاحب کے ساتھ جب بھی ان کے گھر جاتے تو صحن میں آٹھ دس کابکوں میں کبوتر، بس کبوتر ہی کبوتر، اس میں ہرے کبوتر زیادہ تھے۔ ہرے کبوتر انھیں کبوتروں کی نسل سے تھے جو والد صاحب ہندوستان سے ساتھ لائے تھے۔ اس نسل سے متعلق یہ واقعہ عجیب ہے۔

والد صاحب بیان فرماتے تھے کہ ریواڑی میں کوئی زمیں دار کبوتروں کے بڑے شوقین تھے خصوصیت کے ساتھ ہرے کبوتروں کے۔ کبوتر بازوں میں ہرے کبوتر وہ کہلاتے ہیں جو جنگلی کبوتر کے رنگ کے ہوں یا اس سے بھی گہرے نیلے چمک دار، ایک مرتبہ ان زمیں دار صاحب کی بیوی بیمار ہوگئی۔ بہتیرا علاج معالجہ کرایا، مگر مرض میں افاقہ نہیں ہوتا تھا۔ حکیم سیّد معظم علی صاحب ریواڑی جایا کرتے تھے۔ طبیب بھی بہت اچھے تھے، اس حیثیت سے لوگ بھی انھیں جانتے تھے۔ چناں چہ انھیں بھی اس زمیں دار کے ہاں لے جایا گیا، حکیم صاحب نے علاج شروع کر دیا۔ آتے جاتے حکیم صاحب کبوتروں کی آواز سنتے، ان کو اڑتا ہوا بھی دیکھتے، مگر خاموشی سے علاج کرتے رہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیمار شفایاب ہو گیا۔ زمیں دار ممنونیت کے احساس سے لب ریز حکیم صاحب سے کہنے لگا میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔ آپ جو کہیں خدمت کرنے کے لیے تیّار ہوں، مگر حکیم صاجب نے کچھ نہیں لیا۔ حکیم صاحب نے اس سے کہا، تم کبوتروں کے شوقین ہو، ہمیں دکھاؤ کیسے ہیں۔ زمیں دار کو کیا خبر کہ یہ اس فن کے کامل استاد ہیں، چھت پر لے گیا اور کبوتر دکھانے لگا۔ حکیم صاحب کبوتر دیکھتے ہی عش عش کر اٹھے۔ یہ سیاہی مائل نیلے رنگ کے تھے۔ پروں پر ایسی چمک تھی کہ ذرا سی روشنی پڑتی جھلملا اٹھتے۔ نوک پنجوں سے درست، سیان، شان، اڑان ساری ہی خوبیاں تھیں۔ حکیم صاحب نے کہا، اگر تم احسان اتارنا ہی چاہتے ہو تو اس

کا جوڑ ہمیں دے دو۔ اس وقت ایک کبوتر حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ زمیں دار نے جوں ہی یہ سنا بے ساختہ اپنا نرخرا پکڑ کر کہنے لگا، حکیم جی! کبوتر چھوڑ دو، میرا دم نکلنے لگا ہے۔ حکیم صاحب نے کبوتر چھوڑ دیا اور اٹھ کر چلے آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے شہر میں یہ بات مشہور ہوگئی۔ لوگ زمیں دار کو لعنت ملامت کرنے لگے کہ حقیر سی چیز کو دینے سے منع کر دیا۔ اس کی ماں، اس کی شفایاب بیوی سب ناراض، جہاں جائے لعنت ملامت، دُر دُر پھٹ پھٹ، قہر آلود نظریں ہر جگہ اس کا استقبال کرتیں، جو ہے طنز کے تیر برساتا۔ ایک مصیبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ آخر کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتا۔ ایک روز خاموشی سے حکیم صاحب کی خدمت میں دو جوڑے پیش کر دیے اور حکیم صاحب نے یہ کہہ کر والد صاحب کو دیے تھے، ''مولانا آپ پر مجھے بہت اعتماد ہے، آپ پاکستان جا رہے ہیں، یہاں کوئی ایسا نہیں جو ان کی حفاظت کر سکے۔ آپ انھیں اپنے ساتھ لے جایئے، یہ میری ساری عمر کی کمائی ہے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔'' ہم دیکھنے والے ہیں۔ والد صاحب نے ان کی بڑی حفاظت کی، کیسے ہی حالات ہوئے ہمیشہ ساتھ ہی رکھا۔ جب سعید بھائی سے تعلق ہوگیا تو پھر ان کے ہاں وقتی طور پر چھوڑ دیے۔ وہ بھی بلا کے آدمی تھے کسی کو بھی ایک پٹھا نہیں دیا۔ شاگردوں کو بھی اصل نہیں دیے بلکہ دو غلے در دو غلے کر کے دیتے اور خود بھی ضائع ہونے کے خوف سے وہی دو غلے کبوتر اڑاتے تھے۔

سعید بھائی حیدرآباد کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے اور ان شاگردوں نے بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے، سارے شہر میں دھوم مچا رکھی تھی، ان کے سامنے کوئی ٹکتا ہی نہیں تھا۔ کبوتر بازی اپنی جگہ ہم تو ان کے خلق، ان کی محبت و شفقت سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ اپنی اولاد میں اور ہم میں کچھ فرق نہیں سمجھتے تھے ہم اکیلے بھی کبھی ان سے ملنے جاتے تو کبوتر ضرور دکھاتے تھے، کبوتر کی خوبیاں اور خامیاں بتلاتے تھے۔ یہ خورد نو کا ہے، یہ تیز پر ہے؛ آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ بہت سیانا ہے اس کا کوئی پٹھا خطا نہیں کرے گا۔ اتنا شعور تو ہمیں تھا نہیں کہ یہ سمجھ پاتے کہ اس طرح وہ ہم میں شوق کی حرارت بڑھا رہے ہیں۔ ویسے بھی اپنے بڑوں کو دیکھ کر بچوں میں اسی قسم کے شوق از خود پیدا

ہو جاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے سنتے سنتے سمجھنے بھی لگتے ہیں۔ والد صاحب نے اگرچہ ہمیں اس سے دور ہی رکھا، مگر پھر بھی ہم اس شوق میں دلچسپی لینے لگے اور خوب سمجھنے بھی لگے۔ سعید بھائی اور والد صاحب دونوں ہی یک زبان تھے کہ جس کو اس میں سمجھ آئی وہ برباد ہوا۔ شوق کوئی بھی ہو، فن کوئی بھی ہو سارا کھیل نظر بازی کا ہے اور یہی خطرناک ہے۔

دل کی نہیں تقصیر مکنّد آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں، وہ گرفتار نہ ہوتا

(مکند رام پوری)

۱۹۶۸ء میں مَیں نے ''کبوتر بازی ایک فن'' کے عنوان سے ''نگار'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ وہ مضمون کیا تھا، اصل میں اس فن پر دو قلمی نسخوں کا تعارف تھا۔ سعید بھائی کو معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور خود مجھ ہی سے وہ مضمون سنا۔ سنتے جاتے، تعریف کرتے جاتے، مسکراتے جاتے اور کہتے جاتے یہاں تم نے یہ بات چھپالی وہاں یہ بات چھپا گئے وغیرہ۔

سعید بھائی کا اخلاص، ان کی وفا شعاری کا کیا ذکر کروں الفاظ ہی نہیں ملتے۔ وہ بس ہم پر جان چھڑکتے تھے۔ کہتے تھے کہ مولانا سے ہمارا تعلّق تھوڑا ہی ہے بس ہم بھائی ہیں اور ضرورت پڑنے پر بھائی کے لیے جان کیا چیز ہے۔ ان کے تمام صاحب زادگان اور صاحب زادیاں بھی ہمارے لیے بھائی بہن کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی مرحومہ جمیلہ آپا، اللہ ان کو اپنی رحمت کی چادر میں رکھے، بڑی ہی محبت کرنے والی تھیں۔ میری شادی بھی انھیں نے کرائی تھی اور ایسی کہ الحمدللہ آج تک میں خوش ہوں۔ کوئی موقع ہو، کوئی ضرورت ہو سعید بھائی حاضر۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک مرتبہ تعلّق ہو جانے کے بعد ساری زندگی اس کو نباہتے تھے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ اکثر اوقات خونی رشتے بھی کام نہیں آتے، مگر مجال ہے ان سے خطا ہو جائے۔ وفا شعاری کا پیکر، خلوص کا مجسّمہ، شفقت و محبت کا پہاڑ۔ پڑھے لکھے نہیں تو کیا سارے ہی محاسنِ اخلاق ان میں جمع تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

مولوی تلمیذ حسنین رضوی

(۱۹۴۱ء۔حیات ہیں)

ہمارے دوست مولوی تلمیذ حسنین رضوی چھوٹے قد کے ہیں، قد اتنا بھی چھوٹا نہیں کہ دور بیٹھے نظر ہی نہ آئیں۔ڈاڑھی بھی خشخشی ہے۔دور سے دیکھو تو معلوم ہو کہ ہاں، سنّت کے آثار پائے جاتے ہیں۔بعض لوگوں کے ہاں یہی ہے کہ ڈاڑھی اتنی ہو کہ معلوم ہو جائے کہ ہاں، بس ہے۔مولوی صاحب فقہِ جعفریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔عربی و فارسی کے بڑے عالم ہیں۔ اسکول میں اسلامیات کے استاد تھے۔محنت سے پڑھاتے تھے، مگر اس سے زیادہ محنت مجلسیں پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔خوب بولتے ہیں، الفاظ کا انتخاب پھر لفظوں کی ادائیگی میں اعضاء کا متحرک ہونا گویا وہ لفظوں کو اپنی حرکات سے معنی پہنا رہے ہیں۔ ہمارے پرانے ساتھی ہیں۔وضع دار ایسے کہ مجھ جیسے سے آج تک نباہ کیے جا رہے ہیں۔ بڑے بااخلاق، ملنسار، متواضع، متحمل مزاج، غرض بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔ہم یونیورسٹی میں ایک ساتھ ہی پہنچے۔مزاج کی ہم آہنگی ہی تھی کہ ہم دونوں ادب کی طرف راغب ہوئے۔انھوں نے عربی میں ایم اے کیا ہم نے اردو میں۔وہ عربی میں اوّل بدرجۂ اوّل آئے، ہم اردو میں۔ انھیں یونیورسٹی سے گولڈ میڈل ملا، ہم بابائے اردو گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ بہت سی باتوں میں ہمارے اور ان کے مزاج میں یکسانی ہے۔وہ شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں، ہم بھی۔وہ مولوی ابنِ مولوی ہیں، ہم صرف ابنِ مولوی، لیکن الولد سرّ الابیہ کے مصداق کہیں کہیں مولویّت کا اثر آ جاتا ہے۔اللہ کا شکر ہے، ملاّئیت کا اثر نہیں آتا ورنہ تو کچھ کے کچھ معنی ہو جائیں گے۔ویسے بھی اِس دور میں 'ملاّئیت' کی اصطلاح خاص معنوں کی حامل ہے۔ذرا ایک صدی پلٹ کر دیکھیے کہ اس خاص لفظ کے حامل ملاّ کس قدر بلند مرتبت

صاحبِ علم تصور کیے جاتے تھے، ملا علی قاری، ملا حسن، ملا بحرالعلوم وغیرہ کے نامِ نامی اسی نسبت سے آج بھی شہرت کے بامِ عروج پر ہیں۔ ایم اے عربی کے بعد مولوی صاحب فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ خانۂ فرہنگِ ایران حیدرآباد میں پڑھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ زبان کے لب و لہجے میں بے تکلف فارسی بولنے لگے۔ زبانوں کو سیکھنے اور پھر اہلِ زبان کی طرح بولنے کا ملکہ ہر کسی کو نہیں، کسی کسی کو ہوتا ہے اور مولوی صاحب کو یہ ملکہ حاصل ہے۔

مولوی صاحب آدمی تو پڑھے لکھے ہیں، مگر تربیت کی ضرورت ہے۔ تربیت ان معنی میں کہ انھیں کسی بھی کام پر اُکسانا پڑتا ہے اور وہ ہیں کہ بڑی مشکل سے زیرِ دام آتے ہیں اور آ بھی جائیں تو بھی مرضی کے مالک ہیں، شیر ہیں، جنگل کے بادشاہ، مالک و مختارِ کُل، جو چاہیں سو کریں۔ ہم نے بڑی مشکل سے انھیں پی ایچ ڈی کے لیے تیار کیا۔ پی ایچ ڈی کرنا ان کے لیے کچھ مشکل بھی نہیں تھا، موضوع بھی منتخب ہو گیا تھا، مگر نہ انھیں کرنا تھا نہ کیا۔ کہنے کو تو بہت سے لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے پی ایچ ڈی نہیں کیا تو کیا ہے اور دوسرے تحقیقی کام تو کیے ہیں، کتابیں لکھی ہیں، بہت سوں کو پی ایچ ڈی کرا دیا۔ مجھے اس موقع پر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کی یہ بات یاد آتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ لاکھ ہم نے بہت سی کتابیں لکھ دی ہیں، مگر ممتحن کے سامنے بیٹھ کر سوالوں کا جواب دینا نہایت مشکل کام ہے جو اس مرحلے سے گزرا اس نے نہ صرف بہت بڑا معرکہ سر کیا بلکہ اس کے بعد تو اس کے تحقیقی کاموں پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ عمر کے کسی بھی حصے میں ممتحن کے سامنے بیٹھ کر جواب دینا بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کے ساتھ یہ بات نہیں تھی بس افتادِ طبع ہی ایسی پائی تھی کہ دل چاہا کر گزرے ورنہ لاکھ سر پٹکیں وہ ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔

مولوی صاحب نے زندگی کی دوڑ میں بڑی جدوجہد کی، بڑی سعی و محنت کی، ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹیوشنیں پڑھائی ہیں، مجلسیں پڑھی ہیں، دور دراز کا سفر کیا ہے تب کہیں جا کر ڈھچر چلایا ہے۔ فطرت کا بھی عجیب نظام ہے اس نے زندگی کو ترقی پذیر رکھا ہے۔ وہ اپنے ارتقائی منازل خود طے کرتی رہتی ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں۔ اس لیے جمود و تعطل کا تو اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس میں تو نمو

ہے، علوئے مرتبت کی طرف وہ ہر لمحہ صعود کرتی رہتی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ گرد و پیش کے ماحول میں گم ہو جائے یا اپنی تمام تر قوتوں کو متحرک کرنے کی بجائے تخیل کے پُر فریب جال میں اپنے آپ کو مقید کر دے، حسن و عشق کی دل آویز داستانوں کے مسحور کن نغموں میں محو ہو کر اپنے آپ کو سلا دے۔ اس سے تو قنوطیت پیدا ہوتی ہے اور یہ زندگی کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ زندگی تو اس وقت ترقی کے مدارج طے کرتی ہے جب سختیوں اور تکلیفوں کو مطبوع بنا لیا جاتا ہے اور مولوی تلمیذ حسنین صاحب نے اس باب میں زندگی سے بڑا سخت محاسبہ کیا ہے۔

مولوی صاحب ۱۹۸۴ء میں امریکا گئے تھے مجلس پڑھنے اور وہیں کے ہو رہے۔ نیوجرسی میں رہتے ہیں۔ پورے امریکا میں حجۃ الاسلام کے لقب سے ملقب ہیں، مجالس پڑھنے بلائے جاتے ہیں۔ وہ تقریر کے لیے نئے نئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں پھر دلائل و براہین سے اپنی بات ذہنوں میں ڈال کر دل میں اتار دیتے ہیں اور جذبات کی آنچ کو اتنا تیز کر دیتے ہیں کہ آنسوؤں سے ہی اسے ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ایک دو مرتبہ ہی ان کی مجلس سننے کا اتفاق ہوا ہے بس میں تو مبہوت بنا ان کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہمارے دوست مولوی تلمیذ حسنین ہی ہیں جن پر سنجیدگی کا اتنا شدید دورہ ہم نے کبھی پڑتے نہیں دیکھا۔ پہلی مرتبہ جب میں امریکا گیا تو واپسی پر نیویارک کے ہوائی اڈے پر ملنے آ گئے۔ دوسری فلائٹ میں پانچ گھنٹے کا فرق تھا اس لیے نیوجرسی کا بازار گھمانے لے گئے۔ وہاں مولوی صاحب کی مقبولیت کو آنکھوں سے دیکھا۔ مرد، عورت، بوڑھا، جوان، سب ہی تو مولوی صاحب کے گرویدہ تھے۔ ہر طرف سے ''مولوی صاحب السّلام علیکم، مولوی صاحب آداب'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر ایک عقیدت و محبت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور مولوی صاحب تھے کہ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے مل رہے تھے۔ آدمی میں کوئی تو خوبی ہوتی ہے جس کے سبب لوگ اسے چاہنے لگتے ہیں۔

میں دوسری مرتبہ جب امریکا گیا تو بطورِ خاص مولوی صاحب کے گھر بھی گیا۔ انھوں نے وہاں نہایت عمدہ کتب خانہ فراہم کیا ہے۔ ہزاروں کتابیں اردو، فارسی اور عربی کی جمع کی ہیں۔ تفاسیر، حدیث، فقہ اور رجال کی اکثر اُمّہات الکتب اُن کے پاس موجود ہیں اور وسیع

القلب اتنے ہیں کہ ہر فقہ کی کتاب اُن کے ہاں مل جائے گی۔ ادب کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ جب ہم حیدرآباد میں تھے تو بہت سی کتابوں کو ترستے تھے۔ اب اللہ کا فضل ہے کہ وہ ساری کتابیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ اللہ جب نوازنے پر آتا ہے تو اسی طرح نوازتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انعام دیکھیے کہ ہر سال مولوی صاحب زیارتیں کرتے ہوئے حج ادا کرتے ہیں۔ چار مرتبہ سے ایسا اتفاق ہو رہا ہے کہ مکّے میں ہماری اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پھر نصیب فرمائے۔ آمین۔ مجھ پر تو بڑا زور دے رہے ہیں کہ امریکا ہی آجاؤ۔ یہاں تمھارے لیے بہت سے راستے نکل آئیں گے۔ بس کچھ دن جم کر ایک جگہ بیٹھنے کی ضرورت ہے اور پھر ہم بہت مفید علمی کام کر سکتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنی اولاد کی بھی بہت بہتر انداز میں تربیت کی ہے خود تو مولوی ابنِ مولوی تھے ہی، اپنے بیٹے رضوان کو بھی قُم بھیج کر مولوی بنایا۔ بڑا سعادت مند بچہ ہے۔ انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتا ہے اور بے تکلف مجلسیں پڑھتا ہے۔ مولوی صاحب کو اِس اخیر عمر میں اپنے بیٹے شاہد کی ناگہانی موت کا زبردست صدمہ پہنچا۔ جوان بیٹا تھا، ہمیں تین سَو میل کا سفر کر کے فلیڈلفیا (Phildelphia) سے لے کر آیا، بڑی خاطر کی۔ جب ہم لطیف آباد میں مولوی صاحب کے گھر جاتے تھے تو وہ میری گود میں آنے کے لیے مچلنے لگتا تھا۔ یاد آتا ہے، مولوی صاحب نے اِس غم کے پہاڑ کو جس صبر و ضبط سے جھیلا ہے وہ اُنھیں کا حصّہ ہے۔ اب بھی جب اُس کی یاد آجاتی ہے، تڑپ اٹھتے ہیں، مگر کیا کریں۔ صبر و ضبط تو مسلمان کی شان ہے۔ وہ حُبِ اہلِ بیت میں سرشار ہیں۔ امام حسینؑ کے غم کو سینے سے لگایا ہے۔ اُس غم کے آگے کوئی غم معنی نہیں رکھتا، سب ہیچ ہے۔

مولوی صاحب کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے۔ بہت سی کتابوں پر مقدّمے وغیرہ لکھے ہیں۔ قرأۃ اور دوسرے دینی موضوعات پر مختصر رسالے تالیف کیے ہیں، کچھ تراجم بھی کیے ہیں۔ ان میں ''منابعِ حدیث''، ''مکارم الاخلاق''، ''سورۃ الرحمٰن''، شمس الدّین محمد المعروف بہ شہیدِ اوّل کی ''الدّرۃ الباہرۃ من الاصداف الطاہرۃ'' کا ترجمہ ''جواہر پارے'' کے نام سے کیا ہے۔ اب محمد فیض کاشانی کی ''تفسیر الصافی'' کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں، ایک جلد تیار ہے،

عن قریب آیا چاہتی ہے۔ بڑا کام ہے اور بڑے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عشق نہیں جنون چاہیے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

☆☆☆

محمد شریف قریشی

(۱۹۴۵ء۔حیات ہیں)

اپنی ماں شریفہ بیگم کی مناسبت سے محمد شریف نام رکھا گیا۔نام کے اثرات شخصیت پر
ضرور پڑتے ہیں۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور بامعنی نام رکھنے کی ترغیب دی
ہے اور بہت سوں کے نام بدل کر دوسرے نام رکھے ہیں۔زمانے کے تغیرات دیکھیے پہلے
بزرگ بچوں کے نام رکھتے تھے اور ایسے نام تجویز فرماتے تھے جن سے اسلامی تشخص ابھرتا
تھا،مگر اب جدت پسندی کا مارا یہ معاشرہ اس قدر آزاد ہو گیا ہے کہ بزرگوں کو مخبوط الحواس سمجھ
کر عضو معطل کی طرح نظر انداز کر رکھا ہے اور جب وہ اپنی بے لگام فکر پر اعتراضات کی
بوچھار دیکھتا ہے تو دفاعی طور پر الٹا بزرگوں کو ہی مورد الزام ٹھہرا کر تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔وہ
کہتا ہے،بزرگوں کا یہ وتیرہ:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

(زمانہ اگر تیرے موافق نہیں تو تُو زمانے سے جنگ کر!) دقیانوسی، غیر ترقی یافتہ اور جامد
معاشرے کا موٹو ہے۔اِس کا تو نعرہ ہے:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

(اگر زمانہ تیرے جیسا نہیں بن سکتا تو تُو خود زمانے جیسا ہو جا۔)

بہر حال،اب بزرگ نہیں لڑکیاں نام رکھتی ہیں، جدید نام،ایسا نام جس سے پہلے کان آشنا
نہیں ہوں،خواہ مہمل ہی کیوں نہ ہوں۔ایسے نام جن سے نہ تو جنس کا پتا چلتا ہو اور نہ ہی اسلام سے
ان کی نسبت ہو، بلکہ غالباً کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ نام کا انتساب اسلام کی طرف نہ ہو۔اس کا دور
ختم ہو گیا، یہود و نصاریٰ کی طرف ہو۔وہی دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر بزرگوں

کی آنکھیں دیکھ کر مجبوراً اسلام سے وابستگی ظاہر کرنی ہی پڑے تو ایسا نام رکھا جائے کہ وقت پڑنے پر جس مذہب میں چاہیں شمار کرلیں۔ استغفر اللہ۔

محمد شریف قریشی، گورے چٹے، میدے کی طرح سفید، کبھی کبھی سرخی کی جھلک بھی آجاتی ہے شاید اس وقت جب کوئی بات ناگوارِ خاطر ہو۔طویل القامت، چھیریرا بدن، دلکش نقوش، انجینیئر، میری اہلیہ کے بڑے بھائی۔ بی ای کرنے کے بعد تعلیم کی غرض سے امریکا گئے وہاں سے ایم ایس کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ شادی بھی وہیں کی، امریکنوں کی طرح انگریزی ہی نہیں بولتے، بلکہ اور معاملات میں بھی وہ خالص امریکی ہو گئے ہیں، لیکن مشرقی آباواجداد کے خون کا اثر اور مشرقی تہذیب خمیر میں شامل ہے۔ اس لیے باوجود امریکی ہونے کے پورے امریکی نہیں ہیں۔ اکثر مشرقیت اپنا رنگ دکھا دیتی ہے۔ کچھ عرصہ امریکا میں رہنے کے بعد آرام کو (Aram Co) سعودی عرب میں بحیثیت انجینیئر آگئے۔ ذہین بھی تھے اور محنتی بھی اس لیے بہت قلیل عرصے میں آئل فیلڈ (Oil field) کی تنصیبات کے ماہر انجینیئر ہو کر ابھرے۔ ہر طرف ان کے کام کو سراہا جانے لگا۔ یوں کہیے کہ کمپنی کی سب سے زیادہ فعّال شخصیت وہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ۳۰ رسال وہاں بڑی عزت و توقیر سے گزارے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی تمام معاشی ذمّے داریاں انھوں نے سنبھالیں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے روپیہ پیسا پانی کی طرح بہایا اگرچہ والد کی حیات میں بھی ان کے شریکِ کار رہے ہیں۔ انھوں نے تمام بہن بھائیوں کو گرین کارڈ دلوایا تاکہ وہ امریکا میں رہائش پذیر ہوسکیں۔

بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ بہت سی نعمتوں سے نوازتا ہے، خوب دیتا ہے، لیکن وہ ان کو خرچ کرنے میں بے حد کنجوس ہوتے ہیں۔ بعض ہوتے ہیں کہ خرچ کرتے ہیں بے دریغ خرچ کرتے ہیں نمود و نمائش اور شہرت اس سے مقصود ہوتی ہے اور بعض عادۃً یا فطرۃً خرچ کرتے ہیں۔ شریف بھائی تیسرے نمبر کے لوگوں میں آتے ہیں۔ انھیں اللہ نے خوب دیا ہے اور خرچ کرنے میں بھی وہ بے محابا ہیں، محض اپنی ذات پر نہیں بلکہ بہن بھائی، عزیز و اقارب سب ہی پر اسی رفتار سے خرچ کرتے ہیں جس رفتار سے وہ اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ والد صاحب رحمۃ اللہ

علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کمانا آسان ہے خرچ کرنا مشکل ہے۔ یہ بات پہلے تو سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر اب سمجھ میں آنے لگی ہے۔ بلاشبہہ خرچ کرنا اور صحیح مصرف میں خرچ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ شریف صاحب خرچ تو کرتے ہیں، بے دریغ کرتے ہیں، مگر اس تمیز سے عاری ہیں، بس ان کا موڈ ہے خرچ کردیا۔ سیاحت کا دورہ پڑا دنیا گھوم ڈالی، نیکی کا خیال آیا کسی کی شادی، کسی کی تعلیم کسی کی بیماری پر خرچ کردیا اور تو اور بیٹھے بیٹھے اُچنگ ہوئی، نکل کھڑے ہوئے بڑے بڑے ہوٹلوں میں الابلا سب ہی کچھ کھا ڈالا۔ لوگ بھی ان کی اس عادت سے واقف ہیں، ایسے ہی وقت ان کے گرد گھیرا ڈالتے ہیں جب ان کی ماں کے ذریعے مسائل کی فہرست ان کے کانوں تک پہنچادی گئی ہو اور شریف ہیں کہ کچھ نہ کچھ تو ان کے حل کرنے میں معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔

خرچ کرنا مسلمان کا شیوہ ہے، لیکن کس طرح خرچ کرے اس کے لیے ایک دائرہ مقرر ہے اسی میں رہ کر خرچ کرنے پر اجر و انعام کا وعدہ ہے۔ آج کل یہ فکر بن گئی ہے اور خاص طور پر باہر رہنے والوں کی کہ جو رفاہی کام کررہا ہے وہی سب سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کو دیا جائے۔ اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے جدید علوم سے متعلق دنیا کی نام وَر یونیورسٹیوں سے علم حاصل کیا۔ ہم بہت پڑھے لکھے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ دو چار مذہبی کتابیں یا قرآن و حدیث کے تراجم پڑھ لیے، عالم فاضل ہوگئے۔ اب ہمارے مقابل کوئی نہیں ہے۔ چوہے کے ہاتھ جب ہلدی کی گرہ لگ جاتی ہے، پنساری بن بیٹھتا ہے۔ ہماری بھی یہی حالت ہے۔ اہلِ علم کی طرف تو ہم رجوع نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ وہ ہمارے مطلب کی بات نہیں کہیں گے۔ بس جو ڈاڑھی والا ملا وہی عالم، جس نے اپنی زلفیں دراز کیں وہ صوفی اور جو اندھا نظر آیا وہ حافظ، صحیح بات کیسے پتا چلے۔

ہمارے ذہنوں میں تو یہ ٹھونس دیا گیا ہے کہ بس انسانیت کی خدمت کرنی چاہیے اور انسان انسان سب برابر ہیں اس میں مذہب کہاں سے بیچ میں آ گیا، مگر کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا اور نہ ہم ہی نے کبھی سنجیدگی سے غور کیا کہ آخر انسانیت ہے کیا چیز؟ انسانیت تو نبوت کے تابع ہے۔ سب سے پہلا انسان جس کی تخلیق ہوئی، جس کی عظمت و رفعت کے اعتراف میں پاکیزہ و

مطہر اور علومرتبت مخلوق کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا اسی کو نبی بنا کر اس عالم فانی مین بھیجا۔ اسی کے اعمال و افعال تو انسانیت کے نام سے ملقب ہوئے، کیا حیوانی جبلتوں کو انسانیت کا نام دیا جاسکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نبوت کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کی مرضی ومنشاء کے مطابق صحیح وسقیم کو ممیز کردے۔ اللہ تعالیٰ نے تسلسل سے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے یہ سلسلہ قائم رکھا تا آں کہ ختمی مرتبت نبیِ امّی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ انبیائے سابقہ کی تعلیمات کو آپ کی ذات میں یکجا کر دیا گیا۔ اب انسانیت نبوت کے دائرے سے باہر رہ کر کوئی چیز نہیں رہ جاتی۔ اب صرف انھیں باتوں پر انسانیت کا اطلاق ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وکردار اور قول وعمل سے ثابت ہیں اور وہی تمام باتیں انسانیت کا معیار بنیں گی جن کو سلف صالحین نے مشکوٰۃ النبوۃ سے اخذ کر کے اپنی پاکیزہ زندگیوں مین رائج کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ تو تمام انسانیت ڈھکوسلا اور فریب ہے نہ وہ انفرادیت کے لیے سودمند ہے اور نہ اجتماعیت کو اس سے کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔

میں نے اکثر شریف بھائی سے کہا، آپ بے شک خرچ کریں، پہلے فرائض کی ادائیگی ہو۔ آپ صاحبِ نصاب ہیں جو کچھ بنتا ہے اس کو اوّل ادا کریں۔ اس کے بعد بھی جو چاہیں صدقہ کر دیں۔ مجھے یاد ہے ہمارے گھر جب کوئی اچھی چیز پکتی والد صاحب نیّت کر لیتے کہ اس کا ثواب ہمارے والدین یا اساتذہ کو پہنچے۔ تمام اعمال کا مدار نیّت پر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ وسلّم کی خدمت اقدس میں تشریف لائے، فرمایا، میں کچھ صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلیٰ اللہ علیہ وسلّم نے غالباً ان صحابی کے حالات سے واقف تھے۔ فرمایا، جاؤ اپنے اہل پر خرچ کرو، یہی صدقہ ہے۔

شریف بھائی بڑے مخلص، محبت کا پیکر، سعادت مندی کا روشن منارا، سعادت مند کون نہیں ہوتا، کون والدین کا مطیع وفرماں بردار نہیں ہوتا، لیکن شریف بھائی کو جیسا سعادت مند پایا اس دور میں مشکل سے نظر آئے گا۔ ان کی والدہ جو کہہ دیں وہ انھیں ماننا ہے بے چون وچرا مانیں یا تھوڑی ردوکد کے بعد بس ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ ردوکد ان معنی میں کہ وہ ہر بات کے اچھے برے پہلو والدہ پر روشن کر دیں تا کہ انھیں غور وفکر کا موقع مل جائے،

مگر اس پر بھی ان کا حکم برقرار ہو تو پھر کتنا ہی نقصان ہو وہ اس کو پورا کر کے رہیں گے۔

انسانوں میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں، بہت سی خامیاں خود انسان کی سرشت میں رکھی گئی ہیں جن کو قرآنِ حکیم نے بیان کر دیا ہے یہی کہ انسان جلد باز ہے، جھگڑالو ہے۔ تنگ دل ہے، مصیبت میں جلد گھبرا جانے والا ہے وغیرہ اور ان کا وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موقع پر بالضرور اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی خامیاں ہوتی ہیں، لیکن وہ خامیاں اصلاح پذیر ہوتی ہیں۔ جب اللہ توفیق دیتا ہے تو آدمی از خود ان کا صد باب کر لیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر بہت بڑا احسان ہے اور والدین کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ اب وہ نماز کے پابند ہیں۔ باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ اس تغیر و تبدل میں ان کی شریکِ حیات شگفتہ رعنا کا بڑا دخل ہے۔ ان کی مسلسل کاوشوں سے بحمد اللہ آج وہ احکام دین کے دکھاوے کے طور پر نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے پابند ہیں۔ اسلام اور اس کے احکام کی عظمت پوری طرح ان کے قلب میں جاگزیں ہے۔ روزہ تو وہ پہلے بھی رکھتے شاید اس لیے کہ وہ صحت کے لیے مفید ہے، لیکن اب ان کا مطمحِ نظر بدل چکا ہے۔ اب وہ محض اللہ کے لیے سب کام کرتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس باب میں کس بات کی تلقین فرمائی ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت میں رکھے اور ان کی اولاد کو بھی دین اسلام کا مطیع بنائے۔ آمین۔

☆☆☆

قاصد عزیز

(المتوفی: ۲۰۰۰ء)

درمیانہ قد، بھاری جسم، خشخشی ڈاڑھی، بس یوں سمجھیے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے وزیرِ اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی تھے جو حیدرآباد میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اَن جان آدمی قد وقامت اور وضع قطع کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھے گا کوثر نیازی تو نہیں البتہ ان کے چھوٹے بھائی ضرور ہیں، لیکن وہ کوثر نیازی کی طرح سیاسی اکھاڑے کے مردِ میدان نہیں تھے تاہم شاطرانہ چالوں سے خوب واقف تھے اور کبھی کبھار ان کا استعمال بھی کر لیتے تھے۔ ریڈیو، مشاعرے، ادبی محافل بس اسی کے گرد اُن کی زندگی گھومتی نظر آتی تھی۔ جانتے تو ہم ایک دوسرے کو عرصے سے تھے، لیکن جب ہم ایم اے میں آئے تو پروفیسر رشید تبسّم کی معیّت میں قرب ہو گیا اور یہ قرب بہت جلد دوستی میں ڈھل گیا۔

قاصد عزیز ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے وابستہ تھے، ادبی پروگرام کے انچارج تھے پھر پروڈیوسر ہو گئے تھے۔ ذہین آدمی تھے۔ نت نئے موضوعات تلاش کرتے تھے۔ اپنے پروگرام کو بہتر سے بہتر بنانے کی جان توڑ کوشش کرتے تھے اور یہی ریڈیو میں عزّت وتکریم کا سبب بنا۔ بینش سلیمی مرحوم نے ہمیں ریڈیو پر متعارف کرایا تھا، کچھ پروگرام بھی کیے تھے بعد میں قاصد عزیز نے بہت سے پروگراموں میں ہمیں شریک کیا۔ خصوصیت سے ''اقبال کا ایک شعر اور اس کی تشریح'' کے عنوان سے جو پروگرام ہوتا تھا اس میں اقبال کے بہت سے اشعار پر تقریر کا موقع ملا۔

قاصد عزیز کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا بس ٹھہراؤ ہی تھا۔ جہاں تھے وہیں خوش، آگے بڑھنے کی انھوں نے چنداں کوشش نہیں کی۔ حال آں کہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے، ذہین

بھی تھے، کام کرنے کا سلیقہ بھی تھا ہم نے بار ہا کہا بھی، مگر زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ یہ ان کی افتادِ طبع تھی۔ اس کو ہرگز قنوطیت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ قنوطیت تو زندگی میں کامیابی و سرخ روئی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ انسان اسی وقت ناموافق عناصر کو اپنا موافق بنا سکتا ہے جب وہ کامل اذعان و یقین اور پختہ ایمان و اعتقاد سے تعاونِ عمل کو شریک حال بنا کر زندگی کی تیز ترین شاہراہ پر گام زن ہو۔ انسان کی پست اور درماندہ جذباتی فطرت کو اُکسانے میں اگر کوئی چیز معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو وہ قادرِ مطلق کی ذات کا خوف اور علیم و خبیر ذات سے امید ہے۔ اب اس کی موجودگی میں انسان زندگی کے گوناگوں تجربات سے جو اس کے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں کام لیتا ہے اور مقصدِ حیات کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ہر قسم کے غیر سنجیدہ اور بے ہودہ اوہام و خیالات کو پس پشت ڈال کر غنی عن الشئی ہو جاتا ہے اور توکل علی اللہ کی صفت سے مملو ہو کر اردگرد کی تمام چیزوں کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور مجاہدانہ زندگی کو اپنا نصب العین بنا کر مسرور و شاداں طمانیتِ قلبی سے زندگی کو کامیاب بنا لیتا ہے۔

آج جب وہ نہیں ہیں، ہم ان کی شخصیت، ان کے حالات پر غور کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہماری کیسی نادانی تھی ہم نے ان کے یقین و توکل کو ٹھہراؤ کا نام دیا اور قنوطیت کے مترادف جانا، ان کی زندگی مجاہدانہ زندگی تھی، شب و روز محنت و مشقت ان کا شعار تھا۔ زندگی کی پر پیچ و ناہموار وادی میں آبلہ پائی سے وہ ہمیشہ رواں دواں رہے۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ وہ اسکول میں بھی پڑھاتے تھے اور ریڈیو پر بھی کام کرتے تھے۔ وہ جب بھی ریڈیو پر بولتے نہایت سکون و اطمینان سے ایک ایک لفظ واضح اپنے پورے معنی و مطالب کے ساتھ ایک ایک جملہ آواز کے زیر و بم سے طبیعتوں پر اثر انداز ہونے والا ہوتا تھا۔ اسی کو آواز کا جادو جگانا کہتے ہیں۔

قاصد عزیز کی بڑی خوبی یہ تھی کہ سادہ مزاج اور سادہ طبیعت کے مالک تھے، یاروں کے یار ایک مرتبہ دوستی ہو جائے تو عمر بھر اسے نباہتے تھے۔ دوستی میں کئی مرتبہ ایسے مرحلے آتے ہیں کہ رنجش پیدا ہو جاتی ہے، لیکن قاصد عزیز کے ساتھ دوستی میں اوّل تو ایسے [illegible] تو بھی ان کی یک

طرفہ محبت ہر قسم کی رنجش ہر قسم کی تلخی کو پس پشت ڈال دیتی۔ وہ تو ہمدردی و خلوص کے جذبات سے لب ریز دل رکھتے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو ان سے شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی شکایت میں معاصرانہ چشمک یا پھر بغض و حسد کو زیادہ دخل ہے۔ بعض لوگوں نے کھل کر ان کی مخالفت کی، اوچھے ہتھیاروں سے ان پر وار کیے جھوٹا پروپیگنڈا کیا اس سے نقصان بھی ہوا، مگر انھوں نے صبر و استقامت کا دامن نہیں چھوڑا اور نہ ہی جواباً غلط قسم کا رویّہ اختیار کیا اور بالآخر حق فتح یاب ہوئے، باطل کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ حافظ:

کمالِ صدق و محبت ببیں نہ نقصِ گناہ
کہ ہر کہ بے ہنر افتد نظر بعیب کند

قاصد عزیز ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ کوئی بڑا ادبی کارنامہ تو ان کا نہیں ہے، البتہ شاعری میں نعت، منقبت، سلام، نظمیں اور غزلوں پر مشتمل اچھا خاصا کلام یادگار چھوڑا ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں کہتے تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے خوب کہتے تھے۔ وہ شاعری میں مضمون آفرینی کو بہت اہمیت دیتے تھے، لیکن صحت زبان اور روزمرہ و محاورے کا خیال رکھتے ہوئے۔ سادگی و روانی پر زور تھا۔ اسلوب بھی ان کا سادہ تھا۔ دورِ جدید کے شاعر تھے، مگر قدامت کا لبادہ اوڑھے ہوئے، آزاد نظمیں بھی انھوں نے لکھی ہیں، لیکن افاعیل تفاعیل میں مقید شاعری کو ہی پسند کرتے تھے اور شاعرانہ روایات سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتے تھے ایک بہت ہی خوب صورت نعت ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے ایک نعتیہ مشاعرے میں پڑھی تھی۔ یہ مشاعرہ شعبۂ اردو جامعۂ سندھ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ استادِ محترم ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب بنفسِ نفیس اس میں شریک ہوئے تھے اور اس نعت کو بڑا پسند کیا تھا۔ ایک ایک شعر ان کے حسنِ عقیدت کا مظہر ہے۔

آنسو ہیں مٹی کی دولت، تارے ہیں افلاک کے موتی
اہلِ دل کا سرمایہ ہیں ذکرِ شہِ لولاک کے موتی
کتنا خوش قسمت وہ قلم ہے جس کی آنکھ سے ٹپکے ہیں
حمدِ خدائے پاک کے گوہر، نعتِ رسولِ پاک کے موتی

اُس کے غلاموں کی ٹھوکر میں تاجِ قیصر و کسریٰ ہیں
اُس کے فقیروں کی جھولی میں ہیں فہم و ادراک کے موتی
نقشِ کفِ پائے احمد کو جس کے ذرّوں نے چوما ہے
میں اپنی آنکھوں سے چنوں گا اُن راہوں کی خاک کے موتی
جس کے سائے میں آسودہ روحِ غزالِ نبوّت ہے
اُس کالی کملی پہ نچھاور شاہوں کی پوشاک کے موتی
ہم سے فقیروں کی جھولی میں اے قاصدؔ مل سکتے ہیں
قلبِ گداز کے لعل و جواہر اور چشمِ نم ناک کے موتی

ایک غزل کے چند شعر دیکھیے:

نکہتِ گل کی طرح پھیل گئے شہر میں ہم
کس قرینے سے پریشاں ہیں ترے شہر میں ہم
کل تو صحرا میں بھی رونق تھی ہمارے دم سے
آج تنہا نظر آتے ہیں بھرے شہر میں ہم
پھر ہواؤں سے پتا پوچھ رہے ہیں تیرا
پھر تجھے ڈھونڈنے نکلے ہیں ترے شہر میں ہم
دشت میں ہوتے تو پیڑوں سے لپٹ کر روتے
اپنے دکھ درد سنائیں تو کسے شہر میں ہم

قاصد عزیز مشاعروں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے بڑے چست فقرے کستے تھے اور کہیں محمود صدیقی ساتھ ہوں تو پھر فقرے زیادہ ہی چست ہو جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ تلوّن مزاجی اپنے پورے شباب پر آئی ہوئی ہے۔ یہاں تلوّن مزاجی کے ذکر سے حافظے میں محفوظ کسی استاد کے دو شعر یاد آ گئے جس میں تین قافیوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ شاعر کا تو نام یاد نہیں رہا، یہاں لکھ دیتا ہوں کہ محفوظ ہو جائیں گے:

کئی گزرے سَن، ترا کم تھا سِن کہ لیے تھے سُن ترے گھونگرو
میں ہوں مُرتہَن، تُو ہے مُرتہِن، زر ہیں رہن ترے گھونگرو

تری خو تلوّنِ طبع کی ترے پانوؤں میں بھی آ گئی
کہیں بولے چھَن، کہیں بولے چھَن، کہیں بولے چھُن ترے گھونگرو

پرانے اساتذہ ایسی کاری گری دکھایا کرتے تھے، پرانے لوگوں نے انشائے مادھورام، سہ نثرِ ظہوری، مینا بازار وغیرہ کتابیں پڑھی ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اساتذہ نظم ونثر دونوں میں کیسی کیسی صنعتیں پیدا کرتے تھے۔ ہمیں ایک کتاب ''انشائے عجیب'' بھی ملی تھی اس میں واقعی نثر و نظم کے عجائبات جمع کر دیے تھے۔ پورے پورے قصائد و مضامین کہیں صنعتِ منقوطہ و غیر منقوطہ میں، کہیں صنعت رقطا و خیفا میں بیان کیے گئے تھے نہ معلوم یہ کتاب کہاں ضائع ہوگئی بے شبہہ یہ کاری گری ہے، لیکن طلبہ کے لیے بڑی مفید ہے اس سے لفظوں کا صحیح استعمال آتا ہے، مترادفات کی بہتات ہو جاتی ہے۔ ذہن خاص قسم کی مشق میں ڈھل جاتا ہے اور جب آدمی لکھنے بیٹھتا ہے یا مشق سخن کی طرف مائل ہوتا ہے تو الفاظ دست بستہ اس کی حضوری میں آموجود ہوتے ہیں، اب اسے اختیار ہوتا ہے کہ جس لفظ کو جہاں چاہے بے تکلف استعمال کرے۔ اب نہ وہ کتابیں رہیں نہ پڑھنے والے رہے اور نہ پڑھانے والے رہے۔ کون اتنی مشقت اٹھائے، کون اتنا وقت برباد کرے۔ سہل انگاری کا دور ہے بس ہر چیز ریڈی میڈ تیار مل جائے۔

بہر حال، قاصد عزیز بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کی بے لوث محبت اور وفا شعاری اکثر یاد آجاتی ہے۔ آدمی بھی کیا ہے پوری زندگی میں تھوڑے ہی عرصے ساتھ رہتا ہے اور چل دیتا ہے، لیکن اس عرصے میں عشق کا پودا دل میں اگا جاتا ہے۔ حافظ:

بعمرے یک نفس با ما چو بنشینند برخیزند
نہالِ شوق در خاطر چو بنشینند بنشانند

اسی کو اردو کے ایک شاعر نے اس طرح کہا ہے:

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تجھے میری وفا میرے بعد

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا کلام منظر عام پر آئے۔ اس پر ان کے بڑے صاحب زادے مجاہد عزیز کو توجہ دینی چاہیے۔

☆☆☆

آپا جان (والدۂ محترمہ)

(۱۹۲۹ء۔حیات ہیں)

اسلام میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے مکرم ومحترم والدین ہیں اوران کا درجہ بھی بہت بڑا ہے۔قرآنِ مجید میں ہے: وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔

اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ سے حسن سلوک کیا کرو۔اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی اُف بھی مت کرنا،اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکسار سے جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا۔اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا۔(سورۃ نبی اسرائیل ۲۴)

اسی طرح احادیث میں ماں باپ کی عظمت و مرتبے کو بیان کیا گیا ہے۔حضرت ابودرداءؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ ''باپ جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔'' عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے،'' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ سے زیادہ ماں کا درجہ بتلایا ہے اور ماں کو حسن سلوک کا زیادہ مستحق قرار دیا ہے۔حدیث شریف میں ہے: اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الأُمَّهَاتِ۔ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمھاری ماں اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، پھر تمھارا باپ۔'' (بخاری)

غرض ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ دنیا کی ہر بڑی شخصیت نے ماں کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ ماں اپنے خون سے اولاد کی پرورش کرتی ہے۔ اس کی گود ہی علم و تہذیب کا اولین گہوارہ ہوتا ہے۔ عورت کا یہ پہلو ایسا ہے جس کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ ماں باپ سے سب ہی کو محبت ہوتی ہے۔ ان کی خدمت بجالانا ہر کوئی اپنا فرض سمجھتا ہے، لیکن کچھ بدبخت ایسے ہوتے ہیں جو ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اپنی جوانی کے جوش میں ماں کو چھوڑ بیوی کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں، ماں اس کے غم میں آنسو بہاتی رہتی ہے اور وہ اپنے عیش و عشرت میں مگن بے پروا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی دنیا و آخرت دونوں برباد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

میں اپنی والدہ کو بچپن سے ہی 'آپا جان' کہتا آیا ہوں اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔ دراصل وہ زمانہ بڑا ہی شرم و حیا کا زمانہ تھا جب بچے پیدا ہوتے تو شرم کے مارے ماں باپ بچوں سے 'ابا' یا 'اماں' نہیں کہلواتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بزرگوں کی موجودگی میں 'اماں، ابا' کہلوانا اچھا معلوم نہیں ہوتا، اس سے خود بزرگی کا شائبہ ہونے لگتا ہے اس لیے بہت سے گھرانوں میں بھابی، آپا، بیا، بھائی، بابو جی، پاپا وغیرہ الفاظ سے بچے ماں باپ کو پکارتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ سے بھی 'آپا جان' کہلوایا گیا، لیکن میرے بعد جو بچے ہوئے وہ امی، ابا ہی کہنے لگے ہیں۔

ماں سے ہر ایک کو فطری محبت ہوتی ہے۔ مجھے بھی اپنی ماں سے بہت محبت ہے، بہت پیار ہے۔ ان کی کم سنی میں شادی ہوگئی تھی اور میں اس وقت پیدا ہوا جب ان کی عمر پندرہ سولہ سال کی رہی ہوگی۔ پوڈر کے دودھ کا وجود نہ تھا، اوپر کا دودھ پلانا پسند نہیں کیا جاتا تھا، نہ آج

کل کی نوجوان لڑکیوں کی طرح تھا کہ دودھ ہی نہیں اترتا۔ خالص غذائیں کھائی تھیں لہٰذا دودھ بھی وافر مقدار میں تھا اور ہم نے جم کر دو سال تک خوب ہی دودھ پیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہاتھ پیروں سے خوب مضبوط تھے۔

آپا جان، اللہ تعالیٰ انھیں قائم ودائم رکھے، بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ میری نانی والد صاحب کی حقیقی تایازاد بہن تھیں، سب میں بڑی تھیں لشکر گوالیار میں بیاہی گئی تھیں اس لیے جے پورا پنے میکے آنا ہوتا تھا۔ میرے بڑے دادا حافظ محمد عبدالکریم صاحب حافظ نے سب خواتین کو پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ چناں چہ حافظ صاحب نے آپا جان کو پڑھایا، تختی بھی لکھوائی۔ وہ قران حکیم کے ساتھ ہر قسم کی دینی کتابیں پڑھ لیتی ہیں۔ ہم نے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی درسی کتابیں پڑھیں ہیں۔ آپا جان کو اب تک اسلم کی بلّی، پن چکی، آمد صبح اور بنجارہ نامہ زبانی یاد ہے۔ کبھی موڈ میں ہوتی ہیں تو بچّوں کو ترنم سے یہ نظمیں سناتی ہیں۔ اتنی معمولی تعلیم، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچّوں کی بہت بہتر انداز میں تربیت کی اور ان کی دینی دنیوی تعلیم کے حصول میں والد صاحب کی ہر طرح معاونت کی۔ الحمدللہ تین بھائی حافظ ہوئے۔ انجینیئر و ڈاکٹر ہوئے۔ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ لڑکیاں بھی بیچلر اور ماسٹر کی ڈگریاں رکھتی ہیں۔ آپا جان جن نامساعد حالات سے گزری ہیں ان کے ہوتے ہوئے اعلیٰ تعلیم تو کجا معمولی تعلیم کا حصول بھی ممکن نہ تھا۔ یہ ان کی کاوش ومحنت تھی انھوں نے ہر طرح مشقتیں برداشت کیں، دو وقت نہیں ایک وقت کھانا کھایا، مگر اولاد کی تعلیم میں کوئی رخنہ نہیں آنے دیا۔ غربت نصیب ماں کو تند وتیز باتیں سنی پڑیں، مگر وہ سب سے بے پرواہ اپنے مقصد کی لگن میں بڑھتی رہیں۔

حالات اور ماحول کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بچّوں کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشوں کا جب خون ہوتا ہے تو وہ غلط راہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ آپا جان کو ہمیشہ یہ خیال دامن گیر رہا۔ پہلا لڑکا میں ہی تھا۔ زیادہ امکانات تھے کہ حالات سے تنگ آ کر غلط راہ اختیار کر سکتا تھا اور کچھ نہیں تو تعلیم کو ادھوری چھوڑ سکتا تھا، مگر انھوں نے ایسا سخت رویہ رکھا کہ غلط قسم کی باتوں کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ برقع اوڑھے میرا تعاقب کرتیں۔ میرے ہر

فعل پر نظر رکھتیں، تعلیم میں غفلت برتتا تو خود بھی مارتیں اور والد صاحب سے الگ پٹواتیں، بس ایک ہی خیال ان کے ذہن میں سمایا ہوا تھا کہ میری اولاد دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز ہو۔ وہ اپنے سخت رویّے سے ماں نہیں دشمن معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے رویّے کو دیکھ کر پڑوسی یہی سمجھتے تھے کہ میں سوتیلا بیٹا ہوں۔ زمانے کے تغیرات دیکھو آج بچّوں کو بہت لاڈ پیار سے پالا جاتا ہے۔ ان کی غلطیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچّے پر سختی نہیں کرنی چاہیے۔ زیادہ سختی بغاوت پر آمادہ کرتی ہے اور مار پیٹ تو قطعاً نہیں ہونی چاہیے اس سے ذہنی صلاحیتیں مسخ ہو جاتی ہیں، ایسی نفسیاتی گرہیں پڑ جاتی ہیں کہ پھر ان کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بچّے غلطی کرتے ہیں تو ماں باپ سمجھاتے ہیں اگر وہ نہ مانیں تو چھوڑ دیتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود سمجھنے لگے گا۔ اس طرح ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں اور یہ سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے تک طبیعت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہمارا بچپن تھا، ہمیں بھی بہت لاڈ پیار سے پالا گیا تھا، مگر بے جا لاڈ پیار نہیں۔ حالات کے پیشِ نظر سختیاں بھی کی جاتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماں باپ، استاد، محلّہ پڑوس، سب ہی غلط بات دیکھتے تو منع کرتے اور نہیں مانتے تو پھر مارتے تھے، کیسی ضد، کیسی نافرمانی سب دھری کی دھری رہ جاتی۔ الحمدللہ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکا ہوں، نہ ذہن مسخ ہوا، نہ نفسیاتی گرہ پڑی۔ ہاں زندگی گزارنے کا سلیقہ آ گیا۔ یہ تنہا میرے ساتھ ہی نہیں تھا بلکہ اس دور کے ہر بچّے کے ساتھ یہی معاملہ تھا آج وہی روشن ستاروں کی طرح افق عالم پر جگمگا رہے ہیں اس کے برعکس وہ بچّے جن پر کسی بھی قسم کی تنبیہ روا نہیں رکھی گئی ہر قسم کی خرابیوں کی آماج گاہ بنے ہوئے ہیں۔

آپا جان بڑی صابر و شاکر خاتون ہیں۔ کیسے ہی سخت حالات ہوئے صبر و شکر کا پیکر بنی رہیں۔ شکوہ کیا ہوتا ہے یہ انھیں آتا ہی نہیں۔ نہ انھوں نے کبھی زیور کی تمنا کی، نہ اچھا کھانے اور پہننے کی، جو مل گیا کھا لیا جیسا موٹا جھوٹا میسّر آیا پہن لیا، کم زور ترین حالات میں بھی شکر گزاری کے جذبات سے لبریز رہیں اور نعمتیں ملیں تو بھی اللہ کے شکر میں رطب اللّسان۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم ۷)

یہ ان کی محنت ایثار و قربانی اور صبر و شکر کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو دنیاوی اعتبار سے سرفراز کیا امید کی جاتی ہے کہ آنے والی دنیا میں بھی سرفرازی نصیب ہوگی۔

آپا جان بڑی وفا شعار خاتون ہیں۔ اطاعت گزاری ان کا خاصہ ہے۔ انھوں نے ساری زندگی والد صاحب کی خدمت کی، ان سے وفا کرتی رہیں ان کے ہر کام میں معاونت کی، ان کے غصّے کو کبھی غصہ نہیں سمجھا، ان کی بات کو کبھی رد نہیں کیا، ان کے متعلقین سے کبھی نہیں بھاگیں، بلکہ گلے لگائے رکھا۔ زندگی بڑے تلخ ترین حقائق سے مملو ہوتی ہے۔ اپنے پرائے سب کے ساتھ محبت و اخلاص سے زندگی گزارنا جہادِ اکبر سے کم نہیں اور اس جہادِ زندگانی میں انھوں نے عزم و ہمت، استقلال و استقامت، صبر و توکل، سوجھ بوجھ، سلیقہ اور پامردی سے وقت گزارا۔ مشترکہ خاندانی نظام میں تو قدم قدم احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساس نندوں کی آنکھیں ہمہ وقت نگراں رہتی ہیں اسی لیے آج کی نوجوان لڑکیاں اس سے باغی ہیں۔ وہ شادی ہوتے ہی اپنے میاں کو بغل میں دبا کر چلی جاتی ہیں، لیکن آج سے ربع صدی پہلے تک ایسا نہیں تھا اور آج بھی بعض گھرانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ زمانہ قدیم تہذیبی قدروں کا حامل تھا۔ خاندان کے خاندان جتھے بندیوں کے ساتھ رہتے تھے ان کے اپنے محلّے ہوتے تھے، ان کے اپنے قبرستان ہوا کرتے تھے، صدیوں سے آباد ایک محلّے میں رہتے تھے۔ شادی بیاہ بھی مخصوص خاندانوں میں ہوتی تھی۔ معاشرے کا ایسا مربوط نظام تھا کہ اس سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ جب بہوئیں بیاہ کر آتیں تو گھر کی بزرگ خواتین سے لے کر محلہ پڑوس کی بزرگ خواتین تک پند و نصائح کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتیں اور وہ بہو ہر موقع پر ان کا تختۂ مشق بنتی رہتی۔ ایسے میں زندگی گزارنا کتنا دشوار ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔

گھر میں ایک بزرگ سقّہ پانی بھرنے آتے تھے، مزاجاً بہت سخت تھے۔ پیڑھی در پیڑھی ان کے بزرگ پانی بھرتے آئے تھے اس لیے وہ گھر کے اور افراد کی طرح اپنا حق محفوظ رکھتے تھے۔ جب وہ پانی بھرنے کے لیے پیٹھ پر مشک لاد کر لاتے اور صحن میں کوئی چیز پڑی ہوئی پاتے تو سخت ناراض ہوتے، اس چیز کو ٹھوکریں مار مار کر اِدھر اُدھر لڑھکاتے جاتے اور برستے رہتے کہ یہ بہوؤں کے ڈھنگ ہیں، یہ طور طریقے اور لچھن ہیں، ہم نے کبھی نہیں دیکھے،

انھیں صفائی ستھرائی کا کچھ خیال نہیں، کیسے چلے گا یہ گھر، حافظ صاحب قبلہ اُتر کر آتے، ان سے بہت ہی عاجزانہ اور نرمی سے فرماتے، پہلے آپ پانی ڈال دیں، یہ بوجھ تو اتار دیں پھر ناراض ہو جایئے گا، مگر وہ تھے کہ مسلسل بہوؤں پر برستے رہتے اور بہویں تھیں کہ چپ چاپ کان دبائے اپنی کوٹھری میں بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں کہ اب ساس نندوں کی جھڑکیاں بھی سنی پڑیں گی۔ بڑی مشکل سے حافظ صاحب انھیں ٹھنڈا کرتے، بٹھاتے، پانی پلاتے، ہرگز ایک لفظ بھی نہیں کہتے اور ان کے اکرام میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں کرتے۔ کیسا اچھا معاشرہ تھا گھر میں کام کرنے والوں کو اونچ نیچ، ذات پات کے فرق و امتیاز سے بے نیاز گھر کا فرد ہی سمجھا جاتا تھا اور کام کرنے والا بھی گھر کے دیگر افراد کی طرح اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کرتا۔ گھر میں اس وقت صرف دو ہی بہویں تھیں، ایک میری تائی اور ایک آپا جان۔ یہ دونوں ان سے اتنا ڈرتی تھیں کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے صحن کو صاف کر دیتیں ایسا کہ ایک تنکا بھی پڑا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ حضرت اگر روزانہ صحن صاف ستھرا نہ دیکھیں تو یقین ہے کہ مشک وہیں انڈیل دیں اور زمین پر لوٹ لگانے لگیں۔

آپا جان نے تمام تہذیبی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ساس، نندوں کے درمیان زندگی گزاری۔ ہماری ایک پھوپھی، جو گوالیار میں بیاہی گئی تھیں اپنے چار بچّوں کے ساتھ آکر رہ گئی تھیں، سخت تھیں، سیاسی پینترے نہ معلوم کیسے ان کے مزاج میں در آئے تھے۔ بھائیوں پر ان کے حکم کا سکّہ چلتا تھا، وہ دن کہیں تو دن، رات کہیں تو رات، ماں اور خالہ بھی انھیں کے مشوروں پر گامزن تھیں۔ بھلا ایسے میں بے چاری بہو اور اس کی بات کس گنتی اور شمار میں ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ دونوں بہویں ان کے عتاب سے پناہ مانگتی تھیں، لیکن ہماری نانی جو خود بھی اسی گھر کی بیٹی تھیں اور سب سے بڑی تھیں، مزاج بھی سخت پایا تھا پھر ان کے دونوں بھائی ہمارے پھوپھا بھی تھے اسی لیے بھی والدہ عام گھروں کی نسبت زیادہ محفوظ تھیں اور ان کے طفیل ہماری بھابی جان (تائی) بھی۔

۱۹۴۷ء میں سب پاکستان چلے آئے۔ والد صاحب دو سال بعد ہمیں لے کر آئے۔ رام سوامی کے ایک فلیٹ میں سب ہی ساتھ رہتے تھے۔ یہیں دادی کا انتقال ہوا۔ بعد میں

والد صاحب، دادا، چچا اور ہم سب پی این ٹی کالونی منتقل ہو گئے۔ اس وقت عورتوں میں تنہا والدہ ہی تھیں، انھوں نے سب کی خدمت کی، دادا کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا۔ وہ والدہ کو دعائیں دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہم چھوٹے تھے آپا جان ہمارے مقابلے میں چچاؤں کو ترجیح دیتیں، ان کا ہر طرح خیال رکھتیں، مظفر لطیف صاحب ان کے بہت چہیتے تھے۔ وہ ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب اس وقت پڑھتے تھے۔ آپا جان نے اپنے دیوروں کی جس طرح خدمت کی اس کا اجر تو صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ انھوں نے مظفر صاحب اور چشتی صاحب کی شادیاں کیں دلہنوں کو اپنے پاس لا کر پی این ٹی کالونی کے چھوٹے سے کوارٹر میں بڑے چاؤ چوچلوں سے رکھا۔ ان کی ہر خواہش کو جو بساط میں ہوتا پورا کرتیں، کچھ وقت تو بحسن و خوبی گزر گیا، لیکن جب دلہنوں کو بزرگوں کی ضرورت نہ رہی تو والد صاحب حیدرآباد منتقل ہو گئے، اسی کو اپنا مستقل مستقر بنایا ایسا کہ پھر اسی خاک میں پیوند ہوئے۔ اب یہاں ہم نسبتاً زیادہ خوش تھے کہ آپا جان کی محبت کا مرکز صرف اور صرف ہم ہی تھے، لیکن تنہائی میں وہ اکثر چچاؤں کو یاد کرتیں، خاص طور پر جب کبھی مجھے انڈے کا حلوہ بنا کر دیتیں تو جذبات سے بے قابو ہو جاتیں اور انھیں یاد کر کے رو دیا کرتی تھیں، مظفر صاحب روزانہ انڈے کے حلوے سے ناشتا کرتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن آج بھی ان کی یاد میں تڑپ اٹھتی ہیں۔

حیدرآباد سندھ میں آپا جان کی تمام تر توجہ کا مرکز ہم تھے۔ یہاں سخت ترین حالات میں جس طرح صبر و شکر سے وقت گزارا وہ ان کی عظمت کو سلام کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں ان کی کن کن باتوں کو بیان کروں، ان کی ہر ادا شفقت و محبت میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کے نو بچے ہیں میرے اور سب سے چھوٹے کے درمیان بائیس سال کا فرق ہے۔ سب سے یکساں محبت، سب سے یکساں معاملہ، سب ہی پر بھرپور توجہ، نہ وہ کسی کے لیے زیادہ رہیں نہ کسی کے لیے کم۔ میں نے تو بہت کم عمری میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے کے لیے ملازمت شروع کر دی تھی اس کے باوجود ان کا رویہ سب سے ایک سا تھا البتہ مجھ پر بچپن میں جو سختی روا رکھی گئی تھی وہ آج بھی برقرار ہے۔ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو ڈانٹنے ڈپٹنے

سے اب بھی گریز نہیں کرتیں۔ وہ اپنی بات کو پہلے سے ذہن میں اتار دیتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو اہلیہ سے باتوں باتوں میں کہہ ڈالتی ہیں اور ہم ہیں کہ چاہتے نہ چاہتے اس پر عمل کرتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اب تو بیوی نے بھی وہی ڈھنگ اختیار کر لیا ہے، اور ہم دو پاٹوں کے درمیان پسنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جس طرح آپا جان نے اپنے دیوروں سے محبت کی، ان کی خدمت کو اپنا فرض جانا، اسی طرح اہلیہ نے بھی کیا چھوٹے دونوں دیوروں کی شادی کرائی۔ بڑی قابل لڑکیاں تلاش کیں آج عزت وسکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھ سے چھوٹے بھائی کی بیوی کا انتقال ہوا تو وہ بہت زیادہ مایوسی و محرومی (frustration) کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کو سنبھالا، اس کی ایک پڑھی لکھی لیکچرر سے شادی کرائی۔ اس کی بچیوں کو دل و جان سے چاہا، ایک بچی کی بہت اچھی جگہ شادی کرا کر ذمے داری سے سبکدوش ہوئیں، مگر اس قسم کے کاموں میں جو صلہ ملتا ہے، وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ الاقارب کالعقارب۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے اور ہدایت نصیب فرمائے۔ میں تو اکثر آپا جان سے کہتا ہوں کہ تم نے اپنی بہو پر خوب جادو چلایا ٹھیک اپنے نقشِ قدم پر ڈھال لیا۔

آپا جان بڑی نیک ہیں۔ بہت زیادہ نہیں جتنا ہو سکتا ہے عبادت و ریاضت میں وقت صرف کرتی ہیں۔ روزہ نماز کی پابند ہیں۔ ہندوستان میں ہی امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی (حضرت جی) سے بیعت ہو گئی تھیں۔ اب زیادہ وقت قرآنِ کریم کی تلاوت اور ذکر و شغل میں گزارتی ہیں۔ محمد عبدالواسع کے پاس رہتی ہیں کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ ہم خوشامد سے لے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں چلتا پھرتا رکھے۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر و احسان ہے کہ آپا جان نے ایک مسلمان خاتون کی جو ذمے داریاں ہوتی ہیں، جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں وہ بحسن وخوبی انھوں نے پورے کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد دین و دنیا دونوں کی حامل ہے۔ کم زوریاں اور خامیاں کہاں نہیں ہوتیں، لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خرابیوں کا پلّہ بھاری ہے یا خوبیوں کا۔ تربیت کا معیار تو اسی سے جانچا جائے گا۔ انھوں نے ہماری تربیت میں اور ہمارے بنانے سنوارنے میں جو تکلیفیں اٹھائیں،

جو مشقتیں برداشت کیں اس کا صلہ تو ربّ العزت ہی دے سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا پورا اجر عطا کرے گا۔ آخر میں بارگاہ ربّ العزت میں دعا ہے کہ آپا جان کا سایہ ہم پر تادیر قائم رہے تاکہ ان کی دعائیں تمام مصیبتوں اور پریشانیوں، حادثوں اور تکالیف کو ہم سے دور رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کی خدمت کر سکیں۔ آمین۔

علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی اسرار و رموز کے آخر میں ''خطاب بہ مخدراتِ اسلام'' میں مسلمان خاتون کی عظمت و رفعت کو بیان کیا ہے اور دورِ حاضر کی فریب کاریوں کی بڑے پرسوز انداز میں عکاسی کر کے دردمندانہ مشورہ دیا ہے کہ مسلمان خاتون حضرت فاطمہ زہراؓ کی زندگی کو نمونہ بنائے تو آج پھر اس کی گود سے اسوۂ شبیری کے حامل اٹھ کر حق و صداقت کا علم بلند کریں اور ملّت اسلامیہ پھر قرونِ اولیٰ کے دور میں داخل ہو جائے۔ علامہ کہتے ہیں:

خطاب بہ مخدّراتِ اسلام

اے رِدایت پردۂ ناموسِ ما ... تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

طینتِ پاک تو ما را رحمت است ... قوّتِ دین و اساسِ ملّت است

کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست ... لا اِلٰہ آموختی او را نخست

می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما ... فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

برقِ ما گو در سحابت آرمید ... بر جبل رخشید و در صحرا تپید

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق ... در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق

دورِ حاضر تر فروش و پُرفن است ... کاروانش نقدِ دیں را رہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراکِ او ... ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ او

چشمِ او بیباک و ناپرواستے ... پنجۂ مژگانِ او گیراستے

صیدِ او آزاد خواند خویش را ... کشتۂ او زندہ داند خویش را

آب بند نخلِ جمعیت توئی ... حافظِ سرمایۂ ملّت توئی

از سرِ سود و زیاں سودا مزن ... گام جز بر جادۂ آبا مزن

ہوشیار از دستِ بردِ روزگار ... گیر فرزندانِ خود را در کنار

اینٔ چمن زاداں کہ پر نکشادہ اند　　　ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند　　　چشمِ ہوش از اسوۂ زہرؓا مبند

تا حُسینےؓ شاخِ تو بار آورد

موسمِ پیشیں بگلزار آورد

اے مسلمان خاتون! تیری چادر ہماری عزّت کی محافظ ہے اور اے کہ تیرا شعلہ ہمارے فانوس کے لیے روشنی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

تیری پاکیزہ سرشت ہمارے لیے رحمت ہے، ہمارے دین کی قوت اور ہماری ملت کی بنیاد ہے۔

بچّے نے جب اپنے ہونٹ تیرے دودھ سے تر کیے تو تُو نے اسے توحید کا درس دیا۔

ہمارا عمل، ہماری گفتار اور ہمارا فہم و ادراک تیری مہر و محبت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

ہماری نظارہ سوز بجلیاں تیرے ابر میں پوشیدہ تھیں، کبھی پہاڑوں پر چمکیں اور کبھی صحراؤں میں انھیں بے تاب دیکھا۔

تو دستورِ شریعت کی امین ہے اور تیری ہر سانس میں دینِ حق کا سوز پایا جاتا ہے۔

دورِ حاضر بڑا مکار و عیار ہے اور پُرفن ہے۔ ظاہر کچھ، باطن کچھ، اس کے قافلے میں دین کی متاع لوٹی جاتی ہے۔

یہ عقل کا اندھا ہے، دل کا مردہ ہے اس کا فہم خدا کو نہیں پہچانتا، کوتاہ چشم اس کے چکر میں قیدی بن چکے ہیں۔

اس کی آنکھیں بے باک، شوخ اور بے پردہ ہیں۔ اس کی مژگان کا پنجہ جہاں پڑ جائے گڑ جاتا ہے۔

جو جو اس کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے اور جو اس کا کشتہ ہو چکا ہے وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے۔

اے مسلمان خاتون! تجھی سے امید ہے کہ اس فتنہ انگیز دور میں تو ملّت کے اس

مرجھائے ہوئے نخل کی آبیاری کرے گی، تو ہی ہماری ملت کے سرمائے کی نگہبان ہے۔

تو بھلے اور برے، نفع ونقصان کے اعتباری فرق میں نہ الجھ، اپنے آبا ؤ اجداد کا سچا مسلک اختیار کر۔

اے محترم ہستی! وقت کی دست درازیوں سے ہوشیار بچّوں کو اپنی آغوش شفقت میں چھپا لے، تاکہ وہ زمانے کی مسموم ہوا سے محفوظ رہیں۔

یہ چمن میں پیدا ہوئے، ان نونہالوں نے ابھی اپنے پر نہیں تولے اور اپنے گھونسلے سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں گھیر کر پھر اپنے مرکز کی طرف لے آ۔

اے مسلمان خاتون! تیری فطرت میں پاکیزگی اور بلند جذبے موج زن ہیں تو ہوش کی نظر حضرت فاطمہؓ کے نمونے پر جمائے رکھ۔

تیری شاخ میں بھی حسینؓ جیسا پھل لگے اور ملت کے اس گلزار میں پھر پہلی سی بہار آجائے۔



سمیّہ —— میری بیٹی

(۱۹۷۹ء۔حیات ہے)

اولاد کس کو پیاری نہیں ہوتی ، اپنے جگر گوشوں کو کون عزیز نہیں رکھتا۔کون ہے جو زندگی کے حفظ و بقا کے لیے کوشاں نہیں رہتا۔کس کی حیات کا ہر ورق جہد مسلسل سے عبارت نہیں ہوتا، لیکن اولاد کی موجودگی میں جہد و عمل کی تمام قوتوں کو ایک مقصد مل جاتا ہے۔ وہ اپنے قوائے ذہنیہ میں ایک لائحۂ عمل از خود مرتب کر لیتا ہے، جس کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے اور اولاد کی تربیت کرتا ہے۔اس کی زندگی کی ساری لذت، ساری دل فریبی، ساری رعنائی، سارا جوش اولاد کی موجودگی میں فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ لوگوں سے محبت کرتا ہے تو اس عنوان سے کہ کون اس کے پیاروں کو چاہتا ہے، کون ہے جو ان کی خوشیوں میں شریک ہوتا ہے۔ وہ بالطبع انھیں کو اپنا محبوب رکھتا ہے جو کسی بھی طور اس کی اولاد کے لیے نفع رساں ہوں، وہی چیز اسے مرغوب ہوتی ہے جو ان کی پسند ہوتی ہے۔فطرۃً وہ ان تمام چیزوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کی اولاد کے لیے نقصان کا باعث ہوں، یہی جذبات اور انھیں احساسات سے اس کی زندگی کا تار و پود تیار ہوتا ہے اور شب و روز اسی میں بسر کرتا ہے۔

میری بیٹی سمیّہ، موٹی موٹی بڑی بڑی آنکھیں، گول بھرا ہوا چہرہ، متناسب اعضا، مجموعی حیثیت سے بہت خوب صورت ہے۔والد صاحب نے پہلی مسلمان شہید خاتون کے نام پر سمیّہ نام رکھا جو کلمۂ حق ادا کرنے پر ظلم و ستم کا نشانہ بنیں اور بالآخر ابو جہل لعنۃ اللہ نے نیزہ مار کر انھیں شہید کر دیا:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سمیّہ رنگ روپ، ذہانت و ذکاوت، رفتار گفتار، اخلاق و کردار سب میں اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ہنستی ہے تو کائنات کی ہر شے میں زندگی کے آثار نمایاں نظر آنے لگتے ہیں،

اس کو دیکھ کر ہر ایک کا چہرہ نو دمیدہ پھولوں کی طرح کھل اٹھتا ہے، ہر کوئی اس کی حسین مسکراہٹ پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کی بھولی بھولی معصوم باتیں مقناطیسی کشش رکھتی ہیں، اس کا مسکراتا ہوا کھلا کھلا چہرہ اس کے قلب کی پاکیزگی کا مظہر ہے۔ اس کی آنکھوں میں بچپن ہی سے ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی ہے جو اس کی ذہانت کی غماز ہے۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی تعلیمی درجات میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتی گئی۔ بعض لوگوں کو قدرت ذہانت و ذکاوت کا وافر حصّہ مرحمت فرماتی ہے۔ اسی کے سبب وہ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ ذہانت بلاشبہہ بہت ہی اچھی چیز ہے لیکن یہی ذہانت اس وقت منفی رویّوں میں ڈھل جاتی ہے جب ذہانت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ پھر تو آدمی 'ہم چو من دیگرے نیست' کی گرفت میں ایسا آتا ہے کہ اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں رہ جاتی، اور جا و بے جا ہر جگہ ٹانگ اَڑانا اس کا شعار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ایک فن کا ماہر ہے، دوسرے فنون میں اس کی معلومات واجبی سی ہوتی ہیں لیکن وہ بزعمِ خود یہ سمجھ لیتا ہے گویا وہ کائنات کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے، یہی فکر خودسری، خودستائش اور کبر و تکبّر کا ایسا رخ اختیار کر لیتی ہے کہ عجز و نیاز، ادب و اخلاق سب سے آدمی عاری ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے پھل دار درخت جھکا ہی رہتا ہے۔ اپنے بوجھ کے سبب نہیں ازراہ عجز و نیاز، نفع رسانی کے لیے۔

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ سخا اور زیادہ

اور ذہانت انھیں معنی میں خوش رنگ نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ذہانت کے منفی رویّوں سے اللہ سب کو محفوظ رکھے۔ سمیّہ محنتی نہیں ہے، لیکن اپنی ذہانت و ذکاوت کے بل بوتے پر کامیاب رہتی ہے۔ وہ حسّاس طبع بھی واقع ہوئی ہے۔ بہت ذرا سی بات کو بھی اپنے دل و دماغ پر مسلّط کر لیتی ہے اور کئی کئی دن احساس کے دائرے میں مقید رہ کر تڑپتی رہتی ہے۔ بے شبہہ اس کا تعلق بھی ذہانت سے ہی ہوتا ہے۔

سمیّہ فطرۃً سادہ طبیعت ہے۔ جانتی ہے عورت کا دائمی زیور سادگی ہی میں ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سر جھاڑ منہ پہاڑ گھر میں بیٹھی رہے یا موجودہ دور کے تقاضوں سے قطعاً ہم

آہنگ نہ ہو۔ وہ اپنے دائرے میں رہتے ہوئے سلیقہ شعاری سے زندگی کے کل معاملات میں حصّہ لیتی ہے۔ بیوٹیشن کا اس نے کورس بھی کیا ہے، کھانے پینے اور پکانے کا بھی بڑا ذوق ہے۔ لباس کے انتخاب میں بھی اس کو بڑا سلیقہ ہے یہاں تک کہ میرے لیے بھی وہ لباس کا انتخاب کرتی تھی۔ اب نہ معلوم اس کے شوہر اس کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں یا نہیں۔ گھر کو آراستہ کرنے کا حد سے زیادہ شوق ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ گھر کو بہتر سے بہتر بنا دے کہ دیکھنے والے اس کے سلیقے اور حسن ذوق کو سراہیں۔

میں نے زندگی میں دو خواہشیں کی تھیں ایک یہ کہ میرا بیٹا حافظ ہو جائے۔ دوم میری بیٹی ڈاکٹر ہو جائے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے میری دونوں خواہشیں پوری کر دیں:

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

سمیہ ایم بی بی ایس فائنل میں تھی کہ ہم نے اس کی شادی کر دی۔ وہ امریکا چلی گئی اس کے شوہر فرحان شمس بھی ڈاکٹر ہیں اور بڑے ذہین و ذکی آدمی ہیں۔ اپنے منصب میں بڑی توجہ سے سرگرم عمل رہتے ہیں، اس کا ہر کوئی معترف ہے۔ ویسے بھی یہ پیشہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ اخلاص سے اگر کیا جائے تو اس سے بڑی انسانیت کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب اور جان پہچان کے لوگوں کی اس سلسلے میں بھرپور معاونت کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں اللہ نے اتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ جتنی بڑی نعمت ہے اتنا ہی بڑا اللہ کے ہاں اجر بھی ہے۔ دولت تو آنی جانی شے ہے آج ہے کل نہیں، لیکن یہ دولت ایسی ہے جو روز افزوں بڑھتی رہتی ہے۔ جو لوگ ان کے ہاتھوں شفایاب ہوتے ہیں یقیناً وہ ان کے حق میں ضرور دعائیں کرتے ہوں گے، دعاؤں سے بڑھ کر اور آپ کو کیا چاہیے۔ یہ ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے بعد بچیوں کی تعلیم ادھوری ہی رہ جاتی ہے۔ سسرال کے لوگوں کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی شدّ و مد سے زبانی یہ راگ الاپتے نظر آتے

ہیں کہ ہم تعلیم کے حامی ہیں، ہماری پوری کوشش ہے کہ تعلیم مکمل ہو، مگر عملی طور پر ایسے اقدامات کرتے ہیں کہ پڑھنے کے لیے وقت نہ مل سکے۔ اس طرح قصوروار بچیاں ہی گردانی جاتی ہیں، اوران کی ذہانت بھی تنقید کا نشانہ بنتی ہے اور اگر بچّے ہو جائیں تو پھر اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔ کہاں کی پڑھائی، کیسی تعلیم، بچّوں سے فرصت ملے تو پڑھیں۔ سمیّہ کے شوہر اور ساس کو تعلیم سے گہری دلچسپی ہے اس لیے اس کی تعلیم مکمل ہوگئی، لیکن امریکا میں یہاں کی تعلیم کوئی حیثیت نہیں رکھتی تاوقتے کہ وہاں ریزیڈینسی (residency) نہ کرلی جائے۔ اس کے لیے بڑی محنت اور بہت وقت درکار ہوتا ہے اور بچّوں کی موجودگی میں وقت نکالنا انتہائی دشوار ہے۔ اس کے لیے تو مستقل ایک آدمی فارغ چاہیے۔ نظریں نانی اور دادی پر جا کرٹکتی ہیں، لیکن وہ بے چاریاں عمر کے اس حصّے میں قدم رکھ چکی ہوتی ہیں جب مختلف عوارض انھیں گھیرے رہتے ہیں، ہمّت ان کی جواب دے چکی ہوتی ہے۔ ہاں، وہ نگرانی بے شک کرسکتی ہیں، لیکن اس باب کو بہر صورت مکمل کرنا ہے۔ اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے سب ہی کو کچھ نہ کچھ تعاون کرنا ہے ایک مرتبہ یہ مرحلہ مکمل ہو جائے تو پھر مزید ترقّی کی راہیں کھل جائیں گی اور جب آدمی اپنے دل میں ٹھان لے تو بہت سی راہیں خود بخود نکل آتی ہیں۔ بظاہر سارے راستے مسدود دکھائی دیتے ہیں پھر اللہ مددگار ہوتا ہے۔ غیب سے راہیں کھلنے لگتی ہیں، عزمِ مصمّم شرط ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

سمیّہ تین بچّوں کی ماں ہے۔ سب سے پہلے ایک بیٹی پیدا ہوئی، بالکل اسی کی طرح اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے اور پورے خاندان میں سب سے نمایاں ہے۔ نام تو اس کا ''ایمان'' رکھا ہے، لیکن میرے مُنہ پر یہ نام چڑھتا ہی نہیں ہے، میں اسے 'گڑیا' ہی کہتا ہوں اور شاید ساری زندگی اسی سے مخاطب ہوتا رہوں گا۔ دوسرا بیٹا ہے۔ حماد اس کا نام رکھا ہے۔ بہت پیارا نام ہے۔ تیسری بیٹی ہے اس کا نام اریبہ ہے تینوں ہی ماشاء اللہ بہت پیارے بہت اچھے ہیں۔ ان کی بھولی بھولی معصوم شرارتوں میں دل خوب لگتا ہے۔ ننھے منے پرندے

ہیں، پورے گھر میں چہچہاتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو نظرِ بد سے بچائے، ان کی عمریں دراز کرے، ہر طرح اپنی عافیت میں رکھے، ماں باپ کی طرح خوب قابل بنائے اور دین سے خصوصی لگاؤ پیدا فرمائے۔ آمین۔

پرانے بزرگوں کے صحبت یافتہ لوگ آج بھی جب اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہیں تو یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تمھاری زندگی کا مرکز و محور تمھارا شوہر اور اس کے متعلقین ہیں۔ وہ خوش تو کل کائنات خوش۔ ہم نے بھی یہی نصیحت کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ بیوی جب اپنی حق تلفی دیکھے یا عزتِ نفس پر حملہ محسوس کرے تو اس کا شدّت سے دفاع کرے۔ بعض بچیاں ہیں جو نہایت صبر و تحمل سے سخت رویے بھی برداشت کر لیتی ہیں، ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ احتجاج کر سکیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ احتجاج کرنے کا ہر ایک کو حق ہونا چاہیے البتہ شائستگی سے، دبے لفظوں میں شوہر کو حالات و واقعات سے آگاہ کر دینا چاہیے اور شوہر کو بھی ان کی بات سنی اَن سنی نہ کرنی چاہیے بلکہ نہایت سنجیدگی سے محبت اور خوش اسلوبی سے معاملے کو نبٹا دینا چاہیے۔ اگر مسلسل شوہر کا رویہ سنی اَن سنی کا ہوگا تو پھر بیوی کی شخصیت مسخ ہو جائے گی، بدمزاجی اور چڑچڑا پن اس کی طبیعت کا حصّہ بن جائے گا اور اچھا بھلا جنت کا نمونہ گھر جہنّم بن جائے گا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ سمیّہ اس اعتبار سے بھی بڑی خوش قسمت ہے۔ شوہر بھی، ساس، سسر اور دیور سب ہی محبت کرنے والے ہیں، اس کی باتوں پر کان دھرنے والے ہیں، اس کو ہر طرح کا آرام و سکون میسّر ہے اللہ نے اسے بڑی نعمتوں سے نوازا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کرے کم ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔

اللہ تعالیٰ نے رحمت کا مادّہ مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ رکھا ہے۔ عورت تو بچپن ہی سے رحم دل واقع ہوئی ہے، بچپن میں چھوٹے بھائی بہنوں سے اس کا معاملہ رحمت سے پُر ہوتا ہے وہ ان کی غلطیوں کو اس خیال سے چھپاتی ہے کہ ان کی پٹائی ہوگی یا ڈانٹ پڑے گی۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ انھیں ذرا بھی تکلیف ہو۔ پھر اس کی ساری رحمت و رافت کا مرکز اس کے بچّے ہو جاتے ہیں اسی لیے حدیث شریف میں ماں کی محبت کی مثال دی گئی ہے۔ وہ اپنے

بچّوں، اپنے شوہر، اپنے بہن بھائی، ماں باپ اور متعلقین سب سے محبت کرتی ہے ان کی ذرا سی بھی تکلیف اسے بے چین کر دیتی ہے۔ سمیّہ بھی سب سے محبت کرتی ہے۔ میرے ساتھ جب بھی ٹیلی فون پر بات کرتی ہے فرطِ محبت سے اس کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں اور آواز کے ارتعاش سے صاف پتا چل جاتا ہے۔ بچّے تو اس کی جان ہیں، ان کی ذرا سی تکلیف پہ تڑپ اُٹھتی ہے، اسی طرح شوہر سے بے پناہ محبت رکھتی ہے ان کے حکم کی بجا آوری میں ہمہ دم مستعد رہتی ہے۔ ابھی ہمارا ان کے ہاں رہنے کا اتفاق ہوا فرحان میاں نے بہت ہی محبت سے ہمیں رکھا۔ شکاگو کے اکثر مقامات ہمیں دکھلائے ہماری بڑی مدارات کی۔ میری اہلیہ کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ وہ بچّوں کو سنبھالیں اور سمیّہ تعلیم میں منہمک ہو جائے، یقیناً ان چار مہینوں میں سمیّہ کو بہت فائدہ پہنچا ہوگا۔ اب آئندہ اللہ تعالیٰ اور کوئی سبیل نکال دیں گے۔ اللہ اسے کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے، خوش و خرم رکھے۔ دنیا جہاں کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ ازواجِ مطہرات کی طرح شوہر سے محبت کرنے والی ہو۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت ام سلمیٰؓ بڑی تیار ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد کی منتظر تھیں، آپ تشریف لائے، نہایت خوش دلی سے استقبال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، کیا بات ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو، حضرت اُمِ سلمیٰؓ نے فرمایا، اے اللہ کے نبی! کیا مجھے اپنے شوہر کو دیکھ کر خوش نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کے شوہر کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرح بیوی سے محبت کرنے والا بنائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرح ہی گھر کاموں میں بیوی کا ہاتھ بٹانے والا اور معاون و مددگار بنائے۔ ان دونوں کو اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ اولاد کو نیک و صالح، اطاعت گزار، فرماں بردار بنائے اور دین کی محبت ان کے دل میں ڈال دے۔ اَللّٰھُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْأُمُوْرِ کُلِّهَا، وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْآخِرَۃ۔

☆☆☆

مولانا محمد عبدالسمیع ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولوی عبدالعلیم آغا

غلام ہندوستان میں ولایتی پٹھان شمالی ہند میں شہر شہر قصبے قصبے میں نظر آتے تھے جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر سودی کاروبار کرتے تھے، لوگوں کو نقد رقم قرض دینا، سود لگا کر وصول کرنا، قرض پر کپڑا فروخت کرنا اور موعودہ وقت پر ڈنڈا لے کر اپنا مطالبہ وصول کرنا، ان کا یہ دھندہ شہروں میں بھی ہوتا تھا دیہاتوں میں بھی، پیسہ اگر نہیں وصول ہوتا تھا تو یہ لوگ گالی گلوچ کے ساتھ مار پیٹ کی بھی دھمکی دیتے تھے بروقت اگر کوئی نہیں ملتا تھا تو وہ پتا لگا کر وقت پر آتے تھے ان لوگوں کو لوگ بالعموم ''آغا'' کے نام سے جانتے پہچانتے تھے، ''آغاؤں'' کے اس دھندے میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب سے ان کا معاملہ یکساں تھا، اس دور میں اگر کوئی کسی چیز کے لیے شدید تقاضا کرتا تو یہ محاورہ زبانوں پر رائج تھا کہ تم تو ''آغا'' بن کر بات کرتے ہو یا ''آغاؤں'' کی طرح تقاضے کرتے ہو وغیرہ۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا تعلیمی سال شروع ہوا تھا حضرات اساتذہ رجسٹر حاضری لے کر درجے میں تشریف لاتے حاضری لیتے کچھ پڑھا کر چلے جاتے تھے۔ ہمارے درجے میں پہلا گھنٹا مفتی صاحب کا تھا، مفتی صاحب تشریف لائے حاضری لی آخری نام ''محمد عبدالعلیم آغا'' کا پکارا، وہ موجود نہیں تھے، طلبہ ''آغا'' کے لفظ پر سوالیہ نشان بن گئے؟ ان کے ذہنوں میں ''آغا'' کا مذکورہ پس منظر ابھر آیا، مفتی صاحب چلے گئے تو زبانیں کھلیں یہ ''آغا'' کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ آغا پڑھنے کیسے آ گیا؟ اس کا کام تو ڈنڈا لے کر پیسے وصول کرنا ہے، اس دن درجے میں ان کی آمد کا انتظار ہی رہا، طرح طرح کے

سوالات ذہنوں میں کروٹیں لیتے رہے، دوسرے دن بھی اس نام پر ''لبیک'' کہنے والا درجے میں کوئی موجود نہ تھا۔ تیسرے دن جب گھنٹی بجی تو دیکھا گیا کہ پرانے لڑکوں کے ساتھ ہاتھوں میں کتابیں لیے ایک نئی شبیہ بھی درجے میں داخل ہو رہی ہے۔ بھرا بھرا جسم، ابھری ابھری آنکھیں، چھوٹی سی گول ڈاڑھی، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، واسکٹ پہنے جیب میں گھڑی ڈالے واسکٹ میں اس کی چین پھنسائے، مفتی صاحب بھی پیچھے پیچھے ہی پہنچ رہے تھے اس لیے اس نئی شبیہ سے تعارف کا موقع نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے حاضری ہوئی تو ''محمد عبدالعلیم آغا'' کے نام پر مذکورہ شبیہ کی زبان سے دوسرے طلبہ کی دیکھا دیکھی ''لبیک'' نکلا، ان کی اس ''لبیک'' نے سارے درجے کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ مفتی صاحب پڑھا کر تشریف لے گئے تو ایک طرف سے سوال ہوا، آپ ہی ''عبدالعلیم آغا'' ہیں، آغا کے پس منظر سے بے خبر ان کی زبان سے نکلا ''جی ہاں میں ہی عبدالعلیم آغا ہوں۔'' درجہ قہقہوں سے گونج گیا، آغا صاحب حیرت زدہ ایک ایک کو دیکھ رہے تھے کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ دوسری طرف سے سوال ہوا ''جناب کا وطن'' جواب ملا ''جے پور'' میں نے گزارش کی تب تو آپ کے نام کے آگے پیچھے جواہرات ٹکے ہونا چاہیے یہ ''آغا'' کیا چیز ہے اس سے تو لاٹھی ڈنڈے کا تصوّر ابھرتا ہے۔ آغا صاحب حیران تھے کہ آخر نام پر اتنا مناقشہ کیوں ہو رہا ہے کوئی علمی سوال کیا ہوتا یا کچھ اور پوچھا جاتا، لیکن نہ تو طلبہ اپنی الجھن بتا سکے اور نہ آغا صاحب اپنا تردد رفع کر سکے اس لیے کہ گھنٹے پہ گھنٹے بجتے رہے، اساتذۂ کرام آ آ کر پڑھاتے رہے تا آں کہ مدرسے کا وقت ختم ہو گیا اور سب اپنے اپنے ٹھکانوں کو روانہ ہو گئے۔

ظہر کی نماز میں آغا صاحب نے مجھے پکڑا اس لیے کہ میرا ہی سوال آخری سوال تھا، اپنا استعجاب ظاہر کیا یہ ہیرے جواہرات اور پھر لاٹھی ڈنڈے کی بات آپ نے کیا کہی مجھے بھی کچھ سمجھا دیجیے، ان کے اس سوال سے میں نے محسوس کیا کہ آغا صاحب آدمی سلجھے ہوئے ہیں ہم لوگ بیٹھ گئے پہلے تو کچھ رسمی باتیں ہوئیں جن سے معلوم ہوا کہ آغا صاحب شیخ صاحب کے ساتھ جے پور سے آئے ہیں اور انھیں کے پاس مقیم بھی ہیں پھر میں نے ان کو طلبہ کے سوال و جواب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ''آغا'' کا پس منظر بھی سمجھا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ طلبہ

کل سے آپ کو ''آغا، آغا'' کہنے لگیں گے۔ اگر آپ نے کوئی اثر قبول کیا تو بات بڑھ جائے گی۔

دوسرے دن طلبہ نے ان کو چڑانے کی کوشش کی، لیکن موصوف مسکراتے ہی رہے، جلدی یہ ذکر مذکورہ ختم ہوگیا اور کچھ عرصے کے بعد رجسٹر حاضری نے بھی ''آغا'' کا لفظ نکل گیا۔

یہ تھا میرے اور مولوی عبدالعلیم صاحب مرحوم کے درمیان ربط و تعلق کا آغاز جس کے بعد ان کے جوہر کھلنے لگے، رفاقت بڑھنے لگی، ایک نے دوسرے کو پہچاننا شروع کیا، ''آپ'' و ''جناب'' کا پر تکلّف طرزِ خطاب جلدی ''تم'' جیسے بے تکلّف خطاب میں تبدیل ہو گیا، یہی صورت درجے کے تمام ساتھیوں کے ساتھ پیش آئی سب سے ہمدردی و محبت، خلوص و ایثار، دکھ درد میں شرکت نے ان کو درجے میں ممتاز حیثیت دے دی۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سبؔ سے جڑے رہتے تھے اور سب کو جوڑے رکھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ایک کتاب کے سلسلے میں طلبہ کا عام تأثر یہ تھا کہ اس مضمون کی تعلیم اپنے معیار کے مطابق نہیں ہو رہی، انھوں نے ڈپارٹمنٹ کو درخواست دی جس کی اطلاع متعلقہ ٹیچر کو ہو گئی۔ طلبہ کی درخواست کا جواب ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ سے نہیں ملا تھا، اس لیے طلبہ منتظر اور خاموش تھے، ٹیچر نے یہ سمجھا کہ طلبہ پڑھنا نہیں چاہتے انھوں نے پرنسپل صاحب کو رپورٹ دے دی جس کی اطلاع طلبہ کو ہوگئی، ان کی یہ غلط فہمی صاف کرنے کے لیے مولوی عبدالعلیم صاحب نے راقم الحروف سے کہا، میں ٹیچر صاحب سے بعض مصالح کے پیش نظر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مولوی عبدالعلیم صاحب کا موقف یہ تھا کہ اگر ٹیچر کی غلط فہمی صاف نہ کی گئی تو طلبہ کا مقدمہ کمزور پڑ جائے گا، مگر ایک مشکل یہ آ پڑی تھی کہ ٹیچر صاحب کی رپورٹ کا علم ہونے پر طلبہ کے مزاج میں اشتعال پیدا ہو گیا تھا اور اب واقعی وہ ان سے پڑھنا نہیں چاہتے تھے، لیکن مولوی عبدالعلیم صاحب کا دباؤ مجھ پر بڑھتا رہا بالآخر میں بات کرنے پر آمادہ ہوگیا، لیکن اب اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ طلبہ ''نہ پڑھنے کا'' اپنا فیصلہ تبدیل کریں یہ کام مولوی عبدالعلیم صاحب نے اپنے ذمّے لیا، ہنس کر، مسکرا کر، اونچ نیچ سمجھا کر، انھوں نے کسی کو جوڑا، کسی کو توڑا، آخری گھنٹے تک وقفے وقفے سے وہ سب کو تیار کرتے رہے اور مجھ سے کہہ دیا کہ آپ اپنا کام کریں، طلبہ کو اشتعال کی حالت میں کنٹرول کرنا انھیں کے بس کی بات تھی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی وہ سارا معاملہ اپنے سر لے لیتے تھے اور ساتھیوں کو بچا لے جاتے تھے ایک بار یہ ہوا کہ پہلا اور تیسرا گھنٹا خالی تھا دوسرا گھنٹا منطق و فلسفے کا تھا وہ خالی نہیں تھا طلبہ کی خواہش ہوئی کہ یہ دوسرا گھنٹا بھی خالی ہو جاتا تو ہم لوگ دوسرے ضروری کام کر لیتے، پتا لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ استاد گرامی موجود ہیں سیدھے سبھاؤ چھٹی ملنے کی توقع نہیں تھی انکار ہو جاتا۔ سوال ہوا کہ معاملہ کس طرح حل ہو، میں نے کہا کہ مولانا کو میں کہہ تو دوں گا، لیکن وہ اگر پہچان گئے کہ کون ہے تو میری شامت آ جائے گی ممکن ہے بات مہتمم صاحب تک پہنچے مولوی عبدالعلیم صاحب نے مجھ سے منصوبہ معلوم کیا، میرے بتائے پر انھوں نے کہا کہ فکر نہ کرو میں موجود رہوں گا اور معاملے کو سنبھال لوں گا، بات طے ہو گئی طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر کمرے سے چلے گئے درجے میں میرے اور مولوی عبدالعلیم صاحب کے علاوہ دو طالبِ علم اور رہ گئے، جیسے ہی دوسرا گھنٹا بجا میں درجے سے نکل کر زینہ والی برجی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، گھنٹا بجنے پر بالعموم اس جگہ طلبہ کا رش ہو جاتا تھا۔ ادھر دفتر سے مولانا رجسٹر لے کر نکلے برجی کے پاس جب پہنچے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ مہتمم صاحب نے آپ کو ابھی بلایا ہے وہ کچھ پریشان ہو گئے اور مہتمم صاحب کے پاس جانے کے لیے زینہ چڑھنے لگے میں درجے میں آیا اور دوسرے دونوں طلبہ کو لے کر کنارہ والی برجی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مولانا مہتمم صاحب کے پاس پہنچے، مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''مولانا آج یکم اپریل ہے کسی لڑکے نے آپ کے ساتھ شرارت کی ہے میں نے آپ کو نہیں بلایا۔'' مولانا نیچے اترے تو اب ان کا گرجنا برسنا دیدنی تھا، ڈنڈا ہاتھ میں لیے پوری گیلری میں ٹہل ٹہل کر گرج برس رہے تھے کس نے مہتمم صاحب کے پاس مجھے بھیج دیا۔ ''وہ گدھا کون ہے؟ بلاؤ اس کو۔'' مولوی عبدالعلیم نے ان سے عرض کیا کہ ''کیا بات ہو گئی ہے؟'' مولانا نے بتایا، مولوی عبدالعلیم نے کہا کہ حضرت آپ درجے میں تشریف رکھیں، میں پتا لگاتا ہوں اور پھر گیلری میں آ کر مولوی عبدالعلیم صاحب بھی چند منٹ گرجتے برستے رہے، ۔ درجے میں آئے تو مولانا نے پوچھا، لڑکے کہاں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ انعامی مقابلوں کے جلسے ہونے والے ہیں پہلا گھنٹا خالی تھا کوئی آیا نہیں اب لڑکے آ رہے ہوں گے مولانا بولے، ''اب میں کیا پڑھاؤں گا تم سب کی

حاضری بھر دو میں بھی جاؤں۔'' مولوی عبدالعلیم صاحب نے سب کی حاضری بنائی، مولانا رجسٹر لے کر رخصت ہو گئے تو بر.جی کے پاس مولوی عبدالعلیم کی مسکراتی ہوئی شکل نظر آئی میں نے کہا، یار بڑی دیر لگ گئی۔ بولے، اماں بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا، مشکل سے سنبھال پایا ہوں۔ میں نے پوچھا، یہ بتاؤ کہ مولانا مجھے پہچانے کہ نہ پہچانے۔ کہنے لگے، بالکل نہیں پہچانے، ورنہ سب سے پہلے تمھاری طلبی ہو جاتی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب طلبہ کے مسائل سے دلچسپی تو ضرور لیتے تھے، لیکن ذرا اپنا دامن بچا کر اس لیے کہ ان کی رہائش شیخ صاحب کے پاس تھی وہی اس وقت دارالعلوم کے مہتمم، سیاہ و سپید کے مالک تھے، ۱۹۳۲ء میں مدح صحابہ کی تحریک کی وجہ سے لکھنؤ کے مغربی حصے میں شیعہ سنی فساد ہو گیا، جب تک مغربی علاقے میں فساد رہا تب تک کچھ آگے بات نہیں بڑھی، ایک دن شام کے وقت قیصر باغ منڈی کے سامنے کسی شیعہ نے ایک سنی کے چھرا مار دیا۔ منٹوں میں اس کی اطلاع ندوہ پہنچ گئی رات کو عشاء کے بعد مولانا شبلی فقیہ کے نواسے ذوالفقار علی اور مولوی جلیل احسن صاحب ؒ کے درمیان سازش ہوئی۔ مولوی جلیل احسن صاحب چوں کہ پیر سے معذور تھے اس لیے انھوں نے بندوق ذوالفقار علی کے کاندھے پر رکھی، ششماہی امتحان کا زمانہ تھا گرمی کے دن کچھ طلبہ سو رہے تھے کچھ پڑھ رہے تھے ایک بجے رات کو شور ہوا'' پکڑو پکڑو'' میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ذوالفقار علی مسجد کی طرف'' پکڑو پکڑو'' کی ہانک لگاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا اور پھر قافلہ بنتا گیا، آم کے باغ میں پہنچ کر میں نے ذوالفقار علی سے پوچھا، کیا قصہ ہے تو انھوں نے بتایا کہ میں سو رہا تھا چارپائی کو دھکا لگا تو آنکھ کھلی ایک آدمی چھرا لیے کھڑا حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شور کر دیا وہ میرے اچھلنے پر باغ کی طرف بھاگا، باغ میں اچھی طرح تلاش کیا گیا، باغ کے محافظ سے دریافت کیا گیا اس نے بتایا کہ ایک آدمی ادھر سے بھاگ گیا ہے ذوالفقار علی کے بیان کی توثیق ہوئی، لیکن تلاش میں ناکامی، سب واپس آئے۔ مولانا شبلی فقیہ مرحوم، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم نے دریافت کیا تو یہی قصہ ان کو بھی بتایا گیا، قرار پایا کہ کل سے طلبہ اپنی ڈیوٹیاں لگائیں اور باری باری پہرہ دیں۔ صبح ذوالفقار علی میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا جان دینا

ہے؟ مولوی جلیل احسن صاحب نے بھی تائید کی کہ جب تک یہ فسادات چل رہے ہیں دارالعلوم میں تعطیل ہو جانا چاہیے۔ گھنٹی بجی تو طلبہ دارالعلوم پہنچے، ذوالفقار علی نے کنویسنگ شروع کی درخواست کے مسوّدے کی خدمت مولوی عبدالعلیم صاحب کے سپرد ہوئی طلبہ کے دستخط ہوئے شیخ صاحب کو پیش کرنے کا سوال اٹھایا تو مولوی عبدالعلیم صاحب کترا گئے ان کو کترانا بھی چاہیے تھا اب یہ یاد نہیں کہ کس نے یہ درخواست پیش کی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب میں دوسری خوبی یہ تھی کہ کبھی اگر ناگواری کی کوئی بات ہوگئی تو وہ اس کو بالکل پی جاتے تھے، اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کرتے تھے، ان کی یہ خوبی ان کے تعمیری جذبے کی غماز تھی، اس خوبی کے حامل کو عارضی طریقے سے جو کچھ بھی پریشانی ہو، آخر میں جیت اسی کی ہوتی ہے۔ مجھے تجربہ تو نہیں ہوا، اِس لیے کہ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد وہ کہیں تھے میں کہیں تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ مرحوم کی اس خوبی نے ان کے سخت حالات میں ضرور ان کی دستگیری کی ہوگی۔

مرحوم کی تیسری خوبی ان کی وضع داری اور ان کا خلوص تھا جس سے جس طرح ملے پھر اس سے زندگی بھر اسی طرح ملتے رہے، دوسروں کے بارے میں تو میں نہیں جانتا، لیکن اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے طالبِ علمانہ زندگی کے بعد اپنے اس ساتھی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ حالات کی نامساعدت، سنگینی بالخصوص باڈر کی مصنوعی سفید پٹی نے ایک کو دوسرے سے جدا ضرور رکھا، لیکن جب جب ملے ٹوٹ کے ملے۔

غالبًا ۱۹۵۸ء کی بات ہے میں لاہور میں استادِ گرامی حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی کی رفاقت میں مقیم تھا کسی باوثوق ذریعے سے مجھے حیدرآباد سندھ میں مرحوم کی موجودگی کی اطلاع ملی، حیدرآباد جب پہنچا تو ایک دن ان کی تلاش میں نکلا لطیف آباد جو آج ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے ان دنوں بے آب و گیاہ ریگزار تھا، گھر پایا تو ہانک لگائی جواب ملا ''کون''؟ میں نے نام بتایا تو بولے ''اندر آجاؤ'' اندر گھسا تو ان پر نظر پڑنے کے بجائے کبوتروں کے لمبے لمبے پنجرے تلے اوپر سامنے نظر پڑے نگاہیں ان پنجروں میں الجھ گئیں میں نے آواز دی کہاں ہو سامنے آؤ کانوں میں آواز پڑی ''یہاں ہوں'' نظر جو اٹھائی تو دیکھا کہ

کھڑکی کی سلاخیں پکڑے بیٹھے ہیں میں ان پنجروں کا طواف کرتا رہا اور باتیں بھی کرتا رہا کھڑکی سے اتر کر تشریف لائے گلے ملے کبوتروں کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے کچھ دیر ٹھہر کر اور یہ وعدہ لے کر شام کو فلاں جگہ ملو گے، چلا آیا۔

۱۹۶۸ء میں پھر پاکستان پہنچا گھر تو معلوم ہو ہی چکا تھا اس مرتبہ یہ آسانی بھی ہوئی کہ ہمارے پھوپھا منشی امتیاز علی صاحب بھی حیدرآباد سے لطیف آباد منتقل ہو گئے تھے اور جھونپڑوں کی ایک مسجد میں دونوں کی ملاقاتیں ہو چکی تھی پھوپھا مرحوم کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں لطیف آباد پہنچا تو پھوپھا نے مجھ سے مرحوم کا تذکرہ کیا اور مغرب کی نماز میں ملاقات ہوئی دولت خانے پر حاضری دی، صبح و شام کے اکثر اوقات مرحوم کی معیّت میں ہی گزرتے تھے اور اگلی پچھلی باتوں کے دفتر کھل جاتے تھے۔

۱۹۷۷ء میں پھر میں حیدرآباد پہنچا، لیکن اب لطیف آباد کا ریگزار، شہر بن چکا تھا۔ پہلے انھیں کے دولت کدے پر حاضری دی، اس مرتبہ میں دو ماہ پاکستان میں رہا اور ان دو ماہ کا بڑا حصہ حیدرآباد ہی میں گزرا صبح و شام کی حاضری تو معمولاً تھی۔ پھوپھی صاحبہ مرحومہ کے کچھ قضیے جائیدادی تھے جن میں مرحوم نے میری رفاقت کی، مشورے دیے، اثرات و تعلقات استعمال کیے، بھاگ دوڑ کی بالآخر وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

پاکستان سے ہندوستان جب میری واپسی ہونے لگی تو میں نے ان سے لکھنؤ آنے کا وعدہ لیا میری واپسی کے کئی سال بعد جے پور سے ان کا خط ملا کہ ''میں جے پور پہنچ گیا ہوں، اب لکھنؤ آ رہا ہوں۔'' ایک دن شب میں غالباً مغرب کے بعد مع ایک جے پوری رفیق کے میرے ہاں لکھنؤ پہنچ گئے۔ جس جوان نے دارالعلوم اپنی جوانی میں چھوڑا تھا سرد و گرم زمانہ جھیل کر اپنے بڑھاپے میں اسی سرزمین پر اپنے ہی جیسے ایک بوڑھے سے ملنے کے لیے قدم رکھ رہا تھا دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی دیدہ و دل فرشِ راہ ہو گئے، خوشی و مسرت کے آنسو آنکھوں میں تیر گئے، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ہو گی یہ خوشی سوگ میں تبدیل ہو گئی، صاحب زادے ڈاکٹر محمد عبدالمقیت صاحب کا مکتوب ملا جس سے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی دن تو بہت بیت گئے، لیکن غم کا مارا دل آج بھی بوجھل ہے، مولوی عبدالعلیم

صاحب کا جب بھی خیال آ جاتا ہے، آنکھوں میں غم کے آنسو تیرنے لگتے ہیں ایک ''ہوک'' سی اٹھتی ہے کہ ''میں تنہا رہ گیا'' مولوی عبدالعلیم چلے گئے میں نے ان کو کہاں نہیں تلاش کیا، ریگزاروں میں تلاش کیا، جھونپڑوں میں تلاش کیا، محلوں میں تلاش کیا، ہر جگہ ملتے رہے، لیکن اب کہاں ملیں گے؟ اب کہاں تلاش کروں؟

احباب اس وقت بھی پوچھتے تھے اور آج بھی پوچھتے ہیں کہ مولوی عبدالعلیم صاحب سے آپ، کے ربط و تعلق کی یہ ہمہ جہتی و ہمہ گیری کیوں اور کیسے ہے؟

جواب میں سیّدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کر کے اپنی یہ دراز نفسی ختم کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مولوی عبدالعلیم صاحب کی مغفرت فرما کر ان کے مراتب بلند فرمائے۔

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگ کانیں ہیں جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ جو جاہلیت میں شریف تھے وہ اسلام میں بھی شریف ہیں بشرطے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ اور روحیں مختلف النوع فوجیں ہیں اگر عالم بالا میں ایک نے دوسرے سے ملاقات کی ہے تو یہاں بھی ان سے مانوس ہوں گی اور جو وہاں انجانی تھیں تو یہاں بھی وہ الگ الگ رہیں گی۔
>
> (مسلم شریف)

☆☆☆



رهبر پبلشرز اُردو بازار، کراچی